مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
میں
علامہ شبلی کا حصہ



ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
میں علامہ شبلی کا حصہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

سلسلہ مطبوعات دارالمصنّفین نمبر: ۰۰۰

نام کتاب : مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ

مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ناشر : دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

مطبع :

طبع اول : اگست ۲۰۲۱ء

صفحات : ۳۰۳

قیمت : Rs: 500/-؟؟

باہتمام : ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

ISBN

Darul Musannefin Shibli Academy
P.O Box No: 19
Shibli Road Azamgarh - 276001(UP)
e-mail:shibli_academy@rediffmail.com
Website: www.shibliacademy.org

ترتیب

○○○

پیش لفظ

۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت کے نتیجے میں ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکست خوردگی کے احساس کو ختم کرنے اور مغرب کی فکری یلغار کا سامنا کرنے کی جن بزرگوں نے جرأت مندانہ کوشش کی ان میں سرسید احمد خاں اور علامہ شبلی نعمانی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کو موجودہ مایوسی اور احساس کمتری کا مداوا تعلیم میں نظر آیا۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کی برتری کی سب سے بڑی وجہ ان کی روشن خیالی اور ان کا علمی تفوق ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کو خود انہیں کے حربے یعنی تعلیم ہی سے شکست دی جاسکتی ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر سرسید اور شبلی نے علم کے فروغ اور تعلیم کی ترویج واشاعت کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ مختلف ادارے قائم کئے۔ ملک کے بیدار ذہنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی۔ علی گڑھ تحریک، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوہ تحریک کے پس پشت یہی جذبہ کارفرما تھا۔

مسلم ایجوکیشنل کا قیام ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کا مقصد ملک کے باشندوں میں علمی بیداری اور اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثہ کے تحفظ کو یقینی بنانا تھا۔ اس کا دائرہ کار کوئی مخصوص خطہ یا علاقہ نہیں تھا بلکہ پورے ملک کے بیدار ذہنوں کو اس کانفرنس کے دائرہ اثر میں لاکر اپنے تعلیمی مشن کو عام کرنا تھا۔ چنانچہ اس کانفرنس کے اجلاس مختلف شہروں میں منعقد ہوا کرتے تھے تاکہ ملک کے ہر حصہ کے عوام وخواص اس کانفرنس کے مقاصد سے واقف اور تعلیم کے فیوض و برکات سے مستفید ہوسکیں۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اس ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا سہرا سرسید کے سر جاتا ہے، لیکن اس تحریک کو تاب وتوانائی بخشنے میں سرسید کے تمام رفقا بالخصوص شبلی نعمانی کی کاوشوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک موقع پر جب سرسید اس کانفرنس کو وقت اور پیسے کی بربادی تصور کرنے لگے تھے، تو شبلی نے اپنی

جذباتی اور فکر انگیز تقریر سے سرسید کو حوصلہ بخشا اور انہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ کیا۔ اس طرح کانفرنس کو نئی زندگی ملی اور وہ مسلمانوں کی ذہنی آبیاری اور تعلیمی بیداری کا فریضہ انجام دیتی رہی۔

یہ بڑی حیرت کا مقام ہے کہ جس ایجوکیشنل کانفرنس نے ہندوستانی باشندوں کو فکری غذا فراہم کرنے اور تعلیم کے تئیں عوام وخواص کو حساس اور فکرمند بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا اس سے متعلق کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں اس تحریک کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس کے ہمہ گیر اثرات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہو۔ بعض کتابوں میں کانفرنس کے بعض پہلوؤں سے بحث ضرور کی گئی ہے لیکن اس کانفرنس کی تمام کارروائیوں اور کارگذاریوں کی مکمل معلومات کی خواہش رکھنے والوں کو یقیناً مایوسی ہوگی۔ اس اہم علمی تحریک کے تئیں اہل نظر کی سرد مہری دیکھ کر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے زیر نظر کتاب لکھ کر علمی دنیا کی اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب نے تاریخ نویسی کے جدید اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنیادی ماخذ کی روشنی میں اس تحریک کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس تحریک کے نقطۂ آغاز سے لے کر اس کے آخری مراحل تک کی کارروائیوں اور کارگذاریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس تحریک کی کامیابی اور اسے فکری اساس فراہم کرنے میں علامہ شبلی نے جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اسے اس تحریک کا روشن باب قرار دیا جا سکتا ہے۔ چند اجلاسوں کو چھوڑ کر علامہ شبلی تمام اجلاسوں میں شریک ہوئے اور ہر اجلاس میں اپنی فکر انگیز تقریروں، تحریروں، قومی منظومات و قصائد اور اپنی مفید تجاویز سے شرکائے اجلاس کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اس کتاب میں علامہ شبلی کے پرمغز مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' اور مختلف اجلاسوں میں پڑھے جانے والے شبلی کے اردو اور فارسی قصائد کی شمولیت نیز اس کانفرنس میں شریک ہونے والے عالموں اور دانشوروں سے متعلق مفید معلومات کی فراہمی نے اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعظمی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اپنے سلسلہ شبلی شناسی ہی کو آگے بڑھایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

(ڈاکٹر) فخر الاسلام اعظمی

دیباچہ

علامہ شبلی نعمانی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی متنوع خدمات میں ایک اہم خدمت سرسید احمد خاں[۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ۲۷رسالہ وابستگی اوراس کے حوالہ سے ملت کی علمی وتعلیمی ترقی کے لئے جدوجہد بھی ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جس وقت قائم ہوئی علامہ شبلی نعمانی اس وقت ایم اے او کالج علی گڑھ میں فارسی وعربی کے پروفیسر تھے۔ چنانچہ وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے دن اور پہلے اجلاس سے جو علی گڑھ میں ۲۷ردسمبر ۱۸۸۶ء کو منعقد ہوا تھا اس سے وابستہ ہوئے۔ دل وجان سے اس کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنو میں وہ آخری بار شریک ہوئے۔ اس طرح وہ ایجوکیشنل کانفرنس سے ۲۷رسال وابستہ رہے۔ ۱۲رسال سرسید کے ساتھ اور ۱۵رسال ان کی وفات کے بعد ایجوکیشنل کانفرنس سے ان کا ناتہ رہا۔ علامہ شبلی کی اس طویل المدت خدمت کی داستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخوں بالخصوص اس کی سالانہ رودادوں کے اوراق میں ثبت ہے۔ زیر نظر کتاب میں علامہ شبلی کی کتاب زندگی کے انہی منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی مطبوعہ رودادوں کے علاوہ اس کی سالانہ کانفرنسوں کے صدارتی خطبات تین جلدوں میں ''خطبات عالیہ'' کے نام سے علی الترتیب ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ خطبات کی یہ جلدیں انوار احمد زبیری مارہروی[م:۱۹۳۵ء] نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

[۱۸٦۷-۱۹۵۰ء] کی ایماوخواہش پر مرتب کی ہیں۔انہوں نے ایک اور کتاب ''مرقع کانفرنس'' کے نام سے بھی مرتب کی ہے، جس میں کانفرنس کے اجلاس،صدوراوران کی قراردادوں وغیرہ کی تفصیلات یکجا کی گئی ہیں۔ پھرکانفرنس کی پچاس سالہ تاریخ بھی اسی انداز میں دفتر کانفرنس سے شائع ہوئی ہے۔علاوہ ازیں اسی انداز کی ایک اور کتاب امان اللہ خاں شروانی نے'' آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال'' کے نام سے مرتب کی ہے۔ان تمام کتابوں کوایجوکیشنل کانفرنس نے شائع کیا ہے۔سید الطاف علی بریلوی سابق مدیر ماہنامہ العلم کراچی اور پروفیسر محمد ایوب قادری [م: ۲۰رنومبر۱۹۸۳ء] نے''تحریک علی گڑھ اورقومی نظمیں'' کے نام سے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش کی جانے والی منظومات یکجا کی ہیں۔ان سب میں پروفیسر اختر الواسع صاحب کی کتاب ''سرسید کی تعلیمی تحریک ایجوکیشنل کانفرنس کی روشنی میں'' زیادہ بہتر کتاب ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کتب میں سوائے اول الذکر کے سب ایک دوسرے سے مل کر مکمل ہوتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ابتک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی عظیم الشان تعلیمی خدمات اوراس کی طویل تاریخ کا مفصل مطالعہ وجائزہ پیش ہی نہیں کیا جاسکا ہے۔حالانکہ مسلمانوں کی تعلیمی زندگی پر کسی اور تحریک کے شاید ہی اتنے اثرات مرتب ہوئے ہوں جتنے ایجوکیشنل کانفرنس کے ہوئے ہیں۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کے اثرات اورعہد بہ عہد ارتقا کا مفصل جائزہ پیش کیا جاتا۔نیز ابتدا میں جو اشخاص اس سے وابستہ ہوئے اورتاحیات نہ صرف وابستہ رہے بلکہ علمی وعملی جدوجہد کی اور دامے، درمے، سخنے اس کی گراں قدر خدمات انجام دیں،ان کا اوران کی کاوشوں کا تذکرہ قلم بند کیا جاتا۔ اور دکھایا جاتا کہ ان برسے ہوئے بادلوں میں کتنی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔

زیر نظر مقالے کی تصنیف کا بنیادی مقصد علامہ شبلی نعمانی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام واستحکام اورمسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں جو کردار ادا کیا یا جوان کا بنیادی حصہ ہے، اس کی وضاحت وتفصیل قلم بند کرنی ہے۔ نیز کانفرنس کے حوالہ سے علامہ شبلی نعمانی نے جوعلمی، تعلیمی،قومی، ملی اورتاریخی خدمات انجام دیں ان کے مطالعہ وتجزیہ کے ساتھ ان کی ان منظوم و منثور تحریروں کو یکجا کرنا ہے جوانہوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش

کی تھیں اور جن سے ہمارے تعلیمی نظام اور تعلیمی نقطہ نظر کی اصلاح وترقی میں بہت کچھ مدد ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی جدوجہد سے ہماری جدید تعلیمی تحریک پروان چڑھی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں شرکت، قراردادوں کی پیش کش اور پھر اپنے موقف کی تائیدوحمایت میں تقاریر، تعلیمی، لسانی، مذہبی اور معاشرتی مسائل پر خطبات اور منظومات سے انہوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے وقار میں بڑا اضافہ کیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کی رودادوں میں علامہ شبلی نعمانی کی جدوجہد کی یہ داستان محفوظ ہے۔ یہی نہیں کانفرنس کی تاریخ میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب سرسید احمد خاں نے کانفرنس کو وقت اور پیسہ کی بربادی تصور کرلیا تھا۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے بڑی دلیرانہ اور جذباتی تقریر کی اور ایجوکیشنل کانفرنس کی اہمیت وضرورت بڑے پرزور طریقہ سے ثابت کی اور اس کی حمایت میں متعدد دلائل پیش کئے۔ ان کی یہ اہم تقریر زیرنظر کتاب میں شامل ہے۔

علامہ شبلی نعمانی ایک بڑے خطیب ومقرر تھے۔ انہوں نے کانفرنس کے اجلاسوں میں متعدد خطبات دئے۔ ان میں سے محض چندہی ''خطبات شبلی'' میں شامل ہیں۔ بقیہ کانفرنس کی رودادوں میں محفوظ تھے۔ اس کتاب میں وہ خطبات بھی شامل ہیں۔

۱۹۰۸ء کی سالانہ کانفرنس میں جوامرت سر میں منعقد ہوئی تھی اور جس میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے تھے علامہ شبلی نے الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی نصاب میں عربی قواعد کی شمولیت پر اپنی اظہار ناراضگی کے ساتھ ایک قرارداد پیش کی۔ جس میں نئے فارسی نصاب کی ضرورت کا ذکر تھا۔ جب کانفرنس نے اس پر توجہ نہیں دی تو علامہ شبلی نے خود فارسی نصاب تیار کیا اور شائع کرایا۔ انٹرنس کورس فارسی، ایف اے کورس فارسی اور بی اے کورس فارسی، جیسی نصابی کتابیں اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے تیار کی گئی تھیں۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ اجلاس میں بحث کے دوران اس قرارداد کو پروگرام سے نکال کر اس کی جگہ دوسری قرارداد شامل کردی گئی ہے۔ اس کے باوجود علامہ شبلی کا جب تک ہاتھ اور لکڑی کا پاؤں سلامت رہا وہ انجمن کے اجلاسوں میں شریک ہوکر ملت کے لئے اپنا حق ادا کرتے رہے۔ بعد کے زمانہ میں ذمہ داران کانفرنس کی طرف سے علامہ شبلی نعمانی اور ان کے

کاموں سے چشم پوشی کی گئی۔اوران کے ذکرتک سے احتراز کیا گیا۔اس سردمہری کا آغاز ۱۹۰۵ء کے اجلاس جس میں علامہ شبلی نے انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ سے استعفادیا تھا آغاز ہوااور رہی سہی کسر ۱۹۰۶ء کے ڈھاکہ اجلاس میں پوری ہوگئی ،جس میں مسلم لیگ کی قرارداد منظور ہوئی۔اس اجلاس میں علامہ شبلی نے خان بہادر شجاعت علی کی صدارت میں تاریخ اسلام پر بڑا وقیع خطبہ دیا تھا،مگراس کی روداد میں اس کا ذکر بھی نہیں آیا ہے۔

چونکہ اس وقت علامہ شبلی کے دوست نواب محسن الملک[۱۸۳۴-۱۹۰۷ء] زندہ تھے۔اس لئے باوجودان کی مسلم لیگ کی مخالفت کے ان کا ذکرآتا رہا اورانہیں کانفرنس کے اجلاسوں میں شرکت کی دعوت ملتی رہی۔نواب محسن الملک کی وفات[۱۹۰۷ء] کے بعد بھی علامہ شبلی کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے ،تعلیم جدید کی ضرورت پرنظم پیش کرتے یا خطبہ دیتے اوراپنے علم و معلومات سے کانفرنس میں ایک روح پھونک دیتے۔مگر پھرآہستہ آہستہ وہ سرگرمی یا جوش ان میں باقی نہیں رہا جوعہد سرسید یا عہد نواب محسن الملک میں تھا۔دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کا وہ جوش وخروش ندوہ کے لئے منتقل ہوتا گیا۔کانفرنس کے۱۹۱۲ء کے اجلاس کے پہلے جلسہ کے بعد علامہ شبلی کوکہیں اورکسی معاملہ میں شریک نہیں کیا گیا۔اس زمانہ میں کانفرنس کے ایک ذمہ دار صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے،جواس زمانہ میں ندوہ کے مخالفین شبلی کے بڑے ہمدرد وہم نوا ہوگئے تھے۔

اس سلسلہ کی ایک بات اورقابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی کے احباب اور ہم عصروں میں تقریباً تمام قابل ذکر اہل علم کوایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کا اعزاز بخشا گیا،لیکن علامہ شبلی کواس سے محروم رکھا گیا۔حالانکہ اس دور میں بھی جبکہ وہ انجمن ترقی اردو سے مستعفی ہو چکے تھے،انجمن کے مسودات پران سے رائے لی جاتی اوران سے مشورے رہتے۔

علامہ شبلی نے ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالہ سے جوعلمی وتعلیمی خدمات انجام دیں ان کا مطالعہ زیرنظر کتاب میں اسی تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے،جس ترتیب پرانجمن کی تاریخیں مرتب اورشائع کی گئی ہیں۔یعنی سنہ وارتفصیلات جمع کی گئی ہیں۔اس سے علامہ شبلی کی سرگرمیوں کی

تفصیلات تسلسل سے سامنے آجاتی ہیں۔اور چونکہ اس میں کانفرنس کے اہم تعلیمی فیصلے اور مشاہیر شرکاء اور سرسید کے بعض آرا و خیالات بھی جا بجا آ گئے ہیں۔اس لئے زیر نظر کتاب سے علامہ شبلی کے ساتھ کانفرنس کی تاریخ کا بھی ایک اجمالی مرقع سامنے آجاتا ہے۔

جس وقت ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا اس وقت علامہ شبلی کو علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے وہ جدید تعلیم سے ناآشنا تھے،مگر تعجب ہوتا ہے کہ جب وہ کانفرنس کے اجلاسوں میں تعلیمی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں یا اس کی باریکیوں اور نزاکتوں کا ذکر کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑے ماہر تعلیم ہیں اور نہ صرف فن تعلیم و تربیت سے گہری واقفیت رکھتے بلکہ اس کی تاریخ اور عہد بہ عہد ارتقا پر بھی ان کی وسیع نگاہ ہے۔کئی سال بعد جب وہ ندوہ میں معتمد تعلیم منتخب ہو کر لکھنو آئے،اس وقت بلاشبہ جدید و قدیم تعلیم اور اس کے فوائد و نقصان پر وہ بھرپور نظر رکھتے ہیں،مگر کانفرنس کے ابتدائی زمانہ میں بھی ان کی تعلیم اور تعلیمات پر عالمانہ نظر تھی۔تصدیق کے لئے علامہ شبلی کی ان تعلیمی تقریروں اور قراردادوں پر ان مباحث کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے جو کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں زیر بحث آئے اور جو اس کتاب کے مختلف حصوں میں نقل کئے گئے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سرسید کا عظیم کارنامہ ہونے کے باوجود اس کے حوالہ سے سرسید احمد خاں کا ابھی تک گہرائی سے مطالعہ و جائزہ پیش نہیں کیا گیا۔مولانا الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] نے حیات جاوید میں جو کچھ لکھ دیا تھا واقعہ یہ ہے کہ معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھا۔اسی طرح علامہ شبلی کی اس ۲۷ رسالہ تعلیمی جدو جہد پر جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کے ان چند صفحات کے سوا جو حیات شبلی میں لکھے گئے سرے سے ایک مقالہ بھی نہیں لکھا گیا۔علامہ شبلی کی اس انتہائی اہم تعلیمی جدو جہد سے بے اعتنائی نے ناچیز کو کمزور صحت کے باوجود اس دشوار گذار کام پر آمادہ کیا اور کئی ماہ کی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد جو کچھ ہو سکا وہ قدردانان شبلی و سرسید کی خدمت میں حاضر ہے۔

ناچیز نے کوشش کی ہے کہ تمام باتیں مستند حوالوں سے قلم بند کی جائیں اور اصل سورسیز کا

حوالہ دیا جائے ،مگر ایجوکیشنل کانفرنس کی بعض رودادوں کی عدم دستیابی کے سبب بعض دیگر حوالوں کو بھی روا رکھنا پڑا ہے۔ تاہم مآخذ کی پورے طور پر تنقیح کے بعد ان کے حوالے دئے گئے ۔ تجزئے میں قیاس کو قطعی طور پر جگہ نہیں دی گئی ہے، بلکہ حقائق کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔تعلیقات وحواشی میں چند ایک کے سوا بیشتر شخصیات کا تذکرہ ہے۔اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ زیر تحریر شخصیت سے علامہ شبلی کا کیا تعلق تھا یا علامہ شبلی کے بارے میں ان کے کیا خیالات تھے۔ بالفاظ دیگر تعلیقات وحواشی بھی ذخیرہ شبلیات کا ایک حصہ ہیں۔اس میں حواشی نگار کو کہاں تک کامیابی ملی ہے اس کا فیصلہ ناظرین کے ذوق سلیم پر ہے۔

موضوع کی تکمیل کے لئے علامہ شبلی کے ان خطبات اور منظومات کو جن کو انہوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش کیا تھا،طوالت کے باوجود نقل کیا گیا ہے۔اس سے علامہ شبلی کی خدمات کے ساتھ کانفرنس سے ان کی مسلسل وابستگی اور جذباتی تعلق کا پہلو نمایاں تو ہوتا ہی ہے کانفرنس کے عہد بہ عہد ارتقاء کی تاریخ اور اس کے اثرات کا بھی کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ کار اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ اس سے ایجوکیشنل کانفرنس سے علامہ شبلی کی طویل وابستگی کا پورا منظرنامہ سامنے آجائے۔

سرسید احمد خاں کی وفات ۱۷/مارچ ۱۸۹۸ء کے فوراً بعد مئی ۱۸۹۸ء میں علامہ شبلی نعمانی علی گڑھ کی ملازمت سے مستعفی ہوئے۔ یہاں سے وہ ندوہ جانا چاہتے تھے،مگر بوجوہ ایسا ممکن نہ ہوسکا اور انہیں حیدرآباد جا کر سررشتہ علوم وفنون کی نظامت کرنی پڑی۔ پھر جونہی حالات سازگار ہوئے انہوں نے حیدرآباد سے استعفیٰ دیا اور ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر لکھنو آ گئے۔ندوے کا تعلیمی نقطہ نظر علی گڑھ سے قدرے مختلف ہے۔حالانکہ علامہ شبلی کا یہ نظریہ تعلیم پہلے دن سے تھا۔علی گڑھ کے زمانہ قیام میں بھی ان کے نقطہ نظر کا بارہا اظہار ہوتا رہا۔ یہاں دو باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔اول یہ کہ اراکین ایجوکشنل کانفرنس میں تحریک ندوہ کے حامی صرف علامہ شبلی ہی نہیں تھے بلکہ سرسید احمد خاں،سید محمود،نواب محسن الملک اور دوسرے بہت سے تحریک علی گڑھ کے عمائدین بھی شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کانفرنس کے متعدد اجلاسوں میں ندوہ کا ذکر آیا ہے اور اس کی حمایت کی

گئی ہے،مگر تحریک ندوہ میں شامل صرف علامہ شبلی ہوئے۔وجہ اس کی یہ تھی علامہ شبلی اسی تعلیمی نقطہ نظر میں ملت اور فرزندان ملت کی کامیابی تصور کرتے تھے۔اس سب کے باوجود علامہ شبلی نے ایجوکیشنل کانفرنس اور ایم اے او کالج علی گڑھ سے اپنا رشتہ کبھی منقطع نہیں کیا۔علی گڑھ میں طلبائے کالج سے ان کا آخری خطاب وفات سے ایک سال پیشتر ۱۳؍فروری ۱۹۱۳ء کا ہے۔اسی طرح خاص طور پر کانفرنس میں وہ سوائے مجبوری کے ہمیشہ شریک ہوتے اور اپنا حق ادا کرتے رہے۔ اس کی ایک طویل داستان ہے۔یہ کتاب اصلاً اسی داستان پر مشتمل ہے۔

مجھے خوشی و مسرت ہے کہ آج علامہ شبلی کی حیات علمی کے ایک اور اہم پہلو کو پیش کرنے کی اللہ تعالی نے توفیق بخشی۔میں اپنے رب کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہوگا کہ اس نے اس ناچیز کو کم علمی اور کم مائیگی کے باوجود یہ سعادت بخشی۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب ڈائرکٹر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ اور ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی صاحب جوائنٹ سکریٹری دارالمصنّفین نے ناچیز کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں ان بزرگوں کی صحت وتندرستی کے لئے خاص طور پر دعا گو ہوں۔احباب میں ڈاکٹر عطا خورشید صاحب [مولانا آزاد لائبریری،علی گڑھ] ڈاکٹر مہر الیاس اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ لسانیات و ادبیات اردو گورنمنٹ کالج سیال کوٹ،ڈاکٹر سید مسعود حسن [خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ]،اور برادرم مولانا عرفات اعجاز اعظمی صاحب کا بے حد ممنون اور شکر گذار ہوں۔ان احباب نے میرا بڑا تعاون کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر ان کا تعاون شامل حال نہ ہوتا تو ملازمت کی مصروفیات اور خراب صحت کے ساتھ اعظم گڑھ میں بیٹھ کر یہ علمی وتحقیقی کام بہرحال انجام نہیں پا سکتا تھا ۔دعا ہے کہ اللہ تعالی ان سب کو جزائے خیر دے۔

ناچیز
محمد الیاس الاعظمی
۲۸؍جولائی ۲۰۲۱ء

○○○

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی میں ناکامی کے بعد مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور انگریزوں کا بلاشرکت غیرے ہندوستان پر تسلط قائم ہوگیا۔ چونکہ انہوں نے حکومت مسلمان سے چھینی تھی اور پھر ۱۸۵۷ء میں مسلمان ہی بہادر شاہ ظفر کی سرپرستی میں ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے مسلمانوں ہی کو اپنا اصل دشمن تصور کیا اور ان کے خلاف تادیبی کارروائیاں جاری رکھیں اور انہیں ہر طرح سے تباہ و برباد کرنے میں مسلسل لگے رہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سیاسی زوال کے ساتھ تہذیبی و تمدنی زوال سے بھی دوچار ہوئے اور پھر اس کے جو نتائج سامنے آئے وہ ناقابل بیان حد تک تکلیف دہ ہیں۔ مسلمانوں کا شیرازہ ایسا منتشر ہوا کہ وہ برصغیر کی سب سے کم حیثیت قوم ہوگئے۔ اس کا ذکر تو بہت سے اہل فکر و نظر نے کیا ہے اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن جس صاحب شعور و دانش نے اس کے مضمرات کو محسوس کیا اور اس کے تدارک یعنی مسلمانوں کو اس قعر مذلت سے نکالنے اور انہیں شاہراہ ترقی پر گامزن کرنے کے لئے جو میدان میں آئی اور جس نے اپنا سب کچھ قربان کردیا، اس کا نام سرسید احمد خاںؒ [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] ہے۔

علامہ شبلی سرسید احمد خاں کے نامور رفقاء میں تھے۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء نے ایسے حالات میں جب کہ ہر طرف تباہی و بربادی کے مناظر تھے، جو کچھ کر دکھایا وہ ایک معجزے سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔ میرے اس خیال کی وہ لوگ تائید کریں گے جن لوگوں نے ۱۸۵۷ء کی قیامت اور اس کے مضمرات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام

سرسید احمد خاں نے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر ایم اے او کالج علی گڑھ کی بنا ڈالی جو آج دنیا بھر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کا نام روشن کئے ہوئے ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی۔ اور طے پایا کہ اس کانفرنس کے اجلاس ہر سال ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں منعقد کئے جائیں۔ تاکہ اس کی روشنی دور دور تک پھیلے۔ چنانچہ اس کے اجلاس سال بہ سال مختلف شہروں میں منعقد کئے جاتے، جس میں تمام عمائدین ملک وملت اور امراء و روسا شریک ہوتے۔ اور قوم کی زبوں حالی کا جائزہ لیتے اور اسے جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کی فکر اور جدوجہد کرتے۔ اس حوالہ سے ایم اے او کالج کا ذکر نسبتاً زیادہ ہوتا ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ سرسید احمد خاں کے عظیم الشان کارناموں میں ایک بہت ہی اہم کارنامہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام اور پھر تاحیات خون جگر سے اس کی آبیاری ہے۔ انہوں نے کانفرنس کے قیام کے وقت جو خطبہ دیا تھا اور جوان کے دل کی آواز بھی تھا اور ملت کے دل کی بھی۔ آپ اس خطبہ سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس وقت سرسید کے جذبات کیا تھے۔ وہ کیا چاہتے تھے۔ اور وہ کون سی آگ تھی جوان کے دل میں لگی ہوئی تھی۔ اس خطبے سے اس کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

یہ خطبہ انہوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جو علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا ایک رزولیشن کے جواب میں دیا تھا۔

سرسید کا خطبہ

حضرات من!

مجھے اس بات کی عزت دی گئی ہے کہ میں اس کانگریس میں جو قومی تعلیم پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئی ہے پہلا رزولیشن پیش کروں اور وہ رزولیشن یہ ہے:

مسلمانوں میں ہرقسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کر کے اور اس خیال سے کہ ان کی ہرقسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جاوے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے، جو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے موسوم ہو۔ یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام میں جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد کرنے کی خواہش کریں اور اس کا انتظام خود فرماویں، منعقد ہوا کرے گا۔

اے صاحبو!

مسلمانوں کی حالت کا تنزل اب اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ تمام ہندوستان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکلے گا جو اس کو تسلیم اور اس پر افسوس نہ کرتا ہو۔ ہماری حالت زار اب اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ غیر قومیں بھی ہم پر آنسو بہاتی ہیں اور ہمارے بچوں کی تعلیم کے لیے خیرات سے روپیہ جمع کرنے پر کوشش کرتی ہیں۔ بلا شبہ ہم کو اپنے ہم وطن ہندو بھائیوں کا جنھوں نے صوبہ دکن میں ایسا ارادہ کیا شکر گذار ہونا لازم ہے، مگر کیا ہماری قوم میں جن کے اسلاف کے ناموں کی شہرت دنیا کے ہر ایک حصہ میں گونج رہی تھی اور جن کے سیف وقلم کی نام آوری کے نشان ہسٹری میں اور دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اب تک پائے جاتے ہیں، اتنی عزت اور ہمت بھی باقی نہیں رہی ہے کہ اپنی قوم کی تباہ حالت کی درستی پر توجہ کریں۔

اے صاحبو! جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم کو اس وقت بجز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قومی میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جاوے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔ پس غور طلب یہی امر ہے کہ تعلیم کی ترقی کیونکر ہو۔

اس وقت ہمارا یہ حال ہے کہ گو ہم ایک قوم مسلمان کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ہی ناواقف ہیں جیسے کوئی اجنبی قوم ایک دوسرے کے

حال سے ناواقف ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ پنجاب کے لوگوں کو اپنی قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت کیا خیال ہے؟ اور انھوں نے کیا کیا ہے اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟۔ پنجاب تو ایک دوسرا صوبہ ہے۔ ہم اپنے صوبہ کے ہی ایک ضلع کے رہنے والے دوسرے ضلع کے رہنے والوں کے حال سے محض ناواقف ہیں۔ کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہیں ہے کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں۔ ایک کے حال سے دوسرے کو آگاہی ہو۔ ہم آپس میں مل کر اپنے خیالات جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں دوسروں پر ظاہر کر سکیں۔ ایک دوسرے کے خیالات سے تبادلہ ہو۔ جو غلطی ہمارے خیال میں ہو وہ دوسروں کے خیال سے بخوبی اصلاح پاوے۔ مختلف اضلاع کے لوگوں کے باہم جمع ہونے سے آپس میں واقفیت، آپس میں محبت اور اخلاص باہمی، ہمدردی اور یگانگت پیدا ہو۔ ہم باوجود ایک قوم مسلمان ہونے کے جو بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں۔ ان میں قومی یگانگت بلکہ مجھ کو کہنا چاہیے کہ قومیت پیدا ہو۔ اس اجنبیت نے ہم میں سے قومی ہمدردی کو مٹا دیا ہے۔ اسی طرح پر باہم جمع ہونے سے اور ایک مقصد یعنی قومی بھلائی، قومی تعلیم، قومی ترقی کے لیے جمع ہونے سے دوبارہ قومی ہمدردی ہم میں پیدا ہو، یا جس قدر ہے اس میں زیادہ ترقی ہو۔

آپس میں ملنے سے اور مختلف امور پر جو مذہبی تعلیم اور قومی ترقی سے علاقہ رکھتے ہیں بحث مباحثہ یا تذکرہ و تذکار کرنے سے ضرور ہے کہ کوئی عمدہ راہ قومی ترقی اور قومی تعلیم کی ہاتھ آوے۔ ہر ایک ضلع کے لوگ جو مختلف راہیں چلتے ہیں وہ سب سمجھ بوجھ کر ایک ایسا سیدھا راستہ قومی تعلیم کے لیے اختیار کریں جو منزل مقصود کو پہنچانے والا ہو۔

اس وقت قومی تعلیم یا قومی ترقی کی نسبت ہمارے خیالات ایسے پراگندہ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے مدد نہیں پہنچتی اور گویا ہماری قومیں متفرق ہو کر کمزور ہو جاتی ہیں۔ ہم سب کو اگر ایک سیدھا راستہ قومی تعلیم اور قومی ترقی کا ہاتھ آجاوے تو تمام متفرق قومیں ایک رستہ پر جمع ہو جاویں گی اور قومی تعلیم کی ترقی پر زیادہ تر آسانی حاصل ہوگی۔

گورنمنٹ ملکہ معظّمہ قیصر ہند ہماری بہبودی اور تعلیم کی ترقی کے لیے ہر وقت آمادہ ہے اور

ہم بھی اپنی گورنمنٹ سے ہر طرح مدد و امداد چاہتے ہیں، مگر ہم خود ایسی مختلف درخواستیں گورنمنٹ سے کرتے ہیں اور ایسی متضاد رائیں پیش کرتے ہیں جو ایک دوسری سے متناقض ہوتی ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے خود ابھی تک تنقیح نہیں کیا کہ ہماری تعلیم اور ہماری ترقی کے لیے درحقیقت کون سا طریقہ ہے۔اس قسم کے مجمع سے اور آپس میں کلمہ اور کلام کرنے سے ضرور ہے کہ ہم کو ایک ایسا مستحکم طریقہ اپنی تعلیم اور ترقی کا ہاتھ آوے گا، جو بلا کسی شک وشبہ کے ہماری قوم کے لیے مفید ہوگا۔

میں یقین کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں جس قدر فیاضی صوبہ پنجاب نے تعلیم کے باب میں کی ہے اور جس قدر روپیہ وہاں کے رئیسوں نے تعلیم کے لیے دیا ہے وہ ایک بے مثل اور بے نظیر فیاضی ہوئی ہے، مگر چونکہ ان فیاضی کرنے والوں نے اس بات کی پورے طور پر تنقیح نہیں کی تھی کہ درحقیقت ہمارے ملک کی بھلائی کے لیے کونسا طریقہ اختیار کرنے کے قابل ہے اس فیاضی نے ملک کو کچھ فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ اگر میں جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ بعوض فائدہ کے کسی قدر نقصان پہنچا۔

انھیں خیالات سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی پر غور کرنے کے لیے مختلف مقامات اور مختلف صوبہ جات کے لوگ ایک جگہ جمع ہوا کریں اور ایک صوبہ اس ضلع کے لوگوں کے ذریعہ سے دوسرے صوبہ اور ضلع کے مسلمانوں کو حالات معلوم ہوتے رہیں اور جو تدابیر ان کی بھلائی اور ترقی کی نسبت سوچی جاویں ان پر بحث اور مباحثہ ہو کر جو تدبیر عمدہ قرار پاوے وہ اختیار کی جاوے۔

یہ سالانہ جلسہ جیسے کہ آپ نے رزولیوشن پیش شدہ سے معلوم کیا ہوگا کسی ایک مقام کے لیے مخصوص نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ہر ایک صوبہ اور شہر میں جہاں کے لوگ اس کی خواہش کریں گے، منعقد ہو سکے گا۔اور اس سے یہ فائدہ ہے کہ جو لوگ کسی سبب سے ایک مقام کے جلسہ میں شامل نہیں ہو سکتے وہ دوسرے مقام کے جلسہ میں شامل ہو سکیں گے اور اس تدبیر سے اس جلسہ کے فوائد زیادہ تر عام ہو جاویں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو رزولیوشن پیش ہوا ہے اس کے مقاصد کو گو کہ مختصراً مگر کافی طور سے میں نے بیان کیا ہے اور اب میں تحریک کرتا ہوں کہ یہ جلسہ اس پر غور کرے اور درصورت یہ کہ پسند ہو تو منظور کیا جاوے۔(مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز ص ۳۲۴۔۳۲۷)

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس جنگ بہادر مولوی سمیع اللہ خاں [۱۸۳۴۔۱۹۰۸ء] سب جج علی گڑھ، بانی ایم بی ہاؤس الہ آباد کی صدارت میں منعقد ہوا۔انہوں نے مختصر لیکن فکرانگیز خطبہ دیا۔اس وقت سے آج تک ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی اور تمدنی خدمت انجام دے رہی ہے۔ڈیڑھ صدی بعد آج بھی کانفرنس کسی نوع سے سہی زندہ ہے۔یہ بجائے خود ایک بڑی اہم اور قابل ذکر بات ہے۔دراصل یہ سرسید احمد خاں کے اخلاص کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

کانفرنس کے مقاصد

سرسید احمد خاں کی تقریر سے اگر چہ ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد عیاں ہو چکے ہیں، تاہم اس وقت اس کے جو مقاصد قرار دئے گئے تھے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔مسلمانوں میں یورپین لٹریچر پھیلانے ،اس کو وسیع حد تک ترقی دینے اور اس میں نہایت اعلی درجہ کی تعلیم ان تک پہنچانے پر کوشش کرنا۔

۲۔مسلمانو نے جو قدیم علوم میں ترقی کی اس کی تحقیقات کرانا۔اور اس پر اردو یا انگریزی میں رسالہ جات تحریر کرانا۔یا لوگوں کو آمادہ کرنا۔

۳۔نامی علماء اور مشہور مصنّفین اسلام کی لائف (سوانح عمریوں) کو اردو یا انگریزی زبان میں لکھوانا۔

۴۔مسلمان مصنّفین کی تصنیفات جو نایاب ہیں ان کو بہم پہنچانے کی تدبیر کرنا۔یا پتہ لگانا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں۔

۵۔تاریخانہ واقعات ،زمانہ قدیم کی تحقیقات پر رسالہ جات تحریر کرنے یا لکچر دینے پر لوگوں کو آمادہ کرنا۔

۶۔دنیاوی علوم کے کسی مسئلہ یا تحقیقات پر کسی رسالہ کے تحریر ہونے یا لکچر دینے کی تدبیر کرنا۔

۷۔فرامین شاہی کو بہم پہنچا کران سے ایک کتاب انشاء کا مرتب کرنا اوران کے طغرا کے نمونے فوٹو گراف سے قائم رکھنا۔

۸۔مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جوانگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے قائم ہیں۔ مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔(مرقع کانفرنس ص۴-۵)

بعد میں ان مقاصد اور ایجوکیشنل نفرنس کے دستورالعمل میں ضرورت کے مطابق ترمیم و تنسیخ اور حذف واضافہ ہوتا رہا اور حالات وضروریات زمانہ کے تحت نئے قواعد وضوابط بنائے اور منظور کئے جاتے رہے۔تاہم کانفرنس نے اپنے بنیادی مقصد یعنی مسلمانوں کے روشن مستقبل کے لئے تعلیمی جدو جہد سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے بقول مولانا حالی:

''دوطریقے تجویز کئے گئے تھے۔ایک یہ کہ ہرسال کسی مناسب مقام پر جہاں کے ممتاز آدمی کانفرنس کے اجلاس کی خواہش کریں اور کانفرنس کا انتظام اپنے ذمہ لیں کانفرنس کا اجلاس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو تجویزیں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق مناسب سمجھیں وہ اجلاس میں پیش کریں اور بعد غور اور مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے ان کی منظوری یا نامنظوری عمل میں آئے۔دوسرے جہاں تک ممکن ہو ہر شہر وقصبہ میں کانفرنس کے مقاصد کے لئے کمیٹیاں قائم کی جائیں اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں اگر وہ منظور کریں تو انہیں کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا جائے۔تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے نواح یا ضلع یا قصبہ کی نسبت وقتاً فوقتاً ہر قسم کے مدارس اور مکاتب وصنعت و حرفت وتجارت وزراعت وغیرہ کی ترقی وتنزل کے حالات جو مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں تحریر کرکے کانفرنس کے جلسوں میں بھیجتے رہیں اور جو تجویز کانفرنس

کے سالانہ جلسوں میں منظور ہوں ان میں سے جو تجویز ان کے علاقہ میں قابل اجرا ہو اس کے جاری کرنے کی کوشش کریں۔(حیات جاوید ص ۲۴۵)

پروفیسر اقبال حسین نے ''دستاویز مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے نام سے کانفرنس سے متعلق سرسید ہاؤس میں منتشر کاغذات کو بڑے سلیقہ سے یکجا کر کے شائع کیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس کے اجلاسوں کے انعقاد سے پہلے سرسید اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی کرتے تھے۔مذکورہ کتاب میں اس سے متعلق کئی ایسے دستاویزات شامل ہیں جن سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ابتدائی دور میں کم از کم رزولیشن اور اس کے پیش کرنے ،اور تائید وحمایت کرنے والے اشخاص پہلے سے طے ہوتے تھے۔(دستاویزات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ص۱۰،ص ۴۸،ص ۸۵)

قوی امکان یہ ہے کہ کانفرنس کے ابتدائی ادوار میں اس کے اراکین کی تربیت کے لئے سرسید نے ایسا کیا ہو۔اور میرا یہ قیاس اس وقت یقینی ہوجاتا ہے جب بانی کانفرنس سرسید احمد خاں کانفرنس کے دوسرے ہی اجلاس میں کانفرنس میں شرکت کے اصول اور اس میں حصہ لینے کے ضوابط ،قرارداد پیش کرنے اور تائید وحمایت کے اصول وآداب لکھ کر پیش کرتے ہیں۔اور ہر شخص کو اس پر سختی سے عمل کا مشورہ دیتے ہیں۔طوالت کے سبب بس ان اصولوں کے عناوین یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔طریق نشست

۲۔طریق لکچر

۳۔درپیشی رسالہ جات وکیفیات اضلاع

۴۔رزولیشن اور اس پر مباحثہ کرنے کا طریقہ

۵۔قواعد جن کی تعمیل اسپیچ کرنے والوں کو لازم ہوگی۔

۶۔ووٹ کرنے والوں کا طریقہ وغیرہ۔

بعدازاں انہوں نے مذکورہ عناوین کی تفصیل اور تشریح کی ہے۔(مرقع کانفرنس ص ۲۰-۲۲)

بہرحال سرسید احمد خاں نے نہ صرف کانفرنس قائم کی ،اس کے اصول وضوابط بنائے بلکہ

خود اس میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔اس کی تفصیل اس کی سالانہ رودادوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

کانفرنس کے قیام کا مقصد اگرچہ مسلمانوں کی تعلیم وتربیت تھا، تاہم اس حوالہ سے وہ مسلمان دانشوروں میں بھی جدید شعور وآگہی پیدا کرنے کے آرزومند تھے۔کانفرنس کی تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے اور علمی وتعلیمی کارناموں کے سوا محض ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالہ سے ملت پر جو احسانات ہیں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ سرسید اور کچھ نہ کرتے صرف ایجوکیشنل کانفرنس ہی قائم کردیتے تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے محسنین میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔

دراصل سرسید بڑے اعلی دماغ ،وسیع القلب اور یگانہ روزگار شخص کا نام ہے۔مخالفین کو برداشت کرنا۔ان کی باتیں سننا اور درست ہونے کی صورت میں قبول کرنا۔ان کی اعلی ظرفی کی باتیں ہیں۔ہماری دانشوری کے سلسلہ کا آغاز بھی انہیں سے ہوتا ہے۔یہی سبب ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کا دائرہ چند برسوں میں انہوں نے اتنا وسیع کردیا کہ اس کے اجلاسوں میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر مکتبہ فکر کے اہل علم اور ارباب کمال شریک ہونے لگے اور اپنے آراء وخیالات کا اظہار کرنے لگے جو کانفرنس کے ایک اہم مقصد کی تکمیل بھی تھا۔

کانفرنس کا مرکز اگرچہ علی گڑھ تھا، تاہم اس کی شاخیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔علاوہ ازیں چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں الگ تھیں۔اس کے اجلاسوں کی صدارت ملک کی ایسی سربرآوردہ شخصیات سے کرائی جاتی تھی، جس کا اثر ورسوخ مسلمانوں میں زیادہ ہوتا۔یہی نہیں ملک کے تمام بڑے اہل علم اور ارباب کمال اس میں شریک ہوتے۔مسلمان ہی نہیں ہندو اہل ذوق بھی شریک بزم ہوتے۔مرد ہی نہیں خواتین بھی شریک ہوتیں۔تعلیمی خطبات پیش کئے جاتے۔علماء وعظ ونصیحت سے نیکی کی طرف مائل کرتے۔شعرا اپنے کلام سے حرارت ایمانی میں قوت پیدا کرتے۔اس سے کانفرنس کو عوامی مقبولیت بھی حاصل ہوگئی تھی اور بہت سے لوگ ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی کے خطبات اور ان کی نظمیں سننے کے لئے دور دراز سے آکر شریک

ہوتے تھے۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر شخص کے دل میں قومی ترقی اور محکومی کی زندگی سے نجات کا داعیہ پیدا ہوگیا تھا اور سرسید احمد خاں نے اس محکومی سے نجات کی یہی شاہ راہ بتائی تھی کہ اس کا حل جدید تعلیم سے قوم کا آراستہ اور ہم کنار ہونے میں ہے۔ان کے اس خیال سے مسلمانوں کے ایک حلقے کو اتفاق نہیں تھا۔آج بھی ہم اس سے اختلاف کر سکتے ہیں۔علامہ شبلی نے بھی تحریک ندوہ میں شمولیت اختیار کر کے گویا سرسید کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا۔لیکن سرسید کے اخلاص اور ان کے رفقاء کی جدوجہد نے ایجوکیشنل کانفرنس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر دیا۔

کانفرنس کے شعبے:

جیسے جیسے ایجوکیشنل کانفرنس کا دائرہ وسیع ہوا اس میں متعدد نئے شعبوں کا اضافہ کیا گیا۔ شعبہ اردو جسے بعد میں انجمن ترقی اردو کا نام دیا گیا۔علاوہ ازیں شعبہ نسواں اور شعبہ اصلاح رسوم و معاشرت وغیرہ کا اضافہ کیا گیا۔اضافہ کے ساتھ باقاعدہ ان کے ذمہ دار مقرر کئے گئے۔

شعبہ اردو کے پہلے سکریٹری علامہ شبلی نعمانی نامزد ہوئے۔شعبہ اردو اور دوسرے شعبہ کے ذمہ دار سال بہ سال ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں اپنی رپورٹ اور کارگذاری پیش کرتے اور اراکین کانفرنس اس کا جائزہ لیتے اور کوشش کرتے کہ انہیں ترقی کے اسباب و مواقع فراہم کئے جائیں۔

علامہ شبلی نے بھی اپنے شعبہ انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ پیش کی ہے، بلکہ ابتدا میں تو وہ ماہ بہ ماہ رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس کے اعزازی سکریٹری اور اپنے دوست نواب محسن الملک کو پیش کرتے رہے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہیں۔

ooo

پہلا اجلاس۔علی گڑھ

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ۲۷ تا ۲۹ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو منعقد ہوا۔اگر چہ اس اجلاس کے صدر مولوی سمیع اللہ خاں[۱۸۳۴-۱۹۰۳ء] تھے(۱)، لیکن اس کے روح رواں اصلاً بانی کانفرنس سرسید احمد خاںؒ تھے۔

علامہ شبلی کی شمولیت اور قرارداد

علامہ شبلی نعمانی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] اس پہلے اجلاس میں پورے جوش وخروش سے شریک ہوئے۔ان کی گہری دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اجلاس کا بلکہ ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخ کا پہلا رزولیشن بانی کانفرنس سرسید احمد خاں نے پیش کیا تو اس کا دوسرا رزولیشن علامہ شبلی نعمانی نے پیش کرنے کا شرف حاصل کیا۔یہ قرارداد پیش کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے مختصر تقریر بھی کی اور کہا کہ

> اے معزز صاحبان جلسہ!
>
> مجھے اس بات کی عزت دی گئی ہے کہ اس قومی تعلیمی کانگریس میں جو ہماری عام تعلیمی ضرورتوں پر غور کرنے کے لئے قائم ہوئی ہے، دوسرا رزولیشن پیش کروں جو مندرجہ ذیل ہے:
>
> ''اس جلسہ کی رائے میں مسلمانوں کو مغربی علوم اور انگریزی زبان دانی میں نہایت اعلی درجہ کی تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔قوم اور گورنمنٹ دونوں کو اس پر توجہ دینا

چاہئے۔انگریزی کالجوں میں مشرقی تعلیم کا بطور سکنڈ لینگوج یعنی دوسری زبان کے رہنا کافی ہے۔ خاص مشرقی علوم کی نسبت ہم کو گورنمنٹ کی توجہ درکار نہیں ہے۔وہ جس طرح کہ ہمارے قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے عالموں کے ذریعہ سے ہوتی ہے، اس کو اسی طرح پر رہنا چاہئے اور خود ہماری قوم کو اس کے باقی اور قائم رہنے پر ایسے لوگوں میں جو اس کی خواہش رکھتے ہوں، توجہ رکھنی لازم ہے۔مشرقی علوم جو مسلمانوں میں قدیم سے اب تک رائج ہیں وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل سے ایسے مخلوط ہیں کہ جدا نہیں ہوسکتے اور اس لئے گورنمنٹ کو اس کا اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔اور اگر مذہبی مسائل کو اس سے خارج رکھا جاوے تو کوئی شخص جو مشرقی علوم کا خواہاں ہے اس کو پسند نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے اس کو اختیار کرے گا تو مسلمان کمیونٹی یعنی اسلامی گروہ میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔''(۲)

اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے اپنے رزولیشن کی تائید اور موضوع کی مناسبت سے یورپین سائنس اور لٹریچر پر ایک جامع تقریر کی۔تقریر درج ذیل ہے۔

یوروپین سائنس اور لٹریچر

یہ رزولیشن متعدد مضامین پر مشتمل ہیں اور ان کا جداگانہ بیان کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ بات کہ قوم کو انگریزی میں اعلیٰ تعلیم کی نہایت ضرورت ہے، ایک ایسا دعویٰ ہے جو اپنے ثبوت میں دلیل کا بہت کم محتاج ہے۔ظاہر ہے کہ ہماری ملکی ،تمدنی واخلاقی غرض ہر ایک طرح کی ترقی انگریزی میں اعلی درجہ کی تعلیم پر موقوف ہے۔

اگر آپ اس عجیب اور دردناک انقلاب کو جو مسلمانوں کی تاریخی زندگی میں برابر پیدا ہوتا گیا ہے، ذرا بھی غور کی نگاہ سے دیکھیں گے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہماری یہ حالت صرف اس وجہ سے ہے کہ ہماری قوم نے اب تک اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں کو بخوبی نہیں سمجھا۔یا اس سے دانستہ

بے اعتنائی کی۔

گورنمنٹ کے صیغۂ ملازمت میں ہمارا بہت کم حصہ ہے۔ ہم اپنے حقوق کے ظاہر کرنے کا کوئی معقول ذریعہ نہیں رکھتے۔ ہمارا کوئی قومی اخبار نہیں ہے، جو گورنمنٹ کی زبان میں گورنمنٹ کو ہمارے مقاصد سے مطلع کرے۔ لیکن جب پوچھا جائے کہ ایسا کیوں ہے تو یہی ایک جواب ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے نہ ہونے سے۔

ہماری سوشل اور مارل زندگی بھی بالکل بے ترتیب ہے۔ ہر ایک قوم میں جس کو حکومت کے ساتھ کچھ امتداد حاصل ہو، اس کے علوم اور خاندانی روایتوں کی بنا پر اخلاق اور معاشرت کا ایک بااصول سلسلہ تیار ہو جاتا ہے اور اسی لحاظ سے ہماری قوم کے پاس بھی جو ایک مدت تک تیغ و قلم دونوں کی مالک تھی، ایک مجموعۂ اخلاق موجود تھا۔ لیکن اس عام قاعدہ کے موافق کہ جب کسی قوم کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہتی ہے تو اس کے اخلاق و معاشرت پر بھی زوال آ جاتا ہے۔ ہماری قوم کی اخلاقی زندگی بالکل بے ترتیب ہو گئی ہے۔ اب اگر ہم اس کے اصلاح کی فکر کی طرف مائل نہ ہوں تو ضرور ہے کہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم حاصل کریں اور وہی سچائی، آزادی، دلیری، بلند ہمتی، اوقات کی پابندی، محنت شعاری سیکھیں، جو مغربی تعلیم کا ایک لازمی اثر ہے۔ ایشیائی بگڑے ہوئے اخلاق اسی تعلیم سے دور ہو سکتے ہیں، لیکن میری مراد اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہے نہ کہ ادنیٰ درجہ کی تعلیم، جس سے ہم نہ ادھر کے رہیں نہ ادھر کے۔

علمی ترقی جو زندگی کا اصل مقصد ہے، وہ یورپین اعلیٰ تعلیم پر موقوف ہے۔ یورپ میں علوم وفنون کو جو ترقی حاصل ہے، اس کے سامنے پچھلی ترقیوں کا ذکر کرنا بے سود ہے۔ زمانہ نے ہزاروں مسئلے علوم کے تعلق سے پیدا کر دئے اور جو قدیم مسائل تھے ان کو جلا دی۔ ایسی حالت میں ہماری علمی ترقی کے لئے صرف مشرقی زبانیں کافی نہیں ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ نہایت وسعت کے ساتھ قوم میں اعلیٰ تعلیم پھیلے۔ قوم میں اعلی تعلیم کے شائع ہونے کی جو ضرورت ہے، اس میں گورنمنٹ کا بھی حصہ ہے۔ اور یہ دعویٰ ہمارے رزولیشن کا ایک اصلی اور ضروری ٹکڑا ہے۔

جو گورنمنٹ ہماری تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار ہے، جس نے ہمارے امن و آرام

کے لئے سڑکیں، ریل، تار، نہریں، شفاخانے قائم کئے ہیں، کیا اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ ہمارے دماغ کو بھی پوری ترقی دے؟، جو صرف اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہوسکتی ہے۔ ملک کا اور گورنمنٹ کا اسی میں فائدہ ہے کہ ملک میں اعلی درجہ کی تعلیم مغربی رواج پاوے۔ گورنمنٹ کا یہی فرض ہے اور اس کو یہی کرنا چاہئے۔ مشرقی زبان سیکھنے کی ہم کو ضرورت ہے۔ مگر اس ضرورت کے مقدار کو ہم خود سمجھ سکتے ہیں اور جس کی نسبت ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اعلی تعلیم انگریزی حاصل کرنے والے کے لئے بطور سکنڈ لینگویج کے پڑھنا کافی ہے۔ اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ مشرقی علوم (جس کے یاد کرنے سے ہمارے دلوں میں اب بھی ایک حسرت آمیز جوش پیدا ہوتا ہے) کے ساتھ گورنمنٹ کی ہمدردی ہماری ہمدردی سے زیادہ ہوسکتی ہے۔ قوم کے وہ اشخاص جو انگریزی تعلیم سے الگ رہنا چاہتے ہیں، اور واقعات نے ان کو اس تعلیم سے روک دیا ہے، ان کو بے شبہ مشرقی اعلی درجہ کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ مگر اس کے قیام کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ گورنمنٹ سے اس کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ گورنمنٹ ہم کو اس معاملہ میں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ مشرقی علوم کی ترتیب اور طرز تعلیم سے گورنمنٹ بہت کم واقف ہے۔ اور جس واقفیت کا اس کو دعوی ہے اس پر ان لوگوں کو اطمینان نہیں ہے جو مشرقی تعلیم کے خواہاں ہے۔

گورنمنٹ جن لوگوں کو بہت بڑا ادیب اور فاضل سمجھ کر اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بیش قرار تنخواہوں پر مقرر کرتی ہے، مشرقی تعلیم کے خواہاں ان کی عزت ایک طالب علم کے برابر نہیں کرتے۔ مشرقی تعلیم کی اسکیم انگریزی تعلیم سے بالکل الگ ہے۔ اور یہ بالکل سچ ہے کہ مشرقی علوم کو انگریزی کالجوں کے احاطہ میں ڈھونڈنا بالکل بے فائدہ ہے۔ انگریزی کالجوں پر موقوف نہیں اسلامی مدارس بھی جو ایک خاص پابندی کے ساتھ کسی زمانہ میں قائم تھے علوم مشرقی کے لئے چنداں مفید نہ تھے۔ مسلمانوں میں جو بڑے بڑے فلاسفر، حکیم، محقق اور امام گذرے ہیں۔ انہوں نے مدرسوں میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ وہ سب خانگی تعلیم کے ذریعے سے اس رتبہ پر پہنچے تھے۔

گورنمنٹ اگر مشرقی تعلیم اپنے ہاتھ میں لے تو اس کو ایک اور مشکل کا سامنا ہوگا۔ مشرقی تعلیم مذہبی تعلیم کے ساتھ ایسی مخلوط ہوگئی ہے کہ اگر اس سے جدا کر دی جائے تو مشرقی علوم بے اثر

اور کم وقعت رہ جائیں گے۔مسلمانوں میں علوم ہمیشہ مذہب کے ماتحت رہے۔غزالی (۳)، فخر رازی (۴)، طوسی (۵) جن کو یورپ کے لوگ فلاسفر کہتے ہیں، وہ ہماری قوم میں زیادہ تر اس وجہ سے عزت رکھتے تھے کہ ان کو پیشوائے مذہبی بھی مانا گیا تھا۔مذہبی علماء قوم پر ایک پولیٹیکل اثر رکھتے تھے۔اور عام لوگ ان کو اپنا مذہبی اور اخلاقی حکمراں خیال کرتے تھے۔مشرقی تعلیم کی طرف میلان عام کے یہ اسباب تھے۔اب اگر اس سلسلہ میں سے مذہبی تعلیم جو درحقیقت مشرقی علوم کی جان ہے، نکال دی جائے تو مسلمان اس کی کچھ قدر نہ کریں گے۔پس گورنمنٹ جس طرح پر کہ مشرقی علوم کی تعلیم دینا چاہتی ہے اور جس طریقہ پر کہ وہ دے سکتی ہے، وہ درحقیقت مشرقی علوم کی تعلیم نہیں ہے اور نہ ان لوگوں پر کچھ احسان ہے جو ایسی تعلیم کے خواہاں ہیں۔گورنمنٹ کو اس معاملہ میں نہیں پڑنا چاہئے۔اس کا فرض یورپین تعلیم کو نہایت اعلیٰ درجہ تک پہنچانا چاہئے۔غالباً میں نے اس رزولیشن کے ہر ایک پہلو پر بحث کی ہے۔اور اب میں چاہتا ہوں کہ وہ کمیٹی کی عام رائے سے پاس کیا جاوے۔''(۶)

علامہ شبلی کی اس معلومات افزا اور حیرت انگیز گفتگو سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کیسا اخاذ ذہن پایا تھا کہ علی گڑھ کے محض چار سالہ قیام، سرسید اور پروفیسر آرنلڈ (۷) کی صحبت سے ان کے علم و معلومات نے کس قدر ترقی کر لی تھی۔یہ واضح رہے کہ علامہ شبلی فروری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے تھے۔

بعدازاں سرسید احمد خاں نے علامہ شبلی کی اس قرارداد کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس کی حمایت میں ایک مفصل تقریر بھی کی اور کہا کہ

''میں اس رزولیوشن کے پاس ہونے کی تائید کرتا ہوں، کیا اب بھی کسی کو اس بات میں شبہ باقی ہے کہ ہماری قوم کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہائی انگلش ایجوکیشن ہے۔سوائے ان چند پرانے خیال کے لوگوں کے جن کی تعداد کئی ہزار درجہ ان سے بھی کم ہے جو اب تک سورج کے زمین کے گرد گھومنے پر یقین کرتے ہیں اور جو دراصل انگلش تعلیم ہی کو ناجائز سمجھتے ہیں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ہائی انگلش ایجوکیشن کا خواہش مند نہ ہو درحقیقت ہندوستان میں اب

تک ہائی ایجوکیشن کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں نے ہم کو اب تک صرف ہائی ایجوکیشن کے دروازہ تک پہنچایا ہے۔مگر اس کے اندر جانے کا رستہ بند کر رکھا ہے۔ انسان کی تعلیم کی عمدہ حالت ہونے کو یہ بات لازم ہے کہ وہ ہر فن میں کچھ کچھ جانتا ہو۔ اور ایک میں کامل ہو۔مگر ہندوستان کے کالج اور ہماری یونیورسٹیاں ہم کو کچھ کچھ سکھلاتی ہیں اور کسی ایک میں کامل نہیں کرتیں، ہم ہندوستان کے کالجوں سے خواہ وہ گورنمنٹ کے کالج ہوں یا پرائیویٹ جو شکایت ہے وہ ہائی ایجوکیشنل کے نہ ہونے کی ہے پس اگر موجودہ ایجوکیشنل تک بھی ہماری رسائی نہ ہو جس کا نام غلطی سے ہائی ایجوکیشنل رکھا ہے تو میں نہیں خیال کر سکتا کہ ہماری تعلیم کس درجہ تک خراب حالت میں پہنچ جاوے گی۔ یہ میری رائے کوئی نئی رائے نہیں ہے۔۱۸۶۹ء میں جبکہ لنڈن میں تھا میں نے ایک چھوٹا سا رسالہ ہندوستان کی تعلیم پر لکھا تھا اس کا ایک فقرہ اس مقام پر نقل کرنا مناسب نہ ہوگا۔

میں نے لکھا تھا کہ سرکار انگریزی نے ہندوستان میں دو نہایت بڑے کام کئے ہیں۔مگر ایک کام دوسرے کے متناقض ہے۔اول تو گورنمنٹ نے نہایت فیاضی سے اقرار کیا کہ اس کی تمام رعایا کے حقوق خواہ وہ رعایا ہندوستانی ہو یا انگریزی ہر اعتبار سے برابر ہوں گے۔ دوم گورنمنٹ نے ہم کو ہماری زبان مادری اور ہمارے موروثی علوم سے محروم کر دیا اور ہم کو انگریزی زبان اور یوروپین سائنس کے سیکھنے کو مجبور کر دیا، اب دوسری بات کا نتیجہ تو یہ ہے کہ گورنمنٹ پر یہ فرض ہو گیا کہ ہندوستانیوں کو زبان وعلوم مذکورہ سکھا دے اور اقرار جو اس قدر ضمناً اور عموماً کیا گیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بات گورنمنٹ پر لازمی ہوگئی ہے کہ ہندوستانیوں کو اس درجہ تک تعلیم دے کہ ان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت ہو جاوے۔ یا یوں کہو کہ وہ اپنے تئیں ایسا لایق کرنے کی کوشش کریں کہ جو عہدے انگریزوں کو ملتے ہیں وہ بھی پا سکیں اگر گورنمنٹ ہندوستانیوں کو اس درجہ تک کی تعلیم نہ دے گی تو اس نے اپنے اقرار کو پورا نہیں کیا اور ہندوستانیوں کے حق میں ناانصافی ہوئی۔ کیونکہ وہ بے فایدہ ایسی کشاکش میں چھوڑ دئے گئے کہ جہاں تک ان کو پہنچنا ہے وہاں تک کا رتبہ ہی نہیں۔

گورنمنٹ اپنے فرض سے ہرگز بری نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ تعلیم کا کوئی ایسا طریقہ نہ قایم کرے جس سے کہ ہندوستانی نوجوان بیس برس کی عمر میں اور بموجب قواعد حال کے انیس

برس کی عمر میں اس قدر قابلیت حاصل کرلیں کہ وہ انگلستان میں جا کر سول سروس کے مقابلہ کا امتحان اپنے ہم پیشہ رعایا انگریزوں کے ساتھ دیں مگر صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک حال کے طریقہ سے ہندوستان میں تعلیم جاری رہے گی ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ہندوستانی لڑکے نہ تو سست ہوتے ہیں اور نہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں قدرتی قابلیتیں نہ ہوں۔ فی الواقع یہ طریقہ تعلیم ہی کا قصور ہے۔ اگر وہ پوری قابلیت اور علم جو کہ ان میں ہونے چاہیے بیس برس کی عمر میں نہیں حاصل کر سکے۔ پس نہ صرف ہم کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کو ہائی انگلش ایجوکیشنل کی تعلیم دینا لازمی ہے۔ گورنمنٹ کا مشرقی علوم میں ہم کو تعلیم دینا ناممکن ہے۔ جس کی وجہ خود اس رزولیوشن میں جو منظوری کو پیش ہوا ہے بیان کی گئی ہے۔ ہاں ہم میں ایسے بھی لوگ ہیں جن کا مقصد بلا خیال اپنی دنیاوی ترقی کے یا دنیاوی حالت کے صرف علوم مشرقی کا جس میں علم و مذہب دونوں شامل ہیں حاصل کرنا ہے۔ مگر کیا گورنمنٹ اپنے کالجوں میں یا اپنی یونی ورسٹیوں میں اُن علوم کی اُن کو تعلیم دے سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ لارڈ میکالے (۸) کے زمانے سے پیشتر گورنمنٹ کے کالجوں میں علوم مشرقی کی تعلیم ہوتی تھی۔ پھر کیا گورنمنٹ بتا سکتی ہے کہ اُس کے کالجوں نے کوئی بھی ایسا شخص پیدا کیا تھا جو علوم مشرقی میں عالم کہلانے کا درجہ رکھتا تھا۔ ان ممالک میں گورنمنٹ کی حکومت کو اسّی برس سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا، وہ نشان دے سکتی ہے کہ اُن لوگوں میں سے جو علوم مشرقی کی تحصیل میں مصروف تھے، ایک نے بھی گورنمٹ کے کالجوں سے تعلق پیدا کیا تھا۔ اب بھی وہ لوگ جو اپنے قدیم طریقہ پر علوم مشرقی کی تحصیل میں مصروف ہوں معدوم نہیں ہو گئے ہیں، بلکہ ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی اب بھی جا بجا موجود ہے۔ گورنمنٹ کی طاقت سے یہ بات خارج ہے کہ اُن میں سے ایک کو بھی اپنے کالجوں یا اپنی یونیورسٹی میں گو کہ وہ مشرقی علوم کی ترقی پر کیسی ہی سرگرمی ظاہر کرے شامل کر سکے۔ پس نہ ہم کو اس بات کی حاجت ہے کہ گورنمنٹ علوم مشرقی کی تعلیم پر توجہ کرے اور نہ گورنمنٹ کو مناسب ہے کہ ایسے امر میں جس میں کہ درحقیقت وہ کچھ نہیں کر سکتی دست اندازی کرے۔

ہاں بلاشبہ مشرقی علوم ہمارے موروثی علوم ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے اُن علوم میں ایسا

نام پیدا کیا تھا کہ جب تک دنیا میں ہسٹری قائم ہے، اُس کے ساتھ ہمارے بزرگوں کا نام بھی قائم ہے۔ یہ فخر ہے کہ ہمارے بزرگوں کے علوم کی بدولت یورپ نے تعلیم پائی ہے۔ کسی کے مٹائے سے مٹ نہیں سکتا۔ پس خود ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس فخر کو بھی اپنی قوم میں زندہ رکھیں۔

بیشک ہم کو اس بات پر کوشش کرنی چاہئے کہ جو لوگ بلا خیال اپنی دنیاوی ترقی یا دنیاوی حالات کے صرف علوم مشرقی کی تحصیل میں اپنے قدیم طریقہ سے مصروف ہیں اُن میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو قدیم منطق اور فلسفہ میں عربی و فارسی کے علم ادب میں، علم شعر و انشاء میں اپنے بزرگوں کی یادگار یا اُن کے قائم مقام ہوں اور ہمارے باپ دادا کی ہسٹری ہم کو یاد دلاتے رہیں۔ مگر گورنمنٹ کو ان باتوں سے تعلق رکھنا نہیں چاہئے کیوں کہ وہ اس میں بجز اس کے کہ ایک بے فائدہ کام اختیار کرے اور لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ پس مناسب ہے کہ اس امر کو وہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے، خواہ ہم اُس میں کچھ کریں اور اپنے بزرگوں کی یادگار قائم رکھیں، خواہ کچھ نہ کریں اور اپنے بزرگوں کی یادگار کو مٹا دیں۔(۹)

اسی اجلاس میں مولوی محمد عزیز مرزا[۱۸۶۵-۱۹۱۲ء](۱۰) نے یہ قرارداد پیش کی کہ

''محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا صدر مقام علی گڑھ قرار دیا جائے اور اس کے مقاصد کی تائید و تکمیل کے لئے ہر ایک شہر اور قصبہ میں کمیٹیاں قائم ہوں۔''(۱۱)

علامہ شبلیؒ نے اس قرارداد کی تائید کی۔(۱۲)

اس اجلاس میں درج ذیل فیصلے ہوئے:

۱۔ ایک کل ہند تنظیم کا انعقاد: اس کا نام '' آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس'' رکھا گیا۔ اس تنظیم کے سالانہ اجلاس پورے ملک میں مختلف مقامات پر منعقد کئے جائیں۔

۲۔ حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ صرف مغربی علوم کی تعلیم دے اور مشرقی علوم کو مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

۳۔ مکاتب کی توسیع کی جائے اور حفظ قرآن کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

۴۔ کانگریس کا صدر مقام علی گڑھ ہوگا۔(۱۳)

انہی قراردادوں پر پہلا اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا۔

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولوی سمیع اللہ خاں [۱۸۳۴-۱۹۰۳ء] دہلی میں ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔مولوی محمد حسین اور مفتی صدرالدین آزردہ سے تعلیم حاصل کی۔بعدازاں وکالت اور منصفی کے امتحانات پاس کر کے منصف مقرر ہوئے۔مگر جلد ہی سرکاری ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔دہلی میں کچھ دنوں تک درس وتدریس کا مشغلہ بھی رہا۔اور دہلی میں ایک عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ پھر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔قانون میں اس قدر مہارت تھی کہ سید محمود جنہوں نے لندن سے بیرسٹری پاس کی تھی،ان سے مشورہ کرتے تھے۔دوبارہ باصرار صدرالصدور کے عہدہ پر فائز ہوئے۔مگر پھر اسے ترک کر کے خود کو قومی وملی کاموں کے لئے وقف کرلیا۔ سرسید سے ابتدا سے دوستانہ مراسم تھے۔ برسوں تک دل وجان سے ان کا ساتھ دیا،مگر ۱۸۹۹ء میں اختلاف کے سبب مدرسۃ العلوم کے کاموں سے علاحدہ ہوگئے اور الہ آباد جاکر مسلمان طلبہ کے لئے مسلم بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کرائی۔۱۹۰۳ء میں علی گڑھ میں وفات پائی۔علامہ شبلی کے علی گڑھ تقرر میں ان کی سفارش کا بھی دخل تھا۔

(۲) باقیات شبلی ص ۲۹-۳۰

(۳) ابوحامد محمد بن محمد غزالی [۱۰۵۸-۱۱۱۱ء] ایک عظیم فلسفی کی حیثیت سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔وہ نہ صرف فلسفہ میں بے نظیر تھے بلکہ حکمت کے ساتھ علوم اسلامی،فقہ،علم الکلام کے بھی نادرہ عصر عالم ومحقق تھے۔''احیاءعلوم الدین''،''تہافۃ الفلاسفۃ'' اور ''کیمیائے سعادت'' ان کی عالم گیر شہرت یافتہ تصنیفات ہیں۔ چونکہ انہوں نے اسماعیلیوں اور نوافلاطونیوں کے بڑے مدلل اور مسکت جوابات دئے اس لئے انہیں ''حجۃ الاسلام'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

وہ ایران کے شہر طوس میں پیدا ہوئے،لیکن ان کی عظمت وشہرت ایران سے نکل کر یورپ تک جا پہنچی اور یورپ ایک عرصہ تک ان کی کتابیں اور ان کے علوم پڑھتا پڑھاتا رہا۔علامہ شبلی نے اپنے ایک قصیدہ میں جو ۱۸۹۴ء میں پڑھا گیا تھا۔اس میں جہاں مسلمانوں کی علمی ترقی وبرتری اور فضیلت کا ذکر کیا ہے،وہاں اور بہت سے مشاہیر اسلام کے ساتھ امام غزالیؒ کے علوئے مرتبہ کو بھی بیان کیا ہے۔

روشنی علم کی پھیلائی تھی پہلے ہم نے
ورنہ چھایا تھا زمانے میں اندھیرا کیسا
اب بھی لندن میں غزالی کی ہے شہرت کیسی
اب بھی جرمن میں ہے بونصر کا چرچا کیسا
روم و اٹلی کے مدرسے میں کئی صدیوں تک
تھا سند فلسفہ بوعلی سینا کیسا

(کلیات شبلی اردو ص:۷۷)

امام غزالیؒ کے مفصل ذکر کے لئے علامہ شبلی کی معرکۃ الآرا کتاب ''الغزالی'' مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) امام فخرالدین رازی[۱۲۰۹-۱۲۴۹ء] ایران کے شہررے میں پیدا ہوئے۔ دینی علوم اور شعر و ادب کی تحصیل کے بعد خوارزم گئے۔ معتزلہ سے مناظروں کی وجہ سے ملک چھوڑنا پڑا۔ پھر ماوراءالنہر گئے وہاں بھی مخالفت ہوئی تو رے واپس آ گئے۔ غوری سلطان شہاب الدین غوری سے تعلقات قائم ہوئے تو اس نے اعزاز واکرام اور دولت سے نوازا۔ بعدازاں علاء الدین خوارزم شاہ نے بھی بڑا اعزاز کیا۔ چنانچہ عرصہ تک وہ خراسان میں مقیم رہے۔ پھر انہوں نے بخارا، ہرات، سمرقند اور ہندوستان کے سفر کئے اور آخر میں ہرات میں سکونت اختیار کی۔ یہاں وہ شیخ الاسلام کے لقب سے نوازے گئے۔

نہایت ذہین اور قوی الحافظہ تھے۔ مختلف علوم وفنون میں درک حاصل تھا۔ مفسر، ماہر فلسفہ وعلم الکلام تھے۔ اور ایک بڑے مصنف تھے۔ متعدد تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔ ان میں تفسیر مفاتیح الغیب، المباحث، محصل افکار المتقدمین والمتاخرین اور شرح اشارات بوعلی سینا بہت مشہور ہیں۔

(۵) خواجہ نصیرالدین طوسی۔ محقق طوسی کے نام سے مشہور ہے۔ بمقام طوس ۱۸ر فروری ۱۲۰۱ء میں پیدا ہوا۔ وہیں تحصیل علم کیا۔ ریاضی اور علم نجوم میں بڑی مہارت حاصل کی۔ اسماعیلی شیعہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محتشم ناصرالدین کے دربار سے وابستہ ہوا اور اسی کے نام پر ''اخلاق ناصری'' لکھی۔ ایک بڑا مصنف و محقق تھا اور متعدد کتابیں اس کے قلم سے نکلیں۔ تحریر اقلیدس، تحریر مجسطی، شرح اشارات بوعلی، اساس

الاقتباس،اوصاف الاشراف ،سی فصل، معیارالاشعارتذکرۃ الناصر کے نام ملتے ہیں۔طوسی برسوں ہلاکو خاں کے ساتھ رہااوراس کی مدد کی۔چنانچہ ہلاکو نے ان کی سر پرستی میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی۔۲۶رجون ۱۲۷۴ء میں بغداد میں وفات پائی۔

(۶) روداد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۲۷ردسمبر ۱۸۸۶ء، بحوالہ باقیات شبلی ص ۲۹ - ۳۴

(۷) پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ (Mr. T.W.Arnold : 1864 -1930) علامہ شبلی کے دوست بھی تھے اور استاذ بھی۔ان کا یہ مصرعہ ہے کہ

آرنلڈ آں کہ رفیق است وہم استاذ مرا

لندن میں پیدا ہوئے۔کیمبرج سے بی.اے.کیا۔جرمن،سنسکرت،عربی، فارسی اور اردو سے بخوبی واقف تھے۔۱۸۸۷ء میں محمڈن اینگلواورینٹل کالج علی گڑھ میں فلسفہ کے استاذ مقرر ہوئے۔انہوں نے ۱۹رکتابیں لکھیں۔The Preachings of Islam ان کی مشہور تصنیف ہے جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی اور جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔اس کی تصنیف میں علامہ شبلی نے ان کی بڑی مدد کی۔علی گڑھ کے بعد وہ اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہوئے۔اس کے بعد وہ انڈیا آفس لندن کے اسسٹنٹ لائبریرین ہو کر انگلینڈ واپس چلے گئے۔علامہ شبلی ان کے بڑے مداحوں میں تھے۔ان کے روم ومصر وشام کے سفر میں مسٹر آرنلڈ پورٹ سعید تک ساتھ رہے۔وہ جب ہندوستان سے واپس جارہے تھے،تو علامہ شبلی نے انہیں وداع کرنے کے لئے حیدرآباد سے بمبئی کا سفر کیا۔[دیکھیں یادرفتگاں ازمولانا سید سلیمان ندوی۔مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء ص ۱۰۳]

(۸) لارڈ میکالے (Lord Macaulay.1800-1859) ہندوستان میں گورنر جنرل کونسل کا قانونی مشیر تھا۔سیاست داں کے علاوہ انگریزی زبان کا شاعر اور مورخ تھا۔روس کی سائنس اکادمی کا رکن تھا۔اس نے ہندوستان کے لئے ایک تعلیمی نظام بنایا تھا جو عرصہ تک رائج رہا۔نئے نظام تعلیم کی ضرورت کے اسباب اس نے برطانوی پارلیامنٹ کے سامنے بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''میں نے ہندوستان کے طول وعرض میں سفر کیا ہے۔مجھے کوئی بھی شخص بھکاری یا چور نظر نہیں آیا۔اس ملک میں میں نے بہت دولت دیکھی ہے۔لوگوں کے

اخلاقی اقدار بلند ہیں۔اور سوجھ بوجھ اتنی اچھی ہے کہ میرے خیال میں ہم اس وقت تک اس ملک کو فتح نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم ان کی دینی اور ثقافتی اقدار کو توڑ نہ دیں، جوان کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔اس لئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ ہم ان کا قدیم نظام تعلیم اور تہذیب تبدیل کریں۔کیوں کہ ہندوستانی لوگ یہ سمجھیں گے کہ ہر انگریزی اور غیر ملکی شے ان کی اپنی اشیاء سے بہتر ہے تو وہ اپنا قومی وقار اور تہذیب کو کھودیں گے۔اور حقیقتاً ویسی ہی مغلوب قوم بن جائیں گے جیسا کہ ہم انہیں بنانا چاہتے ہیں۔''

آپ اندازہ کر سکتے ہیں لارڈ میکالے کون تھا اور اس نے ہندوستان میں کیا کیا، کیا ہوگا۔؟

(۹) مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سر سید احمد خاں ص ۳۲۸-۳۳۰

(۱۰) مولوی عزیز مرزا: علامہ شبلی نعمانی جس زمانہ میں علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے، مولوی محمد عزیز مرزا [۱۸۶۵-۱۹۱۲ء] وہاں کے طالب علم۔انہوں نے ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ کالج سے بی.اے. کرنے کے بعد ریاست حیدر آباد میں ملازمت کی۔ترقی کر کے پہلے معتمد داخلہ [ہوم سکریٹری] پھر حیدر آباد ہائی کورٹ کے جج نامزد ہوئے۔بعد ازاں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور سنڈیکیٹ کے ممبر نامزد ہوئے۔سیاست میں بھی حصہ لیا۔جنوری ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔مولوی عزیز مرزا اچھے اہل قلم بھی تھے۔۲۶ رفروری ۱۹۱۲ء کو علی گڑھ میں انتقال کیا۔علامہ شبلی سے ان کے دور طالب علمی سے تعلقات تھے۔ علامہ شبلی جس زمانہ میں سر رشتہ علوم وفنون حیدر آباد کے ناظم مقرر ہوئے یہ وہاں ملازم تھے۔اس لئے حیدر آباد میں کئی برس ساتھ رہا۔مکاتیب شبلی میں متعدد مقامات پر ان کا ذکر ہے۔

(۱۱) روداد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۲۷ ردسمبر ۱۸۸۶ء، بحوالہ باقیات شبلی ص ۶

(۱۲) ایضاً

(۱۳) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال ص ۲۷

ooo

دوسرا اجلاس۔لکھنو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرسالانہ اجلاس ۱۸۸۷ء میں لکھنو میں سرسید احمد خاں کی سربراہی میں منعقد ہوا۔اس کی صدارت منشی امتیاز علی کاکوروی [۱۸۳۵-۱۸۹۴ء] (۱) رئیس کاکوری نے کی۔علامہ شبلی اس اجلاس میں بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوئے۔اسی اجلاس میں انہوں نے سرسید احمد خاں کی فرمائش پر طرز جدید کا اپنا پہلا مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' پیش کیا۔یہ مقالہ ۲۷ردسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ لکھنو کی مشہور شاہی بارہ دری میں پیش کیا گیا۔ اور بے حد پسند کیا گیا۔جس سے خود علامہ شبلی بھی بہت خوش ہوئے۔اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق (۲) وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کے نام ایک خط میں لکھا کہ

> ''کانگریس بے مثل اور توقع سے زیادہ کامیاب ہوئی۔افسوس کہ تم نہیں تھے۔ میں نے تم کو نہیں لکھا، مگر اکبر حسین (۳) سے تاکید کی تھی کہ تمام حالات سے تم کو اطلاع دیں۔میرا مضمون (مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم) علاحدہ چھپ رہا ہے۔ چھ جز کی ضخامت ہوگی۔قصیدہ (عیدیہ) اس مضمون اور روئداد دونوں کے ساتھ چھپے گا۔'' (۴)

ان کے دوست اور صاحب البرامکہ مولوی عبدالرزاق کانپوری [۱۸۶۲-۱۹۴۸ء] (۵) کی ان سے پہلی ملاقات اسی کانفرنس میں ہوئی تھی اور وہ ان سے بہت متاثر ہوئے تھے۔انہوں نے علامہ شبلی کا بڑا مفصل تذکرہ اپنی کتاب ''یادایام'' میں لکھا ہے۔خاص طور پر ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس اور علامہ شبلی نعمانی کے مقالہ پیش کرنے کا ذکر بڑے ادبی اور انشاپردازانہ انداز میں

کیا ہے۔طویل ہونے کے باوجود وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''صبح سات بجے کا وقت ہے اور دسمبر ۱۸۸۷ء کی ۲۷ تاریخ کہ شاہی بارہ دری قیصر باغ لکھنو میں محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس ہورہاہے اوراس تقریب سے باغ کے احاطے میں سیکڑوں گاڑیاں، جوڑیاں اور پالکیاں چلی آرہی ہیں۔جن سے قدیم وضع کے تعلق دار، دیگرامراء،علماء،اطباءاتر رہے ہیں اور یہ جملہ حضرات اخیر مشرقی تمدن کی یادگار ہیں۔عموماً مخمل یا جامہ دار کی زریں یا سادہ اچکنیں پہنے ہیں۔ سر پر گول چوگوشیہ یا دوپلی ٹوپیاں ہیں۔ کاندھوں پر شال،رومال پڑے ہوئے ہیں اور زرد مخمل کے جوتے پاؤں میں۔ بعض علماءاور کہن سال بزرگ اونچی ایڑی کے کفش بھی پہنے ہیں۔ یہ وہ منظر تھا کہ پھر دیکھنے میں نہ آیا۔

صوبہ اودھ کے علاوہ اطراف ہند کے بھی بکثرت مہمان موجود ہیں۔ خصوصاً پنجاب کے نوجوان اور بوڑھے اپنے قومی لباس میں سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ان کی زریں کلاہ اور عماموں پر لالہ زار کشمیر کا دھوکہ ہوتا تھا۔تمام ہال میں کرسیوں کی نشست ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب ایک فرحت افزا باغ میں جمع ہیں۔جس کے ہر خیاباں میں جداگانہ تختے اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔

آٹھ بجے تک بارہ دری مہمانوں سے بھر گئی تھی۔یکا یک یہ صدا بلند ہوئی کہ سرسید احمد خان بہادر مع اپنے خاص احباب اور کالج اسٹاف کے تشریف لا رہے ہیں۔اس وقت بارہ دری کے کل دروازے کھلے ہوئے تھے۔مہمانوں نے صدر دروازے کی طرف دیکھنا شروع کیا اور یہ جلوہ نظر آیا کہ واقعی سرسید مسٹر بیک پرنسپل کالج (۶) اور مولانا شبلی نعمانی وغیرہ بارہ دری کے چبوترے پر آ گئے ہیں۔ سب سے پہلے اس موقع پر سرسید پر نظر پڑتی ہے۔ چہرے پر سفید جھک ڈاڑھی سے غیر معمولی عظمت ٹپکتی ہے۔متوسط قد، دہرا بدن ہے،اور لانبا ٹرکش کوٹ پہنے

ہیں۔سر پر چوڑی چکلی ہلکے رنگ کی ترکی ٹوپی ہے اور ڈیڑھ گز کا سفید نین کلاتھ کا رومال گلے میں بندھا ہے۔ ہاتھ میں ایک کبڑی (عصائے پیری) ہے، جس کو ٹیکتے ہوئے چلے آرہے ہیں، چنانچہ راجہ تصدق رسول خان بہادر تعلقہ دار جہانگیرآباد (۷) وغیرہ اور منشی امتیاز علی وکیل چیف کورٹ لکھنو (جو بعد میں وزیر بھوپال ہوئے) اور چودھری نصرت علی سکریٹری انجمن تعلقہ داران اودھ (۸) نے سید صاحب کا استقبال کیا اور جب یہ معزز مہمان صدر چبوترہ (ہال) پر پہنچ گئے تو حاضرین جلسہ تعظیماً کھڑے ہوگئے۔اور چیرز کے نعروں سے بارہ دری گونج اٹھی۔ چیرز دینے والے عموماً نوجوانان پنجاب تھے۔کچھ وقفے کے بعد کارروائی جلسہ شروع ہوئی۔

لکچر ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم''......... آج کے پروگرام میں سب سے زیادہ مہتم بالشان مولانا شبلی کا لکچر تھا۔ جو سرسید کی ہدایات کے مطابق کامل ایک سال میں تیار ہوا تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے بحثیت سکریٹری کانفرنس مولوی صاحب سے ارشاد فرمایا کہ مولانا آپ اپنا لکچر شروع کریں۔ چنانچہ مولانا اپنی جگہ سے اٹھ کر صدر چبورتے پر تشریف لائے اور زرد رنگ کا حجازی رومال سر سے ہٹایا۔اس وقت معلوم ہوا کہ آپ کی عمر تقریباً ۳۵ سال ہوگی اور چہرے پر گول سیاہ ڈاڑھی تھی۔آنکھوں میں خاص قسم کی چمک اور بشرہ سے فراست ٹپکتی تھی اور کبھی کبھی بائیں ابرو بھی پھڑکتی تھی۔ جدید فیشن کی گرم اچکن تھی اور سر پر پارسی نما سیاہ اونچی ٹوپی جو تقریباً نصف رومال سے چھپی ہوئی تھی۔

اب مولانا منظر عام پر تھے اور سب کی نظریں ان پر پڑ رہی تھیں۔ چنانچہ مختصر زبانی تمہید کے بعد مولانا نے لکچر شروع کیا۔ جس کا عنوان تھا ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' ابتدا میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کس طرح حاصل کئے اور کس طرح ان علوم کو دنیا میں پھیلایا، لیکن بہت جلد معلوم ہوگیا کہ

خطیب کا مقصد علوم کی ذاتی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ عہد قدیم میں مسلمانوں کا طرز تعلیم کیا تھا۔ فی الحقیقت موضوع کے لحاظ سے اردو میں یہ پہلا خطبہ تھا۔''(۹)

اس مقالہ میں علامہ شبلی نعمانی نے ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' اوران کے علمی وتعلیمی کارناموں کا ایک تاریخی مرقع پیش کیا ہے۔ یہ ایک بڑا ہی وسیع موضوع ہے۔اس کے ضمن میں مسلمانوں کی ہرطرح کی علمی وتعلیمی کوششیں اور کاوشیں قلم بند کی جاسکتی ہیں۔ چونکہ علامہ شبلی نعمانی نے اس موضوع کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا،اس لئے ان کوموضوع کی وسعت کا اندازہ تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ ایک ایسا وسیع موضوع ہے کہ اگراس کے ذیل میں مسلمانوں کے تمام علمی کارنامے بیان کئے جائیں تو شاید ناموزوں نہ ہوگا۔''(۱۰)

باوجود اس کے علامہ شبلی نعمانی نے موضوع سے متعلق اہم اورضروری معلومات کو تاریخ کی مستند کتابوں سے یکجا پیش کردیا ہے۔ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے لکھا ہے کہ

''مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی اورسارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی۔''(۱۱)

مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک شاگرد اوردارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے سابق ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن [۱۹۱۱-۱۹۸۷ء] (۱۲) نے اپنی کتاب ''مولانا شبلی نعمانی پرایک نظر'' میں لکھا ہے کہ

''جب یہ مضمون پڑھا جارہا تھا تو انگریزی تعلیم یافتہ سامعین میں کچھ لوگ اٹھ۔ اٹھ کر پوچھتے تھے کہ''مولانا کیا ہمارا علمی ماضی ایسا ہی شاندار تھا جیسا کہ آپ بیان کررہے ہیں۔''(۱۳)

بہرحال اس رسالہ کی تعلیمی اورتاریخی حیثیت مسلم ہے۔قدردانوں نے اسے وقعت کی

نگاہ سے دیکھا۔اور جس شخصیت کی تحریک پر یہ لازوال تحریر وجود میں آئی یعنی سرسید احمد خاں نے بے ساختہ ایک خط میں یہ لکھ کر داد دی کہ

''مولانا شبلی نے تاریخانہ مضمون گذشتہ تعلیم مسلمانان پر اختیار کیا۔وہ رسالہ مرسل ہے۔میں سمجھتا ہوں نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہوگئی ہے۔''(۱۴)

یہ مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم''۱۸۸۸ء میں پہلی بار کتابچہ کی صورت میں قومی پریس لکھنو سے شائع ہوا۔اس رسالہ کی اشاعت کے بعد ملک میں علامہ شبلی نعمانی کی ایک مورخ و محقق اور مصنف کی حیثیت سے شہرت کی ہر طرف دھوم مچ گئی اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی نعمانی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا۔''(۱۵)ان کے دوست مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ

''جب اس رسالہ پر ماہنامہ دلگداز میں ریویو ہوا تو کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہوگیا ہو۔''(۱۶)

اس مقالہ کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ برسوں بعد [۱۹۰۴-۱۹۰۵ء] میں عیسائی مورخ جرجی زیدان [۱۸۶۱-۱۹۱۴ء] مدیر الہلال مصر(۱۷) نے جب تاریخ التمدن الاسلامی کی تصنیف کا آغاز کیا تو اسی رسالہ کی مدد سے وہ ان مصادر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا جس کی تمدن اسلام کی تصنیف و تدوین میں اسے ضرورت تھی اور جو اسے کسی اور ذرائع سے نہیں مل رہے تھے۔اس نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔(۱۸)اس کے باوجود اس نے تعصب اور جانب داری سے کام لیا اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر طرح طرح کے رکیک الزامات عائد کئے۔الانتقاد کے نام سے علامہ شبلی نے جو کتاب لکھی ہے اور جو ہندوستان اور مصر سے ۱۹۱۲ء میں ایک ساتھ شائع ہوئی وہ جرجی زیدان ہی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کی تصنیف پر ۱۳۴/برس کا عرصہ گذر جانے اور اس موضوع پر متعدد کتابیں شائع ہوجانے کے باوجود اس کی افادیت ابتک کم نہیں ہوئی۔اسی اہمیت اور آل انڈیا

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا حصہ ہونے کے سبب طوالت کے باوجود اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' میرے مضمون کا عنوان ہے، یہ ایک ایسا وسیع مضمون ہے کہ اگر اس کے ذیل میں مسلمانوں کے تمام علمی کارنامے بیان کئے جائیں تو شاید ناموزوں نہ ہولیکن میں نے اپنے مضمون کے لیے ان میں سے صرف دو بحثیں انتخاب کی ہیں، (۱) مسلمانوں نے علوم وفنون کس طرح حاصل کئے (۲) دنیا کی تمام قوموں کو ان علوم کی کیونکر تعلیم دی، غالباً تعلیم کے خاص لفظ سے جو اس مضمون کا اصلی عنوان ہے، یہی دو بحثیں قوی تعلق رکھتی ہیں۔

مسلمانوں نے جن علوم کی اشاعت کی ان میں سے کچھ ان کے ذاتی علوم ہیں، جو خود انھوں نے ایجاد کئے یا خاص طرح پر ان کو ترتیب دیا، کچھ ایسے ہیں جو دوسری قوموں سے حاصل کئے اور پھر ایسی ترقی دی کہ گویا انھی کے ایجادات سے ہیں، میرا مضمون گو ان دونوں قسم کے علوم سے تعلق رکھتا ہے لیکن علوم کی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کے طرز تعلیم کے اعتبار سے۔

میں افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ان دو بحثوں کی تفصیل کے لیے جس قسم کے ضروری حالات درکار ہیں یعنی فلسفۂ یونانی وغیرہ کے ترجمے، مترجموں اور تصنیفات کے نام، اسلامی دارالعلوم اور مدرسوں کی تفصیل، طریقۂ درس، نصابِ تعلیم، غرض اس قسم کے حالات مجھ کو کسی مستقل تصنیف میں نہیں ملے اور شاید لکھے بھی نہیں گئے، کشف الظنون (۱) جیسی بڑی فہرست میں صرف ایک کتاب کا نام ملتا ہے لیکن غالباً خود کشف الظنون کے مصنف کو بھی اس کا دیکھنا نصیب نہیں ہوا، چند اجمالی حالات جو گبن کی رومن امپائر و ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ

(۱) یہ ایک نہایت ضخیم کتاب کئی جلدوں میں ہے، جس میں قریباً پچاس ہزار اسلامی تصنیفوں کے نام اور ان کے حالات ہیں، چھ ضخیم جلدوں میں بمقام لندن ۱۸۴۸ء میں چھاپی گئی ہے۔

ہنری لوئیس واقوام المسالک وچمبرس انسائیکلو پیڈیا اور برٹانیکا انسائیکلو پیڈیا وغیرہ میں ملتے ہیں، وہ اس غرض کے لیے بے شبہ مفید ہیں کہ جب مسلمانوں کی پچھلی ترقی کے عام ذکر میں کسی پرجوش خطیب کی زبان سے ادا ہوں، تو متاثر دلوں کو ہلا دیں لیکن ان سے ایک مفصل تاریخی آرٹیکل کیونکر مرتب ہوسکتا ہے، میں نے مختلف تاریخوں اور دوسری قسم کی تصنیفوں کے جستہ جستہ مقامات سے کچھ حالات بہم پہنچائے ہیں، اور غالباً یہ پہلی تحریر ہے جس میں اس قدر واقعات جمع کئے گئے ہیں اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے میں ایک اجمالی طریقہ پر مسلمانوں کے خاص علوم ان کی ابتدائی تاریخ اور سبب ایجاد کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

اسلام سے پہلے گوعرب کی قومیں رسمی علوم وفنون سے بالکل بے بہرہ تھیں، تاہم ان خانہ بدوش صحرائیوں میں علمی مذاق کی جان پائی جاتی تھی، نظم ونثر ان کا مایہ خمیر تھا لیکن وہ طوطی وبلبل کی طرح محض نیچرل فصیح اللسان نہ تھے، بلکہ فصاحت و بلاغت کے دقیق نکتوں تک ان کی نگاہ پہنچتی تھی، بازار عکاظ کے پرجوش مشاعرے اوران کے باہمی مباحثے اورنکتہ چینیاں بتاتی ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے تھے، جانتے تھے کہ کیا کہتے ہیں اور کیا کہنا چاہیے، امرءالقیس اور علقمۃ الفحل کی شاعرانہ نزاع کا ایک عام عورت نے جس خوبی سے فیصلہ کیا، آج فن انشاء کے بڑے ماہر بھی اس سے عمدہ ریمارک نہیں کرسکتے، اس کے سوانسب کے فخر اور رشتہ وقرابت کی پابندیوں کی وجہ سے اہل عرب اگلے کارناموں کوایک تاریخی ترتیب کے ساتھ محفوظ رکھتے تھے۔

اسلام نے آکر مذہب ومعاشرت کے ساتھ ان کی علمی زندگی بھی بالکل بدل دی، قرآن مجید کی پرتاثیر آیتوں نے شعراء اور خطیبوں کی زبانیں بند کردیں اور چونکہ دوستانہ یا مخالفانہ سرگرمی نے تمام عرب کی دماغی قوتوں کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیا تھا، پچھلے قصے تھوڑے دنوں کے لیے بھلا دیئے گئے اور علم الانساب اور ایام العرب کا زور بھی گھٹ گیا لیکن اسلام نے جس قدر چھینا، اس سے بہت زیادہ عطا کیا، قرآن کی برابری کرنے کے حوصلے بہت جلد پست ہوگئے، اب شعراء اور خطیبوں کے لیے قرآن خود رہنما بنا اور فصاحت و بلاغت کے متعلق بہت سے نئے اصول سکھا دیئے، زبان نہایت شستہ اور صاف ہوگئی اور اونٹ بکری کے قصوں کے علاوہ شعراء کو اخلاق اور تربیت کے بہت

سے مضامین ہاتھ آ گئے، یہی وجہ ہے کہ حسان، حطیہ، ذوالرمہ، جریر، فرزدق، احوص کے کلام میں جو ملاحت اور برجستگی ہے شعرائے جاہلیت کے رجز وقصائد میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔(۱)

تمام مذہبی علوم گویا اسلام کے ساتھ پیدا ہوئے زمانۂ مابعد میں گو وہ کسی حد تک پہنچ گئے ہوں لیکن کچھ شبہہ نہیں کہ ان کے ابتدائی اصول تمام تر قرآن پاک سے ماخوذ ہیں، اس کے اوامر و نواہی نے فقہ کی طرف رہبری کی، آیت توریت نے فرائض کا ایک مستقل فن قائم کیا، انبیائے سابقین کے حالات سے قصص کی ترتیب ہوئی، اعتقادات اور معاد کے متعلق آیتوں سے علم کلام استنباط کیا گیا اور گو ایک مدت تک کسی قسم کی تدوین وترتیب نہیں ہوئی لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ان علوم کی ابتدائی بنیاد قائم ہوگئی اور دوسری صدی کے آغاز تک ہزاروں مسائل کا رواج ہو چکا تھا۔

قرآن مجید میں فرائض اور اعمال کا بیان اجمالی طریقے پر تھا، طریق عمل کی خصوصیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل پر منحصر تھیں، اس ضرورت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کے متعلق روایتوں کے جمع کرنے کی طرف خیال مائل ہوا اور رفتہ رفتہ علم الحدیث واسماء الرجال وعلم الدرایہ پیدا ہو گئے، ان تحقیقات میں گو کسی قدر نکتہ چینی کی جائے مگر عموماً ہر منصف یہ فیصلہ کرے گا کہ جس بے انتہا کوشش اور تفتیش سے مسلمانوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال محفوظ رکھے، دنیا کی کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اور یہ کہ انسانی سعی اور جستجو کی یہ آخری سرحد ہے، جہاں تک مسلمان پہنچ گئے تھے۔

علم نحو اگرچہ کوئی مذہبی فن نہ تھا لیکن مذہبی ہی ضرورت سے اس کی تدوین کی طرف خیال مائل ہوا، اسلام دور دراز ملکوں میں پھیلتا جاتا تھا اور سینکڑوں نئی قومیں اس میں شامل ہوتی جاتی تھیں، دوسری زبانوں کے الفاظ عربی زبان میں بہت جلد جگہ پا گئے تھے جس سے احتمال تھا کہ مشتقات اور اصول اعراب میں بھی فرق آ جائے، اس قسم کے تصرفات سے جو صدمہ زبان پر پڑتا اس کا بہت بڑا اثر قرآن اور حدیث پر ہوتا، چند واقعات نے اس احتمال کو قوی کر دیا اور بالآخر ابوالاسود دوئلی

---

(۱) دیکھو تاریخ ابن خلدون کا زمانہ فصل ۴۹، از فصل ۶۔۱۲۔

المتوفی ٦٩ھ جس نے خود اس قسم کے تجربے حاصل کئے تھے، مسائل نحو کی تدوین کی طرف مائل ہوا، اس نے چند قاعدے منضبط کئے جو رفتہ رفتہ وسعت حاصل کرتے گئے، ہارون رشید کے زمانہ میں خلیل بن احمد بصری المتوفی ۱۷۰ھ وسیبویہ وکسائی وغیرہ کی توجہ سے وہ ایک مستقل فن بن گیا، جس کو متاخرین نے بھی بہت کچھ ترقی دی۔

غرض مذہب کے متعلق جس قدر ضروری اور مہتم بالشان علوم تھے گویا مذہب کے ساتھ پیدا ہوئے اور مسجدوں کے صحن یا عام مجلسوں میں ان کے مسائل رواج پانے لگے، خود صحابہؓ کے عہد میں ایسے متعدد اشخاص (۱) موجود تھے جو کثرت معلومات کے ساتھ طرز استدلال، طریق استنباط، تخریج احکام میں اجتہاد کا حق رکھتے تھے، اور زمانہ مابعد میں جب صحابہ کے حالاتِ زندگی قلم بند ہوئے تو وہ مجتہدین کے لقب سے پکارے گئے، کچھ لوگ ایسے تھے جو حدیثوں کے یاد رکھنے میں مشہور تھے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے ۵۳۶۴، ابن عمرؓ سے ۲۶۳۰، انسؓ سے ۲۲۸۶، ابن عباسؓ سے ۱۶۶۰، جابرؓ سے ۱۵۴۰ حدیثیں مروی ہیں۔ (۱) چودہ صحابی مفسر تھے، جو قرآن پاک کی فقہی اور تاریخی آیتوں کے متعلق نہایت کافی معلومات رکھتے تھے، باوجودیکہ ایک مدت تک قدیم یونانیوں کی طرح تعلیم وتعلم جو کچھ تھا، زبانی تھا، تاہم سیکڑوں ہزاروں اشخاص ان مسائل کے سیکھنے سکھانے میں مصروف تھے اور تمام ممالکِ اسلامیہ میں حدیثیں اور فقہ کے مسائل اسی تیزی سے رواج پا رہے تھے جس طرح خود اسلام عالمگیر ہو رہا تھا، عرب کی بلند حوصلگی اور عظمت کے لئے حجاز ویمن کی وسعت کافی نہ تھی، اس لئے ہزاروں صحابہؓ سرزمین عرب سے نکل کر تمام نئے فتح کئے ہوئے ملکوں میں پھیل گئے اور بعضوں نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی، اس طرح شام میں دس ہزار، کوفہ میں ایک ہزار، حمص میں پانچ سو، مصر میں کم وبیش تین سو صحابہ موجود تھے، (۲)

(۱) ابن حزم نے ان کی تعداد بیس تک خیال کی ہے، دیکھو فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۳۸ (۲) دیکھو فتح المغیث ص ۳۸۱، (۳) فتح المغیث ص ۳۸۲، مصر کے صحابہ کے نام ونسب اور اُن کی تعداد سیوطی نے ایک مستقل رسالے میں لکھی ہے جس کا نام درّ الصحابہ ہے، دیکھو حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر وقاہرۃ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ ص ۱۹۹۔

یہ لوگ جہاں گئے، حدیثوں اور عام مذہبی مسائل کا ذخیرہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے، جو ان کی عظمت وقبول کا بہت بڑا قوی سبب ہوتا تھا، چنانچہ صرف ان صحابہ کی تعداد جن سے لوگوں نے حدیثیں سیکھیں یا روایت کی، کم از کم ڈیڑھ ہزار بیان کی گئی ہے۔

ایک مدت تک کچھ اس تقلیدی خیال سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے قلمبند کرنے کی طرف خود توجہ نہیں فرمائی اور کچھ اس وجہ سے کہ اہل عرب کو اپنے حافظہ کے بھروسے پر تدوین اور تصنیف کی چنداں پروا بھی نہ تھی، کاغذ اور قلم سے کام نہیں لیا گیا، مگر جس قدر زمانہ کو امتداد ہوتا جاتا تھا، ان روایتوں کے دفتر تیار ہوتے جاتے تھے جن کو زبانی محفوظ رکھنا، انسانی قوت کا کام نہ تھا، غرض ۱۴۳ھ میں تالیف وتدوین شروع ہوگئی۔ ابن جریج نے مکہ میں، امام مالک نے مدینہ میں، اوزاعی نے شام میں، ابن ابی عروبۃ اور حماد نے بصرہ میں، معمر نے یمن میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں حدیث اور تفسیر کی کتابیں لکھیں، امام ابوحنیفہ نے دلائل کے ساتھ فقہ کو ترتیب دیا، ابن اسحٰق نے مغازی وسیر کی تدوین کی (۱)، یہاں تک کہ جب فضل بن یحییٰ برمکی، کے اہتمام اور توجہ سے کاغذ بنانے کا کارخانہ جاری ہوگیا، (۲) تو یہ علوم وفنون گھر گھر پھیل گئے، جس کثرت کے ساتھ مذہبی تصنیفیں ہوئیں اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف تفسیر کے متعلق سو [۱۰۰] سے زیادہ ایسے مضامین پیدا ہوگئے جن کو الگ الگ علم کا لقب دیا گیا اور ہر ایک پر متعدد اور بعض سیکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ (۳)

اس زمانہ میں اور دو علم مذہبی ضرورت سے ایجاد ہوئے، علم البیان وکلام، اسلام کا جو بڑا معجزہ اور جو ہمیشہ استعمال کیا جاسکتا ہے قرآن تھا، اس کے معجزہ ہونے کا دعویٰ جب اہل عرب کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، تو کسی دلیل لانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، کفارِ عرب گو انکار کرنا چاہتے تھے مگر ان کا مذاقِ زباندانی اس دعویٰ کے تسلیم کرنے پر ان کو مجبور کرتا تھا، وہ منھ سے انکار کرتے تھے مگر قرآن پڑھے جانے کے وقت ان کی بے اختیاری حالت، بے قصد تحسین، بے تابانہ

(۱) تاریخ الخلفاء سیوطی، خلافت منصور واقعات ۱۴۳ھ (۲) مقدمۂ ابن خلدون فصل ۳۱، از فصل ۴ (۳) اتقان فی علوم القرآن میں مختصراً ان علوم اور ان کے متعلق تصنیفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

تاثر ان کے اظہار کے خلاف شہادت دیتے تھے لیکن اس طرح پر یہ دعویٰ صرف عرب کے سامنے چل سکتا تھا، اہل عجم اولاً تو زبان عربی سے ناواقف اور واقف بھی ہوں تو عرب کا سا قدرتی ذوق کہاں سے لائیں، اس لیے ضرورت پڑی کہ فصاحت اور بلاغت کے اصول مرتب کئے جائیں تا کہ دوسری قومیں اگر مذاق سے نہیں تو علمی طور پر اس دعویٰ کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوں اول اول جعفر برمکی وزیر ہارون الرشید اور جاحظ نے کچھ قاعدے(۱) لکھے، پھر متاخرین نے کلام کے ہر ایک حصہ کے متعلق مسائل استنباط کئے اور علامہ سکاکی کی مفتاح پر اس فن کا خاتمہ ہو گیا، علم البیان یونانیوں کے ہاں بھی تھا لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ان کے خیالات سے مسلمانوں کو بہت کم آگہی ہوئی بلکہ بالکل نہیں ہوئی، تاہم ہم یقین کرتے ہیں کہ اگر یونانی زندہ ہوتے تو ہمارے علماء کی دقت نظر اور قوتِ استنباط کی داد دیتے، علم کلام (۲) اس وقت پیدا ہوا، جب یونانی علوم کے شائع ہونے سے مذہب اسلام فلسفہ سے ٹکرا گیا اور عام ظاہر بیں آنکھیں مذہبی اعتقادات کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، لیکن محققین اسلام کو پورا بھروسہ تھا کہ سچ کو کوئی چیز صدمہ نہیں پہنچا سکتی، انھوں نے غلط خیالات اور انسانی رایوں کو جو مذہب میں داخل ہو گئی تھیں، چھانٹ کر الگ کر دیا اور پرزور منطقی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ فلسفہ یونانی جس قدر کہ اسلام کے اصلی مسائل سے مختلف ہے خود غلط اور باطل ہے، امام غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ اس فن میں پہلی تصنیف ہے جس کا تتبع امام رازی وغیرہ نے کیا اور اس ترقی کو پہنچایا کہ تہافتہ تقویم پارینہ کے برابر ہو گئی۔

اسلام اگر چہ فلسفہ سکھانے نہیں آیا تھا، تاہم ذات باری کے متعلق اس نے جو کچھ بتایا وہ فلسفہ کے بڑے حصہ یعنی آلٰہیات کی جان ہے، گبن صاحب لکھتے ہیں:

> ''محمدؐ کا مذہب شبہ اور ابہام سے آزاد ہے اور قرآن و وحدانیت کا عمدہ ثبوت ہے، خدائے تعالیٰ کے باب میں آپ کا عقلی جوش مذہبی یہ تسلیم کرتا ہے کہ قابل عبادت ایک ذات غیر محدود اور قدیم بدون کسی صورت اور مکان اور بدون اولاد و مشابہت کے ہے جو ہمارے نہایت پوشیدہ خیالات میں حاضر ہے اور خاص

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ذکر علم بیان۔ (۲) یہ اس علم کلام کے علاوہ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔

اپنی قوت کی ضرورت سے موجود ہے، مسلمانوں کے ہر دلعزیز مذہب میں حکیم موحد
شریک ہوسکتا ہے اور یہ دین زمانہ حال کے ادراکات سے شاید بہت عالی ہے، کیونکہ
جب ہم ماہیت غیر محسوس سے تمام خیالات زمان اور مکان وحرکت و مادہ وحس وتامل
کو علاحدہ کردیں تو کون چیز تصور اور فہم کے لیے باقی رہے گی۔''

مسلمانوں کے مذہبی علوم کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے، ان کے سوا مسلمانوں نے جن علوم و فنون پر کتابیں لکھیں، ان کی تعداد تقریباً دوسو ہے، کشف الظنون اور مدینۃ العلوم میں ان کا بیان مع تصنیفات کی تفصیل کے مل سکتا ہے، مگر مجھ کو یہ بھولنا نہ چاہیے کہ میرے مضمون کا عنوان ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' ہے نہ ''گذشتہ علوم''، مذہبی علوم جس طرز سے تعلیم دیے جاتے تھے، ان کا تفصیلی بیان آگے آئے گا، مسلمانوں نے جو کچھ دوسری قوموں سے سیکھا، وہ منطق، الٰہی (۱) ہندسہ، طبیعی و ہیئت تھے، حساب وطب میں بھی انھوں نے زیادہ تر دوسری قوموں کی شاگردی کی، اس بات کی بہت کم مثالیں ہیں کہ مسلمان عالموں نے خود یونانی وسریانی زبانوں کی تحصیل کی ہو اور اصل کتابوں سے یہ علوم سیکھے ہوں، بے شبہ خلفاء کے درباروں میں مترجموں کا ایک گروہ موجود تھا، مگر ہنری لوئیس صاحب کے چبھتے ہوئے اعتراض کا کچھ جواب نہیں ہے کہ ''ان میں اکثر عیسائی تھے'' حنین، حبیش، متی، یوحنّا، اسحٰق، یعقوب، کندی وغیرہ جو بہت بڑے مترجم مشہور ہیں، سب عیسائی تھے، حکمائے اسلام میں صرف فارابی ایک ایسا شخص ہے جو ان زبانوں کا پورا ماہر تھا اور اس نے خود ایک عیسائی عالم یوحنّا بن خیلان سے یہ علوم اور زبانیں سیکھیں تھیں، ارسطو کی کتابوں کی شرح اور توضیح میں بوعلی سینا اور ابن رشد بہت زیادہ نامور ہیں اور یورپ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے تاہم مجھ کو شبہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کو بھی یونانی یا سریانی زبان آتی ہو۔

---

(۱) خاص فلسفیوں کی الٰہی مراد ہے، ورنہ مسلمانوں نے الٰہی کے عمدہ مسائل خود قرآن مجید سے حاصل کئے تھے۔

ترجمے، مختلف عہدوں کی کوششیں، ترجموں کی صحت و غلطی، عام رائے

عام مؤرخین کا بیان ہے کہ اول جس نے ترجموں کی بنیاد ڈالی وہ دولت عباسیہ کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور تھا، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ منصور کے حق میں مورخین کی یہ ایک بیجا فیاضی ہے ہم کو دولت بنی امیہ میں بھی فلسفہ کا پتہ ملتا ہے، اور اس کو تو اور زیادہ مدت گذری کہ عرب پر فلسفہ کا پرتو پڑنا شروع ہو چکا تھا، امیر معاویہؓ کے دربار میں ابن آسال نامی ایک عیسائی طبیب تھا جس نے یونانی زبان کی بعض کتابیں عربی میں ترجمہ کیں (۱) اور ان کا پوتا خالد بن یزید المتوفی ۸۵ھ تو درحقیقت حکیم بنی امیہ کے لقب کا مستحق تھا، اس نے مریانس نام ایک رومی راہب سے کیمیا اور طب پڑھی تھی، اس نے یونانی زباندانوں کو جمع کیا اور ترجمے کی خدمت دی۔

اس کے عہد کا مشہور مترجم اصطفن تھا، جس نے چند اور مترجموں کی اعانت سے صنعت وغیرہ کی کتابیں ترجمہ کیں، جس اولیت کا تمغہ مورخوں نے منصور کے لیے تجویز کیا ہے، انصاف یہ ہے کہ اس کا مستحق خالد تھا (۲)، مروان بن الحکم کے زمانہ میں ماسرجویہ ایک یہودی عالم نے جس کی مادری زبان سریانی تھی، ہرادن قس کی ایک کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا، عبدالملک کے بعد غالباً فلسفہ پر کچھ توجہ نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ۱۳۱ھ میں زمانہ نے بنوامیہ کی حکومت کا ورق الٹ دیا۔

۱۳۷ھ میں جب منصور عباسی بغداد کے تخت پر بیٹھا، تو ترجمہ و تصنیفات پر حوصلہ شاہانہ سے توجہ کی، قیصر روم کو خط لکھ کر فلسفہ کی کتابیں منگوائیں اور چونکہ اس وقت تک دارالخلافہ میں ان زبانوں کے جاننے والے موجود نہ تھے، یہ بھی فرمایش کی کہ جو کتابیں آئیں وہیں سے عربی میں ترجمہ ہو کر آئیں چنانچہ اقلیدس اور کچھ طبیعیات کی کتابیں مع ترجمہ کے بغداد میں پہنچیں،

---

(۱) دیکھو نامہ دانشوران ناصری مطبوعۂ ایران حالات ابن آثال (۲) دیکھو ابن خلکان، حالاتِ خالد، اور کشف الظنون جلد سوم ص ۹۶، علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں خالد کے علم و فضل و واقفیت فلسفہ سے متعجبانہ انکار کیا ہے مگر ابن خلدون کے خلاف بہت سی متعدد شہادتیں موجود ہیں۔

علمائے اسلام ان کو پڑھ کر اور بھی مشتاق ہوئے (۱) منصور کا شوق علمی دیکھ کر دور دور سے مترجمین اور حکماء اس کے دربار میں آنا شروع ہوئے، جرجیورس، فرات بن سحنا ثاعیسی، بطریق (یہ سب عیسائی عالم تھے) نو بخت منجم، ابوسہل (مجوسی تھے) ابن المقفع اس کے دربار کے مشہور مترجم اور حکیم (۲) تھے، بطریق نے یونانی اور ابن المقفع نے فارسی زبان سے ترجمے کئے، ۱۵۶ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی دان ہندو عالم منصور کی پایہ شناسی کا شہرہ سن کر دارالخلافہ میں داخل ہوا، اس نے ایک نہایت عمدہ زیچ جس کو اس نے ایک عمدہ اور جامع تصنیف سے جو ایک بادشاہ ہندوستان مسمی بہ بیگر کی طرف منسوب ہے، خلاصہ کیا تھا، منصور کی خدمت میں پیش کی، محمد بن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے عربی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور اس سے ایک کتاب مرتب کی جو ریاضی دانوں میں ''سند ہند'' کے نام سے مشہور ہے، مامون الرشید کے زمانہ تک اعمال کواکب میں اسی زیچ پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ (۳)

منصور کے نامور فرزند مہدی نے اگرچہ اس طرف توجہ نہیں کی بلکہ ایک محکمہ تحقیقات زنادقہ قائم کر کے آزادی رائے کو بالکل روک دیا، لیکن خاندان برامکہ نے جو اس کے عہد میں سلطنت کا ایک بڑا رکن تھا، اس باب میں بڑی ناموری حاصل کی، ان کے اہتمام سے یونانی اور فارسی کی بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں، ابن ناعمہ، سلام ابرش (۴) عبداللہ اہوازی، ان کے عہد

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۱۵ مطبوعہ بیروت۔ (۲) دیکھو مختصر الدول حالات حکمائے عہد منصور، یہ ایک مختصر اور مفید تاریخ ہے جو الفرج ملطی ایک عیسائی عالم کی تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، ڈاکٹر پوکاک پروفیسر آکسفورڈ کالج نے لیٹن میں اس کا ترجمہ کیا ہے اصل کتاب مع ترجمہ لیٹن ۱۶۶۳ھ میں بمقام لندن چھاپی گئی ہے، جہاں کہیں اس آرٹیکل میں مختصر الدول کا نام آئے اس سے یہی تاریخ مراد ہے، ابن البطریق و ابن المقفع کے لئے دیکھو کشف الظنون حرف حا ذکر حکمت۔ (۳) یہ تفصیل مع حالات زائد جامع القصص الہندیہ میں ہے جو ہندوستان کے حالات میں چند رسالوں کا ایک مجموعہ ہے اور فرانس میں بمقام بن ۱۸۳۸ھ میں چھپا ہے۔ (۴) ابن ناعمہ اور سلام ابرش کا ذکر بحیثیت مترجمین برامکہ صاحب کشف الظنون نے حکمۃ کے ذکر میں کیا ہے، آگے فہرست میں چند کتابوں کے نام ملیں گے جو برامکہ کے لئے ترجمہ کی گئیں۔

کے نامور مترجم تھے، ہارون الرشید اعظم نے جس کے نام سے یورپ وایشیا دونوں واقف ہیں، پچھلی کوششوں میں اور بہت کچھ اضافہ کر دیا، اس نے ترجمہ اور تصنیفات کا ایک بڑا محکمہ قائم کیا جس میں ہر زبان کے بڑے بڑے ماہر تصنیف اور ترجمہ کے کام پر مامور(۱) تھے، یوحنا بن ماسویہ ایک عیسائی عالم جس کی مادری زبان سریانی تھی، قدیم یونانی طب کی تصنیفات کے ترجمے کے لیے انتخاب کیا گیا، اس محکمہ سے جس کو بیت الحکمۃ کہتے تھے، ژند، یونانی، شامی، سنسکرت، زبانوں کے ترجمے ہمیشہ تیار ہوتے تھے، اور اشاعت پاتے تھے، منکہ اور صالح دو ہندو حکیم اس کے دربار میں تھے جو ترجموں کے علاوہ صاحب تصنیف بھی تھے، شاناق ہندی کی کتاب السموم منکہ ہی نے فارسی میں ترجمہ کرائی تھی، چرک اور ششرت کی تصنیفات طبی جو عربی میں ترجمہ ہوئیں، غالبًا اسی عہد میں اورانھی ہندو حکیموں کے اہتمام میں ہوئیں۔(۲)

اب تک جو کچھ ہوا تھا گو بہت کچھ تھا، مگر مامون الرشید کے فیاضانہ حوصلوں کے سامنے تمام پچھلی کوششیں گمنامی کے پردے میں چھپ گئیں، مورخین نے مامون کے اس جوش التفات کی ایک عجیب دلچسپ حکایت لکھی ہے یعنی ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک محترم شخص تخت پر جلوہ فرما ہے۔ مامون نے بڑھ کر پوچھا آپ کون بزرگ ہیں، تخت نشین نے کہا ارسطو، مامون پھڑک اٹھا اور عرض کی اے حکیم اچھی کیا چیز ہے، خیالی ارسطو نے جواب دیا کہ جسے عقل اچھا کہے، دوبارہ مامون نے درخواست کی کہ میرے لیے کچھ نصیحتیں ارشاد ہوں، جواب ملا کہ ''توحید اور صحبتِ نیک'' خواب کا کچھ اثر ہوا ہو یا نہیں مگر اس واقعہ سے مامون کے شوق اور محویت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے، غرض سبب جو کچھ ہو مامون نے قیصر روم کو نامہ لکھا کہ ارسطو کی کل تصانیف بہم

(۱) ان ترجموں کا ذکر پامر صاحب کی تاریخ ہارون الرشید ص۲۲۲، وچیمبرس انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، مطبوعہ لندن ۱۸۸۶ء ص ۳۴۷، اور کشف الظنون میں صراحۃً اور ضمناً ملے گا۔(۲) الفنسٹن صاحب نے تاریخ ہندوستان حصہ مسلمانان میں لکھا ہے کہ منکہ وسالی دو ہندی طبیب ہارون الرشید کے دربار میں تھے، الفنسٹن صاحب نے صالح کو سالی پڑھا ہے اور غالبًا یہی صحیح ہے، شاناق کا اصلی نام شاید شنگھ ہو جو عربی خراد پر چڑھ کر شاناق ہو گیا ہے، چرک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کئی سو برس پہلے ایک طبیب تھا۔

پہنچائی جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلفاء کے معمولی خطوط قیصر وفغفور پر فرمان کا اثر رکھتے تھے، قیصر تعمیل ارشاد کے لیے آمادہ ہوا مگر روم کے اطراف میں فلسفہ خود گمنام ہو چکا تھا، بڑی تلاش سے ایک راہب ملا جس نے پتہ دیا کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانہ سے مقفل ہے اور جتنے تاجدار تخت نشین ہوتے گئے، قفلوں کی تعداد بڑھاتے گئے، قسطنطین نے اس مکان میں اس غرض سے فلسفہ کی کتابیں بند کرادی تھیں کہ اگر فلسفہ وحکمت کو آزادی ملی تو دین مسیحی کو سخت صدمے اٹھانا پڑیں گے، قیصر روم کے حکم سے یہ پرخطر خزانہ کھولا گیا، تاہم خیال ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کی فیاضی مذہباً ممنوع تو نہ ہو لیکن ارکان دولت نے قیصر کی تسکین کردی کہ اچھا ہے فلسفہ مسلمانوں میں پہنچا تو ان کے مذہبی جوش کو بھی ٹھنڈا کر کے رہے گا، غرض پانچ اونٹ لاد کر فلسفہ کی کتابیں مامون کی خدمت میں روانہ کی گئیں۔(۱)

مامون نے خود بھی حجاج بن المطر وابن البطریق کو جو یونانی وسریانی زبان کے بڑے ماہر تھے، اس غرض سے روم بھیجا کہ اپنی پسند سے کتابیں انتخاب کر کے لائیں، بیت الحکمۃ کا منیجر اور افسر جس کا نام سلما تھا، وہ بھی ان دونوں کے ساتھ گیا(۲) مامون نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیسا کہ گبن (۳) صاحب لکھتے ہیں، اس کے کارندوں نے آرمینیہ، شام، مصر میں فنونِ یونانی کی کتابیں جمع کیں جس کا ترجمہ اس کے حکم سے نہایت حاذق مترجم نے زبان عربی میں کیا، اسی زمانہ میں قسطا بن لوقا بعلبکی ایک عیسائی فلاسفر اپنے شوق سے روم گیا اور فلسفہ کی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لایا، مامون نے اس کی شہرت سے مطلع ہو کر بلا بھیجا اور بیت الحکمۃ میں ترجمہ کے کام پر مقرر کیا(۴)، سہل بن ہراون کو جو ایک فارسی النسل حکیم تھا، فارسی کتابوں کے ترجمہ کا اہتمام سپرد ہوا (۵) سب سے بڑا نامور حکیم اور مختلف زبان کا ماہر اور مترجم یعقوب کندی تھا، جو خاص

(۱) ناسخ التواریخ مؤلفہ لسان الملک سپہر جلد اول حالات ارسطو کے ذیل میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔
(۲) یہ پوری تفصیل کشف الظنون باب الحکمۃ میں ہے۔ (۳) گبن صاحب کی رومن امپائر حصۂ مسلمانان، باب سوم آغاز دولتِ عباسیہ۔ (۴) مختصر الدول حالات یعقوب کندی (۵) فوات الوفیات ترجمہ سہل بن ہراون۔

تصنیفات ارسطو کے ترجمہ پر مامور تھا(۱) وہ ایک عیسائی امیر تھا اور اس کا باپ کوفہ کا گورنر رہ چکا تھا، فارسی، ہندی، یونانی زبان جانتا تھا اور مامون کا نہایت معتمد اور مقرب تھا، غالبًا مامون نے خود بھی یونانی زبان سیکھ لی تھی، چمبرس انسائیکلو پیڈیا میں ہے، (۲) مامون نے یونان کے بادشاہ کو پانچ ٹن سونا دینا اور صلح دائمی کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ حکیم لیو کو اجازت دی جائے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے آکر مامون کو فلسفہ سکھا جائے۔

فلسفہ کے لیے اتنی قیمت صرف کرنے کی مثال بہت کم مل سکتی ہے، شاکر منجم کے تینوں بیٹے محمد و احمد و حسن نے بھی جو ہندسہ و نجوم و موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور مامون کے خاص مقرب اور ندیم تھے، اس کام پر بہت توجہ کی، اپنے ذاتی شوق سے روم کے اطراف میں قاصد بھیجے اور فلسفہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں منگوائیں، دور دراز ملکوں میں قاصد بھیج کر مترجم بلوائے اور ان کتابوں کے ترجموں پر مامور کیا (۳) مامون کی نیت کا پھل تھا کہ ان نامور بھائیوں کی کوشش بھی مامون کے کارنامہ میں لکھی گئی اس عہد میں جن زبانوں کے ترجمے ہوئے وہ یونانی، فارسی، کالڈی، قبطی، شامی زبانیں تھیں۔

ہارون الرشید کا پوتا متوکل باللہ بھی اسی قسم کی فیاضیوں میں نامور ہوا، مترجموں میں جس نے کثرت اور عمدگی تراجم کے لحاظ سے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ہے، وہ متوکل ہی کے عہد کا نامور حکیم حنین بن اسحاق تھا، حنین نے بلاد رومیہ میں دو برس مستقل رہ کر یونانی زبان اور فلسفہ کامل طور سے سیکھا، روم سے واپس آکر وہ بصرہ چلا گیا اور خلیل بن احمد بصری سے عربیت کی تحصیل کی اور چونکہ دونوں زبانوں کا پورا ماہر ہو چکا تھا، اپنے شوق سے فلسفہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنی شروع کیں، اس کی شہرت روز افزوں نے اس کو متوکل باللہ کے دربار میں پہنچایا، متوکل نے بیش قرار تنخواہ اور جاگیریں مقرر کر دیں، حنین کا ایک بیٹا اسحٰق اور اس کا بھانجا حبیش یہ دونوں بھی یونانی و سریانی زبان کے بڑے ماہر تھے، اس لئے محکمہ ترجمہ میں مقرر ہوئے، عربی میں جو ترجمے ہوئے

---

(۱) ہسٹری آف فلاسفی، مصنفہ ہنری لوئیس صاحب فلسفہ عرب حالات یعقوب کندی۔ (۲) کتاب مذکور ذکر عرب۔ (۳) ابن خلکان ترجمہ محمد بن موسیٰ۔

اکثر اسی اسحاق وحنین کی طرف منسوب ہیں۔(۱)

حنین بن اسحاق وثابت بن قرہ وحبیش بن الحسن اور دوسرے نامور مترجموں میں سے ہر ایک کی ماہانہ تنخواہیں پانچ سو اشرفیاں تھیں (۲) معتضد باللہ کے عہد کا مشہور مترجم ثابت بن قرہ حرانی ہے، ثابت نے محمد بن موسیٰ کے گھر میں پرورش پائی اور اس کی سفارش سے معتضد کے دربار میں داخل ہوا، معتضد اس کی نہایت عزت کرتا تھا، حتیٰ کہ وزراء اور خواص بھی اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، (۳) ترجموں کا اہتمام اور بیت الحکمۃ کا انتظام غالباً دوسو برس سے زیادہ قائم نہ رہا کیونکہ اتنی مدت کی پیہم تلاش اور جستجو میں روم و یونان کا کوئی علمی خزانہ ایسا باقی نہیں رہا، جو اہل عرب کی آنکھوں سے چھپا رہ گیا ہو۔ اس کے علاوہ اس مدت میں مسلمان فلاسفروں کا ایک بڑا گروہ تیار ہو چکا تھا، اسحاق ابومعشر، محمد بن موسیٰ، احمد سرخسی، ابونصر فارابی وغیرہ حکماء کی تازہ اختراعات اور خاص تصنیفات نے فلسفہ کو فلاطون وارسطو کی اطاعت سے آزاد کر دیا تھا، (۴) تاہم خلفاء کا دربار ایک مدت تک ہر ملت اور مذہب کے فلاسفروں سے بھرا رہا جو اپنے ذاتی شوق یا بعض اوقات خلفاء کی فرمایش سے تصنیفات کے علاوہ دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کرتے تھے، راضی باللہ کے عہد خلافت قریباً ۳۲۰ھ میں متی بن یونس منطق کا بڑا عالم مشہور ہوا اور ارسطو کی بعض کتابیں ترجمہ کیں، (۵) ہنری لوئیس صاحب ہسٹری آف فلاسفی میں لکھتے ہیں، دسویں صدی عیسوی میں یحییٰ بن عدی اور عیسیٰ بن زرع نے نئے ترجمے کئے اور پہلے ترجموں کی اصلاح کی، اسی طرح محمد بن یحییٰ جوز جانی جو ۳۴۸ھ میں تھا اور ابوالفرج المتوفی ۳۳۵ھ وغیرہ نے سریانی وغیرہ سے نئے ترجمے کئے اور شرحیں لکھیں، (۶) ابوریحان بیرونی جو بوعلی سینا کا معاصر اور فلسفہ وہیئت میں اس کا حریفِ مقابل تھا، ہندوؤں کے علوم کے شوق میں ہندوستان گیا اور برسوں رہ کر فلسفہ وغیرہ کی تحصیل کی، سنسکرت سے ایسی واقفیت حاصل کی تھی کہ ہندوؤں کو فلسفۂ یونان کے مسائل

---

(۱) یہ تمام تفصیل مختصر الدول عہد متوکل میں موجود ہے۔ (۲) ناسخ التواریخ جلد اول، حالات ارسطو (۳) مختصر الدول (۴) گبن صاحب لکھتے ہیں کہ حکمائے سوع، جابر ارازی، ابن سینا کے نام حکمائے یونانی کے ہم پلہ کئے گئے ہیں، غالباً یہ یوروپین شہادت زیادہ قابل اعتبار ہوگی۔ (۵) مختصر الدول۔ (۶) مختصر الدول۔

ان کی زبان میں سکھائے اوراس طرح ہندوؤں کی شاگردی کے حق سے بھی ادا ہوگیا، (۱) محمد بن اسمٰعیل تنوخی نے بھی ہیئت ونجوم سیکھنے کے لیے ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور وہاں رہ کر علوم وفنون کی تحصیل کی۔

بعض اتفاقی طریقوں سے بھی مسلمانوں کو دوسری قوموں کے خیالات ومسائل معلوم ہوئے، جس زمانہ میں فتوحات اسلامی کا سیلاب ہندوستان کی سرحد کے اونچے اونچے مقامات سے گذر رہا تھا، بنارس کا ایک صوفی عالم جس کا نام بھوجر برہمن تھا، مسلمانوں سے مذہبی مباحثہ کے لیے روانہ ہوا، اور سلطان علی مرد کے زمانہ میں شہر اکفوت پہنچ کر قاضی رکن الدین سمرقندی سے ملاقات کی، مباحثہ کا ارادہ تو جاتا رہا، بجائے اس کے علوم عربیہ سیکھنے شروع کئے، اس نے قاضی صاحب کی خدمت میں ایک کتاب جس کا نام انبرت کنڈ تھا، پیش کی اور اس کے مطالب بیان کئے، قاضی صاحب اس کے مسائل سے پوری آگہی حاصل کرنے کے ایسے شائق ہوئے کہ اس سے سنسکرت پڑھنی شروع کی اور اصل زبان سے واقف ہوکر پہلے فارسی میں اور پھر عربی میں کتاب مذکور کا ترجمہ کیا۔تاہم اس کے مشکل مقامات ہنوز شرح کے محتاج تھے، اتفاق سے بھوجر کا ایک شاگرد انبھوا ناتھ بلاد اسلامیہ میں پہنچا، تو ایک سنسکرت داں عالم نے اس سے یہ کتاب پڑھی اور عربی زبان میں اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا جس کا نام مراۃ المعانی لادراک العالم الانسانی ہے۔(۲)

سلطان فیروز شاہ والی ہندوستان قریباً ۷۷۲ھ میں جب جوالامکھی پہاڑ پر گیا تو لوگوں نے اطلاع کی کہ اس بت خانہ میں (۳) ۱۳سو کتابیں قدیم زمانہ کی موجود ہیں، فیروز شاہ نے ان

---

(۱) دیکھو جامع القصص الہندیہ ومختصر الدول، بیرونی کی ایک کتاب جس میں سفر ہندوستان اور یہاں کی معاشرت اور تمدن کا حال اس نے لکھا ہے، لندن میں نہایت اہتمام سے چھاپی گئی ہے جس پر پروفیسر سی شو نے جو جرمن کا مشہور عالم ہے، ایک دیباچہ لکھا ہے، بیرونی کے شوق علمی اور تحقیقات کا اندازہ اس دیباچہ سے ہوسکتا ہے۔ (۲) یہ پوری تفصیل جامع القصص الہندیہ میں مذکور ہے، یہ پہلی مثال ہے کہ ایک عربی داں مصنف نے سنسکرت یا بھاشا الفاظ کو صحیح اور پورا ادا کیا ہے جس طرح میں نے یہ سب پورے نام لکھے ہیں، اصل کتاب میں بھی اسی طرح ہیں۔ (۳) دیکھو تاریخ بدایونی حالات فیروز شاہ، ان کتابوں میں سے بعض کے ترجمے مثلاً رزم نامہ وغیرہ لاہور میں بدایونی نے خود بھی دیکھے۔

کے ترجمے کئے جانے کا حکم دیا اور موسیقی ونجوم وغیرہ کی تصنیفات ترجمہ کی گئیں، نجوم کی ایک کتاب عزالدین نے نظم میں ترجمہ کی۔

علوم وفنون کے تراجم کی یہ ایک مختصر سی تاریخ ہے، اب ہم کو دیکھنا ہے کہ کس قسم کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور اس انتخاب کے کیا اسباب تھے، ان ترجموں کو اسلامی تصنیفات سے کیا تعلق ہے، ان ترجموں کی صحت پر کہاں تک اعتبار ہوسکتا ہے، مسلمانوں نے اس کام میں دوسری قوموں کا احسان کیوں اٹھایا اور خود ترجمہ کرنے پر کیوں نہیں مائل ہوئے، جہاں تک ہم کو معلوم ہے طب اور فلسفہ کے سوا جس میں منطق، طبیعی، الٰہی، موسیقی، فلکیات، ہیئت، ہندسہ، حساب، جبر ومقابلہ وغیرہ شامل ہیں، اور علوم کی تصنیفات کم ترجمہ ہوئیں۔

اصل یہ ہے کہ عرب مسلمانوں کو اپنی زبان اور مذہب پر اس قدر ناز تھا کہ وہ دوسری قوموں کی ان تصنیفات کو ہمیشہ بے پروائی کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور واقعی جو شخص فصاحت و بلاغت کے متعلق جزئیات کے انضباط، قواعد کی ترتیب، مسائل کے استنباط میں ان کی موشگافیاں دیکھے گا، مان جائے گا کہ ایسے نکتہ دانوں کو علم انشاء میں کسی قوم کا زلہ رُبا ہونا نہیں چاہیے، علامہ ابن اثیر جس نے علم البیان کو بہت کچھ ترقی دی ہے، فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ میں یونانی زبان مطلق نہیں جانتا اور اس فن کے متعلق ان کے خیالات سے میں بالکل ناآشنا ہوں، یونانی ورومی تصنیفات فلسفہ وطب کے سوا زباندانی یا مذہب سے متعلق تھیں، مسلمانوں نے بے شبہ دانستہ ان دونوں سے بے اعتنائی کی اور افسوس ہے کہ اس غیر معتدل فخر نے ان کو دوسری قوموں کے علم تاریخ سے بھی محروم رکھا۔

مسلمان فلسفہ طب کے پہلے مرحلے میں بے شبہ یونان وروم کے احسان مند ہیں، ان کی تصنیفات کے ہر صفحے سے اس احسان مندی کا اظہار ہوتا ہے اور سچ یہ ہے کہ افلاطون وارسطو (وغیرہ) کے نامون کو عموماً اسلامی ممالک نے جو عزت دی یونان میں ان کو نصیب نہ ہوئی ہوگی، لیکن مسلمانوں نے ایک ذرہ پایا تھا اور اس کو آفتاب بنا دیا، ہیئت کو بہت کچھ ترقی دی، طبعیات کے متعلق ارسطو کی بہت غلطیاں دریافت کیں، منطق کو بالکل نئے طرز سے ترتیب دیا اور چند

اصول اضافہ کئے، نئے نئے آلات رصد یہ ایجاد کئے، نور کی رفتار دریافت کی، علم مناظر میں انعکاس کا قاعدہ معلوم کیا، جبر ومقابلہ جو چند جزئی مسئلوں کا نام تھا، انہی کی طباعی سے ایک علم کے رتبہ پر پہنچ گیا، دواسازی، نسخوں کی ترتیب، عرق کھینچنے کے آلے، موالید ثلاثہ کی تحلیل، تیز آبوں کے فرق باہمی اور مشابہت کا امتحان، انہی کی ایجادات سے ہیں، کیمسٹری کی انہی نے بنیاد ڈالی، علم نباتات میں اپنے تجربوں سے دو ہزار پودے اور اضافہ کر دیئے، (۱) غرض آج یونانی وعربی تصنیفات کا کوئی شخص اگر موازنہ کرے تو قطرہ و دریا کا فرق پائے گا۔

عیسائی مترجموں کو بے شبہ ترجمے کا فخر حاصل ہے لیکن مسلمان دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مستقل مرتب جامع تصنیفات کے سامنے یہ ترجمے تقویم پارینہ سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ چند روزوں کے بعد ترجموں کا کسی کو خیال نہیں رہا اور دنیا میں جس چیز نے علوم وفنون کو ناپید ہونے سے بچالیا، وہ خاص اسلامی تصنیفات تھیں، آج مسلمانوں کی بڑی بڑی لائبریریوں میں ترجمہ کا پتہ بھی نہیں ہے اور جن لوگوں کی قسمت میں یورپ کا استاد بننا لکھا تھا، مثلاً بوعلی سینا، ابن طفیل، محقق طوسی، امام غزالی وہ ان ترجموں کے کبھی احسان مند نہیں ہوئے۔

ترجموں کی صحت وغلطی کی نسبت ہم کوئی خاص فیصلہ نہیں کر سکتے، آج یورپ عربی ویونانی دونوں زبانوں پر قابض ہے، قریباً دوسو برس تک اس نے عربی ہی کے ذریعہ سے فلسفہ کی تحصیل کی ہے، اس وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ بعض قدیم تصنیفات (مثلاً پانچویں اور چھٹی اور ساتویں جلدیں تراشہائے مخروطی مصنفہ اپالونیس پرجیس (Apolo Niuspergeous) وغیرہ ذالک) عربی ہی زبان کے ذریعہ سے محفوظ ہیں، ورنہ ان کی اصل جاتی رہی ہے، یورپ اسلامی کوششوں کا ممنون ہے اور امید ہے کہ ان ترجموں کی نسبت اس کا فیصلہ تعصب کی آلائش

(۱) اگر زمانہ نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہوجائے کہ مسلمانوں کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے، اور اُن کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھادیا، ایک مستقل رسالے میں لکھوں گا اور شاید اسی انجمن کے کسی دوسرے جلسے میں اس کے پیش کرنے کا اتفاق ہو۔ (ش)

سے خالی ہوگا، گبن صاحب لکھتے ہیں: ان عربی ترجموں کی خوبی پر رنادٹ (Renaudof) نے خوب بحث کی ہے اور گسیرا (Gasira) نے دیانت داری سے اس کی حمایت کی ہے۔ ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنری لوئیس (G.henery Lewes) میں ہے۔ منک کہتا ہے کہ بعض ترجمے نہایت خوبی سے کئے گئے لیکن ایک فرانسیسی مصنف کا بیان ہے کہ اکثر ترجمے اصل یونانی سے نہیں بلکہ شامی ترجموں سے ہوئے اور ترجمہ در ترجمہ ہونے کی وجہ سے بہت غلطیاں رہ گئیں، گو ہم اس امر کو کسی قدر تسلیم کرتے ہیں، اور نہ صرف اسی بنا پر بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ترجمہ گو کتنا ہی عمدہ ہوتا ہم یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا ہے کہ اصل مطلب بالکل پورا پورا ادا ہوگیا لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی غلطیوں نے اسلامی تصنیفات پر کوئی محسوس اثر پیدا نہیں کیا، مسلمان فلاسفر یونانی فلاسفروں کی اصل غلطیوں کے درست کرنے والے تھے، ان جزئی غلطیوں سے ان پر کچھ اثر نہیں ہوسکتا تھا۔(۱)

مسلمانوں کا خود ترجمہ کرنے کی طرف مائل نہ ہونا گبن صاحب کے نزدیک اسی فخر وغرور کا اثر ہے، جو عرب کا اصلی خاصہ ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''اہل عرب اپنی ملکی زبان کی کثرت الفاظ پر بھروسہ کر کے غیر زبان کے محاورہ کو حقیر سمجھتے تھے، انھوں نے اپنی عیسائی رعایا میں سے یونانی مترجم چھانٹے، عرب کی پرفخر طبیعت کا خاصہ ہم کو بھی معلوم ہے لیکن افسوس ہے کہ گبن صاحب کی بدگمانی نے اس کا اندازہ اعتدال سے زیادہ کیا ہے، اصل یہ ہے کہ عرب میں فلسفہ کا چرچا منصور عباسی کے عہد سے اور اس کے ذاتی شوق سے شروع ہوا، یہ وہ وقت تھا کہ مذہبی بے شمار روایتوں اور مسائل کے انبار کا لوگوں کی قوت حافظہ پر ایک بڑا بھاری بوجھ تھا اور سب کو یہ پڑی تھی کہ کاغذ اس کے حوالہ کر کے ذرا سبکدوش ہوں، مذہبی علوم کے بہت سے مبادی اور مقدمات بھی مرتب کرتے تھے، اسلام کا جوش ابھی شباب پر تھا اور کم وبیش ہر مسلمان میں اس کا اثر پایا جاتا تھا، یہ ظاہر ہے کہ ایک سرگرم مذہبی گروہ کو اپنے مذہبی علوم اور مسائل کے سامنے دوسری باتوں پر کس قدر توجہ ہوگی،

---

(۱) طبعیات میں ارسطو اور موسیقیات میں فیثاغورث پر بوعلی سینا و فارابی نے جو قابل قدر نکتہ چینیاں کی ہیں وہ عام طور پر مشہور ہیں، ہنری لوئیس صاحب نے بھی مانا ہے کہ فارابی نے فیثاغورث کی غلطیاں درست کردیں۔

اس وقت تعلیم یافتہ گروہ حدیث، فقہ، تفسیر، اسماء الرجال وغیرہ کی تدوین وترتیب میں مصروف تھا، اس پر طرہ یہ ہوا کہ فلسفہ کا جو کچھ تھوڑا بہت رواج ہوا، اس نے طبیعتوں میں آزادی پیدا کردی اور بڑے بڑے نامور امام ومجتہد اس خیال سے اس کے مخالف ہوگئے کہ فلسفہ و مذہب ایک ساتھ بسر نہیں کر سکتے۔

خلفاء (وہ بھی سب نہیں) بے شبہ فلسفہ کے حامی تھے لیکن گبن صاحب خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یونانی زبان سیکھنے سے ان کو مہمات ملکی مانع تھے، یا دوسری قوموں کی زبانوں کی حقارت، کئی صدیوں تک فلسفہ ایوان خلافت کا خاص مہمان رہا، تیسری صدی کے بعد البتہ اس نے قبول عام کی سند حاصل کی، لیکن اس وقت جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں بے شمار ترجمے اور اسلامی تصنیفیں موجود تھیں اور فلسفہ حاصل کرنے کے لیے یونانی اور رومی زبانوں کا دریوزہ گر ہونا چنداں ضروری نہ تھا، یہ خیال بھی کلیتہً صحیح نہیں ہے کہ ترجمہ کے کام میں مسلمان سرے سے شریک ہی نہیں ہوئے، عبدالکریم شہرستانی نے ملل ونحل میں جہاں مترجموں کے نام لئے ہیں، ان میں ہم کو مسلمانوں کے بھی نام ملتے ہیں، مثلاً ابوسلیمان ابن بکر مقدسی، یوسف بن محمد نیشاپوری، ابوزید احمد بلخی، ابو الحارث، حسن بن سہیل قمی، احمد بن محمد اسفرانی، طلحۃ النسفی اور محمد بن ابراہیم فزاری، سہل بن ہزون، ابوریحان بیرونی، محمد بن اسماعیل تنوخی، قاضی رکن الدین وغیرہ بھی تو آخر مسلمان ہی تھے، بہت سے اولوالعزم خلفاء اور امراء کی پیہم کوششوں نے ترجموں کی تعداد جس قدر کثیر کردی ہے اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے تاہم نمونے کے طور پر میں چند ترجموں کی ایک فہرست ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں، میں نے ان ترجموں کو مطلقاً چھوڑ دیا ہے جن کے مترجموں کے نام یا ان کے زائد حالات میں نہیں معلوم کر سکا ہوں جن حکماء کی کتابوں کے ترجمے ہوئے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

Ammouius, Themistius, Pyriarus, Surpheius, Philoponus, PyTagoras, Diogenes, Dimscretus, Hippocrales, Socrales, Aris,totle, Archumedes, Gelen,

Ptolemy, Appollouius, Pengacanus, PluTo.

ثاوذوسیوس، مانالاوس، برقلس، ارسطیقوس، ویقوریدس، اوطولوس، باربوقا، قسطوس، ابقلاؤس، ابلینوس، نیقولاؤس، بولوس الاحانطی، ویوقنطوس۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
الٰہیات	ارسطو	یحییٰ بن عدی وغیرہ	اسحاق بن حنین، ابن عدی، اسطاث الکندی، ابوالبشر متی، ہرایک نے اس کا پورا ترجمہ کیا، اور بعض مقالوں کا حنین بن اسحاق نے بھی۔
السماع الطبعی	//		آٹھ مقالوں میں ہے، شیخ بوعلی سینا، اور دوسرے علمائے اسلام نے اس کی تفسیر کی ہے۔
کتاب السماء والعالم	//	متی	یہ کتاب چار مقالوں میں ہے، قاضی ابوالولید ابن الرشد نے اس کا خلاصہ کیا (معجب)
کتاب النیازک	//		حنین بن اسحاق نے اس کی شرح لکھی، اور خلاصہ کیا۔
کتاب جرمی الشّمس والقمر وبعدہما	//		علامہ نصیرالدین طوسی نے اس کی اصلاح کی۔
کتاب النبات	//	اسحٰق	دو مقالے میں ثابت بن قرہ نے اصلاح کی۔
کتاب المرأۃ	//	حجاج بن مطر	
کتاب الحس والمحسوس	//	متی بن یونس	قاضی ابوالولید نے اس کا خلاصہ کیا اور شرح لکھی، (معجب) ۳ مقالوں میں ہے،
سرّ الاسرار	//		مامون رشید کے حکم سے ترجمہ ہوئی، اس میں سکندر کے لیے ارسطو نے وصیتیں کی ہیں۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب السیاست	ارسطو		سات مقالوں میں ہے اس کو ارسطو نے سکندر کے لیے لکھا تھا۔
کتاب الاخلاق	//	حنین بن اسحٰق و یحییٰ بن عدی	اس میں بارہ مقالے ہیں، فرفوریوس نے اس کی تفسیر کی ہے۔
کتاب النفس	//	// وغیرہ	حنین نے پوری کتاب کا ترجمہ سریانی میں ترجمہ کیا اور بعض مقالوں کا اسحاق نے، ثامیطوس نے اس کتاب کی جو مبسوط شرح لکھی تھی اس کا ترجمہ اسحٰق نے ایک خراب نسخہ سے کیا اور پھر ایک عمدہ نسخہ سے مقابلہ کر کے صحیح کیا۔
قاطیغوریاس	//	حنین بن اسحٰق	یعنی مقولات عشر، ابونصر فارابی، ابوبشر متی، ابن مقفع، و ابن بہرین، و کندی و اسحٰق ابن حنین، و احمد بن طبیب و رازی نے شرحیں لکھیں۔
باریمیناس	//	// واسحٰق	یعنی مباحث الفاظ حنین نے سریانی میں اور اسحاق نے عربی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ نحوی و ابو بشر متی و فارابی نے شرحیں لکھیں، اسحاق ابن مقفع کندی، ابن بہرین، رازی، ثابت بن قرہ، احمد بن طبیب نے ملخص اور مختصر کیا۔
انالوطیقا	//	ثیاوزوس	یعنی تحلیل قیاس، حنین نے سریانی میں اور اسحاق نے عربی میں اس کے بعض اجزاء ترجمہ کئے، یحییٰ نحوی و کندی نے اس کی شرح لکھی، ابو بشر

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			متی نے دومقالوں کی شرح کی۔
انولویطیقائے ثانی	ارسطو	اسحاق وغیرہ	یعنی برہان، حنین نے بعض اجزاء سریانی میں ترجمہ کیے اور متی نے اس ترجمہ کی عربی کی، یحییٰ نحوی، وابو یحییٰ مروزی نے اصل کتاب پر نکتہ چینیاں کی ہیں، متی کندی، فارابی نے شرحیں لکھیں۔
طوبیقا	//	یحییٰ بن عدی	یعنی جدل، اسحٰق نے سریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ بن عدی نے اس ترجمہ کی عربی کی، دمشقی نے بھی سات مقالوں کا ترجمہ کیا اور ابراہیم بن عبداللہ نے آٹھ مقالوں کا، یحییٰ بن عدی نے اس کی جو تفسیر لکھی وہ ہزار ورق میں ہے، فارابی، متی نے شرحیں لکھیں، اسکندر اور ابلینوس نے جو شرحیں اس پر لکھی ہیں، ان کا ترجمہ اسحاق نے عربی میں کیا۔
سوفسطیقا	//	ابن ناعمہ وغیرہ	یعنی مغالطہ، ابن ناعمہ وابو بشر متی نے سریانی میں ترجمہ کیا، اور یحییٰ بن عدی وقوبری وابراہیم نے عربی میں نقل کیا اور شرح لکھی، کندی کی بھی اس پر شرح ہے۔
ریطوریقا	//	اسحٰق وابراہیم	یعنی خطابیات، فارابی نے شرح لکھی جو سو ورق میں ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
انوطیقا	ارسطو	ابوبشر متی یحییٰ بن عدی	یعنی شعر، کندی نے اس کو مختصر کیا۔
سماع طبعی مشہور بہ سمع الکیان	"		یہ کتاب آٹھ مقالوں میں ہے، مقالہٗ اولیٰ کی تفسیر، اسکندر افردوسی نے کی، جس کا ترجمہ ابو الرواح صابی نے عربی میں کیا اور یحییٰ بن عدی نے اس کی اصلاح کی، دوسرا مقالہ حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ نے اس کو عربی میں نقل کیا، تیسرا مقالہ موجود نہیں ہے، چوتھے مقالہ کی تفسیر اسکندر افردوسی نے تین مقالوں میں کی ہے جن میں سے دو مقالے کامل اور تیسرے کا کچھ حصہ قسطا بن لوقا نے ترجمہ کیا، قسطا نے پانچویں اور ساتویں مقالے کا ترجمہ کیا اور آٹھویں کی شرح لکھی .... فرفوریوس یونانی نے اس کے چار مقالوں کی جو شرح لکھی ہے اس کا ترجمہ بسیل نے کیا اور ابوالبشر متی نے دوبارہ نقل کیا، ثامسطیوس نے بھی اس پر شرح لکھی ہے جس کا ترجمہ متی نے سریانی میں کیا، ابواحمد نے مقالہ اولیٰ و چہارم کی شرح لکھی، ثابت بن فرہ نے مقالہ اولیٰ و ثانیہ پر حاشیہ لکھا، ابراہیم بن الصلّت مقالہ اولیٰ کی

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			کی شرح کی، ابوالفرج بن قدامہ نے رومی زبان میں جوشرح لکھی ہے عربی زبان میں اس کا بھی ترجمہ ہوا، اس کتاب پر علمائے اسلام نے بہت سی شرحیں اور حاشیے لکھے۔
سماع عالم	ارسطو	یحییٰ بن عدی وغیرہ	چار مقالوں میں ہے ابن بطریق، متی نے اس کے بعد حصے ترجمے کئے، حنین بن اسحاق نے اس کے سولہ مسئلوں پر گفتگو کی ہے ابو زید بلخی نے ابوجعفر خازن کے لیے اس کی شرح لکھی، ابوہاشم نے اصل کتاب پر ردوقدح کیا اور اعتراضات لکھے، جوتصفح کے نام سے مشہور ہیں۔
کتاب الکون والفساد	//	حنین وغیرہ	حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا، اور اسحاق دمشقی نے عربی میں، اسکندر نے اس کی شرح لکھی ہے، جس کا ترجمہ متی نے کیا اور ابوزکریا یحییٰ بن عدی نے اس کی اصلاح کی، یحییٰ نحوی نے بھی اس کی شرح لکھی، مقالہ اولیٰ کا ترجمہ قسطا نے بھی کیا، لاینذروس یونانی نے جوشرح لکھی ہے، اس کا ترجمہ بھی عربی زبان میں کیا گیا۔
کتاب فی الآثار العلویۃ	//	یحییٰ بن بطریق وغیرہ	لاینذروس یونانی نے اس کی شرح لکھی ہے جو ابوالبشر متی نے عربی میں نقل کیا، اسکندرفردوسی کی بھی شرح ہے، جس کا ترجمہ عربی

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب الحیوان	ارسطو	ابن بطریق	زبان میں کیا گیا، ثامسطیوس کی شرح کا ترجمہ اسحاق نے عربی میں کیا، یحییٰ بن عدی وحنین وغیرہ نے بھی اصل کتاب کے ترجمے سریانی و عبرانی میں کئے۔ ۱۹ مقالوں میں ہے نیقولاؤس نے اس کومختصر کیا ہے جس کا ترجمہ ابوعلی بن ذرہ نے عربی میں کیا۔

تقی الدین سپر نے ناسخ التواریخ میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت ارسطو کی کتابوں میں سے کتاب اثالوجیاوکتاب زبرجدوکتاب الباقیات میری نظر سے گذریں۔

اقلیدس

حجاج ابن یوسف کوفی نے دوترجمے کیے پہلا ہارونی کے لقب سے مشہور ہے اور دوسرا مامونی کے نام سے مگر یہ دوسرا ترجمہ عمدہ اور صحیح ہونے کی وجہ سے زیادہ شائع ہوا، حجاج کے نسخے میں کل شکلیں ۴۶۸ ہیں، مگر ثابت کے نسخے میں ۱۰ شکلیں اور زیادہ ہیں، کچھ مقالے ابوعثمان دمشقی نے بھی ترجمے کئے، عبداللطیف طبیب نے جو رومی نسخہ دیکھا، اس میں چالیس شکلیں اور زائد تھیں، جن کا اس نے ترجمہ کرنا چاہا تھا، علمائے اسلام نے نہایت کثرت سے اقلیدس پر شرحیں اور حواشی لکھے، مثلاً یزیدی، جوہری، ہامانی، ابوحفص الحرث الخراسانی، ابوالوفاء بوزجانی، ابوالقاسم انطاکی، احمد بن محمد الکرابیسی، ابویوسف الرازی، قاضی ابومحمد عبدالباقی البغدادی المشہور بہ قاضی بیمارستان (ہسپتال) ابوعلی الحسن بن الحسین بن الہیثم البصری، ابوجعفر خازن اہوازی، ابوداؤد سلیمان بن عقبہ، محقق طوسی، ہامانی نے صرف پانچویں مقالے کا ترجمہ کیا اور ابویوسف رازی نے صرف دسویں مقالہ کا قاضی عبدالباقی کی شرح نہایت بسیط ہے، اس نے اشکال کی مثالیں عدد سے بھی دی ہیں،

ابن ہثیم نے اس کے مصادرات کی شرح لکھی اور ایک کتاب اس پر اعتراض و جواب کی لکھی، جو ابوجعفر خازن واہوازی کی شرح صرف دسویں مقالے پر ہے، ثابت بن قرہ نے ان علل کی تشریح کی جن پر اقلیدس نے شکلوں کی ترتیب رکھی ہے، اس کتاب کی بہت سی اصلاحیں بھی ہوئیں، جن کو تحریر کا لقب ملا، مثلاً تحریر تقی الدین، اس تحریر کا نام تہذیب الاصول ہے اور تحریر محقق طوسی جو نہایت عمدہ تر اور شائع ہے اور اسی وجہ سے بہت سے علماء نے اس پر حواشی لکھے جن میں سے علامہ سید شریف قاضی زادہ رومی نامور ہیں۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
المعطیات	اقلیدس	اسحاق	اسحاق نے عربی میں ترجمہ کیا، ثابت نے اصلاح کی، علامہ طوسی نے تحریر کی، ۹۵ شکلوں میں ہے۔
المناظر	//	//	۶۴ شکلوں میں ہے، علامہ طوسی نے اس کی تحریر کی۔
ظاہرات الفلک	//	//	۲۳ شکلیں ہیں، نصیرالدین طوسی نے تحریر کی، تبریزی نے اس کی شرح لکھی۔
کناش	ہرون القیس	ماسرجویہ	یہ حکیم ماسرجویہ بصرہ کا رہنے والا اور یہودی المذہب تھا، مروان کے زمانہ میں (غالبًا اس کی فرمایش سے) یہ ترجمہ اس نے عربی میں کیا۔
کتاب الجبر والمقابلہ	ایوقسطیوس	//	محمد بن محمد یحییٰ ابن ابی البقاء البوزجانی نے جو ۳۴۸ھ میں موجود تھا، اس کتاب کی تفسیر کی (مختصر)
المطالع	بسقلاوس	قسطا بن لوقا بعلبکی	کندی نے اصلاح کی اور علامہ طوسی نے تحریر کی، ۳ مقدمے اور ۲ شکلوں پر مشتمل ہے۔
المنی	افلاطون		موفق الدین نے اس کو مختصر کیا اور ترتیب دی،

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
الفلاحة الرومية	قسطوس بن اسکور السکینه	سرحس بن ہلیا	اس نے پہلا ترجمہ رومی سے عربی زبان میں کیا...... .... پھر قسطا بن لوقا بعلبکی، ابوزکریا بن یحییٰ بن عدی اسطاس نے عربی میں الگ الگ ترجمے کیے، فارسی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا جس کا نام ورزنامہ ہے۔
الکرۃ المتحرکہ	اوطولوقس	ثابت	ثابت نے اصلاح کی اور محقق طوسی نے تحریر کی، ایک مقالہ اور بارہ شکلیں ہیں۔
کتاب اللیل والنہار	ثاودسیوس		دو مقالے ہیں اور ۳۳ شکلیں، علامہ طوسی نے تحریر کی۔
کتاب(۱) المساکن	״	قسطا بن لوقا	۱۲ شکلیں ہیں، علامہ طوسی نے تحریر کی۔
کتاب الحشائش	ویسقوریدس	اصطفن بن بسیل	اس کتاب میں نباتات کی تصویریں یونانی قدیم حرفوں میں بنی ہوئی تھیں۔
کتاب السموم	باربوقا نبطی من اہل بروسایہ	ابوبکر احمد	یہ کتاب نبطی زبان میں تھی، ابوبکر احمد بن علی المعروف با بن وحشیہ نے عربی میں ترجمہ کیا۔
کتاب الادویہ	ویسقوریدس		۵ مقالے ہیں، ابن بیطار شیخ عبداللہ بن احمد مالقی نے اس کی تفسیر کی۔
کتاب تسطیح الکرہ	بطلیموس جالینوس		ابوجعفر احمد بن محمد الطیب المتوفی ۳۶۰ھ نے اس کی شرح لکھی جو کہ رجب ۳۴۲ھ میں تمام ہوئی۔

(۱) اس کتاب کا ترجمہ میں نے خود دیکھا ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب القویٰ الطبعیہ	جالینوس	حنین بن اسحٰق	۳ مقالوں میں ہے۔ ابوجعفر احمد بن محمد الطبیب نے اس پر شرح لکھی۔
کتاب الحمیات	,,		
کتاب الکرۃ والاسطوانۃ	ارشمیدس مصری		ثابت بن قرہ نے اصلاح کی، مگر چونکہ اصل ترجمہ خراب تھا، اصلاح میں بھی بعض مصادرات چھوٹ گئے، اوطوقیولس عسقلانی نے اس کے مشکلات کی شرح لکھی جس کا ترجمہ عربی میں اسحاق بن حنین نے کیا، علامہ طوسی نے اس کی تحریر کی، ثابت کے نسخے میں اس کی ۴۸ شکلیں ہیں اور اسحاق کے نسخے میں صرف ۴۳۔
الماخوذات فی الاصول	,,	ثابت بن قرہ	ابوالحسن علی بن احمد النسوی نے اس کی تفسیر کی، ۱۵ شکلیں ہیں، علامہ طوسی نے اصلاح کی، ابوسہل نے بھی کچھ اس کی اصلاح کی، جس کا نام تزئین کتاب ارشمیدس ہے۔
المخروطات فی احوال الخطوط المنحنیہ	ابلینوس النجار	احمد بن موسیٰ الحمصی ثابت ابن قرہ	مامون رشید نے روم سے جو کتابیں منگوا کر ترجمہ کرائیں، ان میں اس کا بھی ترجمہ ہوا، یہ سات مقالوں میں تھی مگر مقدمے کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اصل کتاب آٹھ مقالوں میں ہے اور اس آٹھویں مقالہ میں سب پہلے مقالوں کے مطالب

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			مع فوائد دیگر موجود ہیں، لیکن آٹھویں مقالے کا باوجود تلاش کے پتہ نہ لگا، ابوموسیٰ شاکر کا بیان ہے کہ اب جس قدر یہ کتاب موجود ہے اس میں سات مقالے اور کچھ حصہ آٹھویں کا موجود ہے، جس میں کہ صرف چار شکلیں ہیں، چار پہلے مقالوں کا ترجمہ احمد بن موسیٰ نے کیا اور تین پچھلے مقالوں کا ترجمہ ثابت بن قرہ نے جس کو کہ حسن واحمد (دونوں ابن موسیٰ بن شاکر) نے اصلاح کر کے درست کیا، اہل یورپ نے اس کتاب کو صرف مشرقی ترجموں کے ذریعہ سے پایا، کیونکہ اس کی اصل بالکل جاتی رہی، (گبن رومن امپائر)
نسبۃ الجذور	ابلینوس النجار		دو مقالوں میں ہے، پہلے مقالے کے ترجمہ کی تو ثابت نے اصلاح کی مگر دوسرے مقالے کا ترجمہ بے معنی ہے۔
مابعدالطبیعۃ	ثاوفرویطوس	یحییٰ بن عدی	یہ مصنف ارسطو کا برادر زادہ تھا، اصل کتاب سریانی میں تھی (مختصر الدول)
کتاب الحس والمحسوس	//	ابراہیم بن تکوین	(از مختصر الدول)

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
اسباب النبات	ثاوفرویطوس ینقلاوس	ابراہیم بن تکوین	(مختصر الدول)
کتاب من حمل		حنین	حنین نے پوری کتاب کا ترجمہ سریانی میں کیا۔
فلسفہ ارسطو	برقلس		(مختصر الدول)
ثالوجیا	ارسطیقوس	ابوعثمان دمشقی	
الحدود	یونانی	ابوالوفاء	ابوالوفا محمد بن محمد محاسب نے ترجمہ کیا اور اصلاح کی پھر اس پر شرح لکھی جس میں دلائل ہندسی قائم کئے۔

مجسطی

اس کتاب کے ۳ ترجمے نہایت مقبول اور مشہور ہوئے، پہلا حجاج بن مطر کا، دوسرا اسحاق کا، جس کو ثابت نے صحیح کیا، تیسرا خود ثابت کا، اول اس کا ترجمہ یحیٰی بن خالد برمکی کے لیے کیا گیا، جس کی بہت سے لوگوں نے تعلیقات اور تفسیریں لکھیں، مگر وہ سب ترجمے اور تفسیریں مبہم اور مجمل تھیں، ابوحسان وسلمان نے جن کو بیت الحکمۃ کا اہتمام سپرد تھا، ان ترجموں کی خوب توضیح وتصحیح کی، چونکہ مامون رشید کو اس کتاب کے ساتھ نہایت شیفتگی تھی، تو اس کی فرمایش سے حنین بن اسحاق نے بھی ترجمہ کیا، اور حجاج بن یوسف و ثابت بن قرہ نے زوائد سے پاک کر کے خلاصہ لکھا، ابوالریحان بیرونی نے اس کا اختصار کیا، اور عمرو بن فرخان وابراہیم بن الصلّت وفضل ابن حاتم و شمس الدین سمرقندی نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری و دیگر علما نے شرحیں لکھیں، شیخ یحیٰی بن محمد بن ابی الشکر المغربی الاندلسی نے مجسطی کا ملخص ملطیہ کے پوپ ابوالفرج غریفورس بن ہارون کے اشارے سے لکھا۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
فصول بقراط	بقراط	ابوعثمان سعید ابن یعقوب	یہ مترجم نہایت نامور حکیم اور مقتدر باللہ کے وزیر کا خاص طبیب تھا۔
نموذار فی الاعمار	کنکہہ ہندی		یہ حکیم ہندوستان کا رہنے والا ہارون الرشید کے دربار میں داخل تھا اور علاوہ طبابت کے ترجمے کا کام بھی اس کے متعلق تھا، الفنسٹن نے تاریخ ہند میں اس کا نام منکا لکھا ہے۔
واسرار المواليد	//		
والقرآنات الکبیر	//		
والقرآنات الصغیر	//		
کتاب حساب العدد			یہ کتاب سنسکرت زبان میں تھی، جس کی توضیح وتفسیر ابوجعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے کی۔
	ہرمس بود		(جامع القصص العربیہ)
رسالۃ السر فی الکیمیا	شیر قسطانس بن ارامسیس		یہ رسالہ اخمیم مصر میں ایک قبہ میں پایا گیا، اس قبہ میں ایک عورت کی ممی تھی اور اس کے بال پاؤں تک لٹک رہے تھے، سات نہایت عمدہ حلّے اس کے بدن پر تھے اور اس کے اردگرد چند تخت تھے، جن پر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی ممیاں تھیں، یہ رسالہ سونے کی تختی پر لکھا ہوا تھا اور اس عورت کے سر کے نیچے تھا، مامون الرشید جب مصر گیا تو اس نے اس رسالہ کا ترجمہ کرایا، جس کو ایک حمیر کے شخص نے کیا تھا۔
کلیلہ ودمنہ		عبداللہ بن المقفع	یہ کتاب ہندی زبان سے نوشیرواں کے لیے ترجمہ کی گئی پھر اس فارسی کا ترجمہ عبداللہ بن المقفع نے

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			عربی میں کیا جو کہ ابوجعفر منصور کا منشی تھا، دوسرا ترجمہ عربی میں عبداللہ ابن ہلال اہوازی نے یحییٰ ابن خالد برمکی کے لیے کیا، جو کہ ۱۶۵ھ میں تمام ہوا۔.............................. پھر سہل بن نو بخت حکیم نے یحییٰ بن خالد کے لیے نظم کیا، جس کا صلہ اس کو ایک ہزار دینار ملا، کلیلہ ودمنہ کے ڈھنگ پر سہل بن ہارون نے ایک کتاب مامون الرشید کے لیے لکھی جس میں ہر ایک باب وفصل کلیلہ دومنہ کے معارضہ کے طور پر لکھی۔
کتاب الادویہ	ویقوریدس		عبداللہ مالقی نے اس کی شرح لکھی۔
کتاب سبرک ہندی	سبرک ہندی	عبداللہ بن علی	پہلے اس کتاب کا ترجمہ فارسی میں ہوا، پھر عبداللہ ابن علی نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔
کتاب الطلوع والغروب	اوطولوقس		ثابت بن قرہ نے اصلاح کی اور محقق طوسی نے تحریر، دو مقالے ہیں اور ۳۶ شکلیں۔
کتاب السموم	شاناق ہندی	ابوحاتم بلخی	یحییٰ بن خالد برمکی کے حکم سے منکہ ہندی نے باعانت ابوحاتم بلخی فارسی میں ترجمہ کیا، پھر مامون الرشید کے حکم سے علی بن العباس بن احمد نے عربی میں نقل کیا۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
الاکر المتحرکہ	اوطوقولس		مامون الرشید کے عہد میں ترجمہ ہوا اور یعقوب کندی نے اصلاح کی۔
اُکر	ثاوذوسیوس	قسطا بن لوقا	یہ کتاب تین مقالوں میں ہے، ثابت بن قرہ نے اصلاح کی اور محقق طوسی وتقی الدین الراصد نے تحریر کی۔
اکر	مانالاؤس		اس کتاب کے بہت سے ترجمہ ہوئے، مبانی و ابوالفضل احمد بن سعید ہروی نے اصلاح کی اس میں تین تین مقالے ہیں۔

یہ فہرست زیادہ تر کشف الظنون سے مرتب کی گئی ہے، خاص ارسطو کی تصانیف کے متعلق کسی قدر زائد تفصیل ناسخ التواریخ جلد اول حالاتِ ارسطو سے لی گئی ہے۔

ریمارک

یہ فہرست نہایت مختصر ہے، ہم نے خود اختصار کی غرض سے بہت سے ترجموں کے نام نہیں لکھے گو عام طور پر ان مفصل واقعات سے لوگ بہت کم واقف ہیں، تاہم ترجموں کی اجمالی پر فخر تاریخ آج قوم کے ایک ایک ممبر کو معلوم ہے، انہی واقعات پر خیال کرنے سے بانیانِ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کو دھوکا ہوا اور وہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے مورثوں نے بذریعہ ترجموں کے علوم کو ترقی دی ہم بھی یورپ کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے علوم اور اپنی قوم کو ترقی کے رتبے پر پہنچائیں گے۔ مگر ان کا یہ قیاس غلط اور قیاس مع الفارق تھا، اول تو ترجموں کا اہتمام اور لاکھوں روپے کا خرچ جو خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ہوا، اب غیر ممکن ہے، دوسرے اس زمانہ میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی، جس قدر کتابیں ترجمہ کر لی گئیں، یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا، اس زمانہ میں نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہے نہ ان کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے، جن کی

تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے، تیسری بڑی غلطی اس قیاس میں یہ تھی کہ اس زمانہ میں عربی زبان جس میں ترجمے ہوئے تمام ممالک اسلامی میں حکومت کرنے والی زبان تھی، دنیا میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ قوم نے اس زبان میں علوم وفنون کو ترقی دی ہو، جو ان پر حکومت کرنے والی نہیں ہے مگر ہم کو اس بات کے معلوم کرنے سے خوشی ہے کہ خود سید احمد خاں صاحب نے جو سائنٹفک سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔(۱۹)

ایجوکیشنل کانفرنس کے اسی اجلاس کی ایک نشست میں علامہ شبلی نے ''قصیدہ عیدیہ'' پیش کیا۔ اسے بھی سامعین نے بہت پسند کیا۔ یہ قصیدہ '' مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' میں بطور ضمیمہ شائع ہوا ہے۔(۲۰) اس پر ناشر نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ

> ''قصیدہ عیدیہ: جس میں تشبیب کے موقع پر دوگانہ کی عید کی کیفیت۔ نمازیوں کا ہجوم۔ اسلامی جوش کا سماں دکھایا ہے۔ پھر گریز کے موقع پر مسلمانوں کی موجودہ عبرت انگیز حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ چونکہ مولف نے یہ قصیدہ کانگریس کے اخیر دن اجلاس میں پڑھا تھا، اور تمام حاضرین ایک عجیب اثر سے متاثر ہوئے تھے، اس لئے یہ قصیدہ بھی اس رسالے کے ساتھ شامل ہو کر چھاپا گیا۔(۲۱)

قصیدہ عیدیہ

که درد پس از شرح دادن گرمی هنگامه عید
لختے از برہے کار اسلامیان نموده آمد

۱۸۸۳ء

روز عیدست ودگر کار جہاں گشت بساز — باز شد برزخ گیتی در امید فراز
دست بیداد فلک آں ہمہ کوتاہ شدہ است — کہ دگر فتنہ نیارد کہ کند پاے دراز
خلق را باز لب از خندہ فراہم آمد — چوں گل تازہ کہ غنچہ اش نتواں کردن باز

سخن از مے چہ کنی بادہ چہ خواہی امروز   نشہ عیش ندارد بہ مے و بادہ نیاز
خواجہ از خانہ برون آئے کہ دیدن دارد   ایں ہمہ گرمی ہنگامہ وایں زینت وساز
مرد مان بیں کہ زہر ناحیہ گرد آمد اند   ہر یکے در ہنر خویش زدیگر ممتاز
ہمہ در راہ طلب گرم نفس چوں خورشید   عید گہہ کعبہ و شان دشت نوردان حجاز
مردمان بسکہ زہر گوشہ فراز آمدہ اند   نگہ از تنگی جا بار نمی باید باز
آں یکے جلوہ فروش آمدہ درخانہ زیں   واں دگر برزدہ بر ہودج زر بالش ناز
آں یک از تابش خور پردہ فروہشتہ بروی   واں دگر در کف چتر شدہ جلوہ طراز
واعظ آراستہ عمامہ و از روئے شرف   شملہ را کردہ چو سر رشتہ امید دراز
زاہد سادہ ہم از کلبہ تنہائی خویش   باکہن خرقہ خود رفت بروں بہر نماز
باہمہ شوکت و فر باہمہ تمکین وشکوہ   خلق در عید کہ آمد زرہ صدق و نیاز
نفسے چند نشستند دو زانو وانکہ   راست چوں سرو ستادند پئے ذکر و نماز
مفتی شہر ہم از جابہ امامت برخاست   باہم صدق و صفا باہمہ اخلاص ونیاز
انچہ بایست زترتیل وسکوں در قرات   ہمہ بر وجہ حسن کرد ادا آں ممتاز
پس دگر خطبہ بفرمود بآواز بلند   خطبہ چوں سخن قامت محبوب دراز
شاخ و برگ سخن افزودم و ازجا رفتم   خود نگویم کہ چو انجام پذیرفت آغاز
شور برخاست زمزدم کہ مبارک بادا   عید وایں گرمی ہنگامہ وایں زینت وساز
درسخن بود یکے کز غم دنیا رستم   دیگرے گفت علی الرغم سپہر کج باز
کودک از روئے ادب عرض نیایش می کرد   پیر گفتے صدوسی سال ترا عمر دراز
پدر از مہر بپاسخ پسر را گفتے   مرحبا ایدک اللہ بعز ممتاز
حیف کایں شور وطرب یکدونفس بیش نماند   چہ کند عید بدردے کہ بود صبر گداز
جمع اسلام چو باشد ہدف تیر بلا   خود چوکج باخت باپشاں فلک عربدہ ساز
فرق نبود بہ حقیقت زمحرم تاعید   آہ از فتنہ گری ہاے سپہر کج باز

خود هماں جمع کہ میداشت بہم تیغ وقلم　　خود هماں قوم کہ بودہ است بہرپایہ فراز
آنکہ در انجمن فضل نمی داشت همال　　آنکہ در بزم گہہ دہر نہ بودش انباز
آنکہ جاں درتن افسردۂ معنی بدمید　　آنکہ برداشتہ قفل از درگنجینہ راز
ہیئت و ہندسہ را پایہ ازوگشت بلند　　منطق وفلسفہ را داد ہم اوزیب و طراز
نظم او بنگر وانکہ سخن از سحر مگوی　　نثر او بیں و دگر قصہ مخواں از اعجاز
یاد آں رونق و بازار ہنر در بغداد　　یاد آں گرمی ہنگامہ فن در شیراز
قرطبہ آنکہ ازو کسب ہنر کرد فرنگ　　وان سلرنوکہ اطالیہ باد داشت نیاز
خود هماں جمع کہ افراخت بعیوق علم　　آنکہ بر اوج فلک سود کلہہ گوشہ ناز
آنکہ پامال خرامش چہ خراسان و چہ پارس　　آنکہ تاراج نگاہش چہ عراق و چہ حجاز
آنکہ دیلم بہ جبیں داغ سجودش برداشت　　آنکہ سلجوق بہ خاک در او کرد نماز
روم را لرزہ براندام زبانگ غضبش　　ہند را غلغلہ مقدم او زہرہ گداز
فتح را از پئے طاعت خم تیغش محراب　　بخت را بہر پرستش در او کعبہ راز
رمح او بود کہ تاج از قیصر بربود　　تیغ او بود کہ شد بادل کسریٰ ہم راز
اینک آں قوم بحالیست کہ نتواں گفتن　　خود بہ بیں تابچہ انجام رسید آں آغاز
دست ہر یک شدہ از دامن مطلب کوتاہ　　ہریکے را بہ غم و غصہ زبان گشتہ دراز
ہمہ را از ستم حادثہ خوں گشتہ جگر　　ہمہ را شیوۂ بے چارگی و عجز ونیاز
غم بداں مایہ کہ ہرگز نتواں دید تہی　　دیدہ ازاشک ودل ازغصہ وجانہازگداز
نالہ بیخواست برآید زدل خستہ ما　　شیشہ راہست بہ ہنگام شکستن آواز
ہر چہ سازیم و خود از دست کہ فریاد کنیم　　کیں جفاہا ہمہ از ماست بما آمدہ باز
ہرچہ برماست ہم ازدست سیہ کاری ماست　　گلہ نیست زبخت وفلک عربدہ ساز
زہرۂ کیست کہ ایں قصہ غم گوش کند　　داستانیست جگر خوں کن واندیشہ گداز
گردریں نظم کمیت قلم از پویہ بماند　　بال وپر ریخت اگر مرغ سخن در پرواز

عذر من نہ کہ محال ست بیک نغمہ سرود داستان غم و افسانہ محمود وایاز
شرح ایں حادثہ از شبلی دل خستہ مخواہ
شب بود کوتہ وافسانہ دراز ست و دراز (۲۲)

فارسی کے ختم ہوتے مذاق کے سبب اب قصائد وغزلیات فارسی اردو کتابوں کے درمیان آجاتے ہیں تو ہمیں گراں گذرتا ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ کل تک غیر ہماری ان زبانوں کے ادب سے لطف اندوز ہوتے تھے۔اور آج ہم خود بے بہرہ ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی[۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] (۲۳) نے ''خطبات شبلی'' کے پہلے خطبہ ''چھوٹے کم درجہ اسکولوں کا قیام'' پر یہ وضاحتی حاشیہ لکھا ہے کہ

> ''محڈن ایجوکیشن کانفرنس کے دوسرے اجلاس لکھنو،منعقدہ دسمبر ۱۸۸۷ء میں تقریر: سرسید کی اس تجویز پر کہ چھوٹے کم درجہ اسلامی اسکولوں کا قیام مسلمانوں کے لئے مضر ہے۔'' (۲۴)

اس کے بعد انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کا ایک خطبہ نقل کیا ہے۔جو دراصل سرسید احمد خاں کی کسی قرارداد کے جواب میں علامہ شبلی کی تقریر ہے،مگر اس کی تصدیق ابتک نہیں ہوسکی ہے۔وہ تقریر درج ذیل ہے:

چھوٹے کم درجہ اسکولوں کا قیام

میں اس امید پر کھڑا ہوا ہوں کہ اس بحث میں میری اسپیچ شاید سب سے پچھلی اور فیصلہ کرنے والی اسپیچ ہوگی۔

رزولیشن پر نہایت سرگرمی سے مباحثہ ہو چکا ہے مگر افسوس ہے کہ اکثر تقریریں اصل مطلب سے دور پڑ گئی ہیں۔چھوٹے چھوٹے مدارس تین حالتیں رکھتے ہیں اور ہم کو دیکھنا ہے کہ رزولیشن کا مقصد ہر ایک پر کیا جداگانہ اثر رکھتا ہے۔پہلی قسم کے وہ اسکول ہیں جن کے پہلو میں کوئی گورنمنٹ یا مشنری اسکول موجود نہیں ہے۔میں اپنے حافظہ کے اعتماد پر کہتا ہوں کہ اس قسم کے

اسکولوں کی ضرورت کوسید صاحب نے اپنی تقریر میں تسلیم کرلیا ہے۔

دوسری قسم کے دو اسکول ہیں کہ جن مقاموں میں قائم کئے گئے ہیں وہاں ان سے عمدہ تر گورنمنٹ یا مشنری اسکول موجود ہیں۔ غالباً سید صاحب کے مخالفین بھی ان اسکولوں کے قائم کرنے کے حامی نہ ہوں گے۔؟ کیوں کہ اس حالت میں گویا یہ صراحتاً اقرار کرنا ہے کہ عمدہ تعلیم گاہ کے ہوتے ہم ناقص تعلیم گاہ کو اختیار کرتے ہیں۔

تیسری قسم کے وہ اسلامی اسکول ہیں جو گورنمنٹ اور مشنری اسکولوں کے ہم پلہ ہیں۔ گو سید صاحب (۲۵) کی اصطلاح کے رو سے وہ کم رتبہ اور چھوٹے درجہ کے اسکولوں میں شامل ہیں۔ میرے نزدیک تمام بحث کا مرکز صرف یہ تیسری حالت ہے۔ اور میں بے تکلف کہتا ہوں کہ اس خاص حالت کے اعتبار سے میرا فیصلہ رزولیشن کے مخالف ہے۔

سید صاحب نے اپنی فصیح اور پر اثر اسپیچ میں ثابت کیا ہے کہ ''قوم کو تعلیم سے زیادہ قومیت کی طرف خیال دلانے کی ضرورت ہے۔'' بے شبہ ہماری کوششوں کا بڑا مقصد یہی ہونا چاہئے۔ یہی بات ہے جس کی وجہ سے ہم مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو تمام دوسرے کالجوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے بورڈنگ میں جولڑکے تعلیم پاتے ہیں، وہ اپنی جماعت کو ایک قومی جماعت کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ جب وہ کالج کا نام لیتے ہیں تو پرفخر لہجہ میں ''ہمارا کالج'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ بے شبہ ترقی کا زینہ یہی ہے کہ تعلیم ہی کے زمانہ سے جو آئندہ زندگی کی بنیاد ہے، بچوں کے دل و دماغ میں قومیت کا نشہ سرایت کر جائے۔ میرا خیال ہے کہ تیسری قسم کے اسکول اس مقصد کے لئے بہت کچھ مفید ہوں گے۔ یہ ترتیب نہایت موزوں ہوگی کہ قوم کے بچے لڑکپن سے ''ہمارا اسکول'' کہنے کی مشق بڑھائیں اور نوجوانی کے آغاز میں وہ ایک ایسے باعظمت اور وسیع کالج کے احاطہ میں پہنچ جائیں جس کو ''قومی کالج'' کے لقب یافتہ ہونے سے ان کے ابتدائی خیالات، قومیت، زیادہ قومی، پرجوش اور سرگرم ہو جائیں۔

ہم اس اصول سے کبھی درگذر کرنا نہیں چاہتے کہ ''قومی طاقت'' متفرق نہ ہونے پائے، لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہ اسکول اس مقصد میں خلل انداز نہیں ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط

ہے کہ جن رقموں سے یہ اسکول چلائے جاتے ہیں، ان میں کوئی بڑی قومی طاقت صرف ہوتی ہے یا یہ کہ ان سے کوئی دوسرا کام لیا جاسکتا ہے۔ ان اسکولوں میں آمدنی کا ایک بڑا حصہ گورنمنٹ ایڈ اور طالب علموں کی فیس سے حاصل ہوتا ہے جو کسی طرح دوسرے موقع کے لئے منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ تھوڑی سی رقم چندہ اور ڈونیشن سے حاصل کی جاتی ہے، لیکن وہ اکثر مقامی خصوصیت رکھتی ہے اور اگر یہ خصوصیت اٹھادی جائے تو شبہ ہے کہ چندہ دینے والے اپنی رقموں کو واپس لے لیں۔ یا قائم رکھیں گے۔ پس یہ خیال غلط ہے کہ ان اسکولوں کی آمدنی سے کوئی بڑی تعلیم گاہ تیار ہوسکتی ہے، یا یہ کہ اس سے قومی کالج کو امداد پہنچ سکتی ہے۔

جب یہ ثابت ہے کہ ان اسکولوں سے قومی مجتمع طاقت کو کچھ گزند نہیں پہنچتا، بلکہ بہ خلاف اس کے ایک اعتبار سے وہ قومیت پیدا کرنے کے لئے مفید آلہ ہیں تو میں ان اسکولوں کو فائدہ مند خیال کرتا ہوں نہ مضر۔ اور اگر رزولیشن کے مقصد کا ان پر کوئی مخالفانہ اثر پڑتا ہے تو میں رزولیشن کا کامیاب ہونا مطلقاً نہیں چاہتا۔''(۲۶)

بعدازاں سرسید نے اپنے رزولیشن اور موقف کی تائید وحمایت میں گفتگو کی اور کہا کہ

''میں نہایت خوش ہوں کہ اس رزولیوشن پر نہایت گرم جوشی سے بحث ہوئی، جس قدر زیادہ مخالفت ہوتی جاتی تھی اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوتی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ جو رزولیوشن پیش ہوا ہے وہ بہت صاف ہے، کسی ترمیم کی اُس میں ضرورت نہیں۔ پس اُس پر بہت زور ہو چکے ہیں، اس کے نتیجہ کے بعد اُن صاحبوں کو جو ترمیم چاہتے ہیں اختیار ہوگا کہ ترمیم شدہ صورت میں اس کو پیش کریں۔

جو خیالات کہ بعض دوستوں نے اس رزولیوشن کی نسبت ظاہر کئے جن کا کچھ بھی پتہ اُس رزولیوشن میں نہ تھا۔ میں نہایت خوش ہوں کہ وہ سب اُس قت زائل ہوگئے ہوں گے، جب میرے دوست مسٹر بیک نے اُس سے مخالفت کی جو مدرسۃ العلوم کے پرنسپل اور اس کے نہایت بڑے دوست ہیں اس کے فنڈ بڑھانے پر ہمیشہ کوشش کرتے ہیں اور بہت سا روپیہ اپنی جیب سے اُس کے فنڈ میں متعدد طرح پر دیا ہے۔ یہی حال میرے دوست مولوی محمد شبلی پروفیسر مدرسۃ العلوم

کا ہے، پس اب میرے دوستوں کو یقین ہو گیا کہ اس رز ولیوشن کو مدرسۃ العلوم سے یا اس کے فنڈ بڑھانے سے کچھ تعلق نہ تھا۔

میرے دوست اس رز ولیوشن کے مطلب کو بہت دور کھینچ کر لے گئے اس میں چھوٹے چھوٹے مدرسوں کے قائم کرنے یا نہ قائم کرنے یا موجودہ چھوٹے چھوٹے مدرسوں کو معدوم کر دینے کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کی تعلیم کے بند پانی کو حرکت میں آیا ہوا دیکھتے ہیں اُس پر یہی غور کرتے ہیں کہ اُس کی لہر کدھر جا رہی ہے۔ ان کو معلوم ہو گا کہ اس وقت ملک میں یہ ہوا چلی کہ ہر جگہ چار آدمی جمع ہوئے اور اس کا نام اسلامی انجمن رکھا اور بارہ روپے مہینے کا ایک ماسٹر مقرر کیا۔ اسکول جاری کیا اور مسلمان لوگوں کو گھیر کر اس میں داخل کیا، جس کے سبب ان لڑکوں کی عمر ضائع ہوتی ہے۔ اس رز ولیوشن کا مطلب ان لوگوں کو متنبہ کرنا تھا کہ چھوٹے چھوٹے اسکول بچوں کی انگریزی تعلیم کے لئے قائم کرنے جن میں نہ لائق ماسٹر ہوتے ہیں، نہ عمدہ تعلیم۔ مسلمان بچوں کی تعلیم میں نقصان پہنچانے والے اور مسلمانوں کی مجموعی قوت کو متفرق کرنے والے ہیں، اس کا عکس بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ان کے لئے لائق ماسٹر اور عمدہ تعلیم ہونی چاہئے۔ اگر میرے دوست اس سے مخالف ہیں بہتر۔ مگر افسوس ہے کہ میں ان کے ساتھ متفق نہیں ہوتا۔ کوئی قوت جو متفرق ہو گئی ہے اور جس نے چھوٹے چھوٹے اسکول ناقص تعلیم کے اور بچوں کو نقصان پہنچانے والے پیدا کر دیئے ہیں یکجا جمع ہو جاوے تو ضرور نقص رفع ہو جائے گا۔

رہی یہ بات کہ چھوٹے اسکولوں کے جو ہائی اسکول سے کم درجہ کے ہیں جا بجا قائم کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یہ جداگانہ بحث ہے۔ اس رز ولیوشن سے اس کو تعلق نہ تھا، مگر درحقیقت میری رائے میں اس قسم کے اسکولوں کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس درجہ تک کی تعلیم حاصل کرنے کو ہمارے لئے کافی وسیلے موجود ہیں، اگر اس خاص امر پر بحث ہو گی تو میں اس کے لئے موجود ہوں۔ مگر اس رز ولیوشن کے ساتھ خلط مبحث کرنا نہیں چاہتا۔ بیشک میری رائے ہے کہ قوم کو ہائی ایجوکیشن پر توجہ کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

بلاشبہ میری رائے ہے کہ ایسے اسکول جو انٹرنس تک پڑھاتے ہیں یا پڑھانا چاہتے ہیں اور

جس میں ہیڈ ماسٹر ایک یورپین جنٹلمین نہیں ہے، بہت ناقص اسکول ہے اور طالب علموں کو ناقص رکھتے ہیں، خواہ وہ اسکول گورنمنٹ کے ہوں یا مشنریوں کے یا پرائیویٹ لوگوں کے۔ اگر ہماری قوم ایسے اسکول جاری کرنا چاہتی ہے تو ایسی تدبیر کرے کہ یورپین ہیڈ ماسٹر اس میں ہو اور سمجھ لے کہ بارہ سو روپے خرچ کرنا ہوگا۔

جو کالج ایسا ہو جس میں کم از کم تین یورپین پروفیسر نہ ہوں، وہ بھی طالب علموں کو ان کی اعلیٰ لیاقت کو ناقص رکھنے والا ہے۔ پس اگر ہماری قوم کوئی کالج قائم کرنا منظور کرے تو ضرور ایسا کالج قائم کرے جو قوم کو نقصان نہ پہنچائے تا کہ ہماری قوم کے نوجوان عمدہ تعلیم گاہ کو چھوڑ کر ناقص تعلیم میں مبتلا نہ ہوں۔

جو مقصد میرا اس رزولیوشن کے پیش کرنے سے تھا، وہ مخالفت سے زیادہ تر حاصل ہو گیا ہے۔ اور آیندہ ہر ایک امر پر لوگوں کو غور کرنے کا موقع ملے گا۔ میں خوش ہوں کہ اس پر ووٹ لیا جاوے اور کثرت رائے سے نامنظور ہو مگر جب لوگ غور کریں گے تو سمجھیں گے کہ انھوں نے کیا کیا۔ اگر یہ رزولیوشن پاس نہ ہو جیسا کہ توقع ہے تو لوگوں کی ہمت قوم کو ہائی ایجوکیشن تک پہنچانے میں بالکل پست ہو جاوے گی اور قوم کو شدید نقصان پہنچے گا، مگر مجھ کو امید ہے جو گرم جوشی خارجی خیالات نے اس وقت اس رزولیوشن کے برخلاف پیدا کر دی ہے وہ بہت جلد ٹھنڈی ہو جاوے گی اور ہماری قوم کے بزرگ، قوم کو ہائی ایجوکیشن تک پہنچانے میں سرگرم ہوں گے۔ (۲۷)

اس کے بعد دوسرے اجلاس ہوئے اور دیگر شرکاء نے حصہ لیا۔ اس اجلاس میں درج ذیل باتیں طے پائیں:

۱۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مسلمان طلبہ کو وظائف دئے جانے کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ الہ آباد یونیورسٹی قائم ہونے پر اظہار اطمینان کیا گیا۔

۳۔ حفظ قرآن کی طرف مزید توجہ کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں تعداد میں اضافہ کی طرف بھی زور دیا گیا۔

۴۔ طے کیا گیا کہ اوقاف کے روپئے کو انگریزی اور جدید تعلیم پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔مقامی تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔(۲۸)

تعلیقات و حواشی:

(۱) منشی امتیاز علی کاکوروی[۱۸۳۵-۱۸۹۶ء] قصبہ کاکوری کے چشم و چراغ تھے۔باندہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد ملازم تھے۔باندہ ہی میں تحصیل علم کیا۔فارسی انشاء مرزا غالب سے اور نظم مولانا غلام امام سے سیکھی۔تحصیل علم کے بعد وہیں ملازمت بھی کی۔بعدازاں باندہ کو خیر باد کہہ کر لکھنوآ گئے اور یہاں قانون کی تعلیم حاصل کر کے وکالت کرنے لگے۔انہیں قانون میں بڑی مہارت حاصل تھی۔سید محمود انہیں سراپا قانون کہا کرتے تھے۔اس میں انہیں بڑی شہرت اور نیک نامی ملی اوران کا شمار نامور وکلا میں ہوا۔وہ تعلقہ داران اودھ کی تنظیم کے مشیر بھی رہے۔بعد میں وزیر ہوکر بھوپال چلے گئے۔اور وہاں بھی انہوں نے بڑے ترقیاتی کام انجام دئے۔علامہ شبلی سے کسی تعلق کا ذکر نہیں ملا۔

منشی جی بڑے مخیرّ،سخی اور فیاض تھے۔ان سے نہ صرف انفرادی بلکہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں اور تنظیموں کو بھی بڑا فائدہ پہنچا اور انہوں نے ان کی بڑی مدد کی۔وہ اگر چہ قدیم تعلیم سے آراستہ تھے لیکن جدید تعلیم کے بڑے ہم نوا تھے۔سرسید سے دیرینہ مراسم تھے۔سرسید اپنے جن دوستوں سے بلا پوچھے ان کے چندے لکھ لیا کرتے تھے ان میں منشی امتیاز علی کاکوروی سرفہرست تھے۔انہوں نے مولوی فتح محمد صاحب سے خلاصۃ التفاسیر پانچ جلدوں میں لکھوائی اور ہزاروں خرچ کر کے طبع کرایا اور مفت تقسیم کیا۔ ۱۸۹۶ء میں لکھنو میں وفات پائی۔

(۲) علامہ شبلی کے منجھلے بھائی محمد اسحاق[م:۱۲؍اگست ۱۹۱۴ء] الہ آباد ہائی کورٹ کے نامور وکیل تھے۔ابتدائی تعلیم کے بعد ویلزلی اسکول اعظم گڑھ میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔بعدازاں اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم اے او کالج علی گڑھ گئے اور وہاں سے قانون کی تعلیم حاصل کر کے الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔اور نہایت کامیاب وکیل ثابت ہوئے۔

وہ علامہ شبلی کے قائم کردہ نیشنل اسکول کے نائب سکریٹری تھے۔آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے۔اپنے والد شیخ حبیب اللہ کی طرح رفاہی کاموں میں

بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ خطہ مشرق میں تعلیم عام کرنے کی غرض سے وہ اعظم گڑھ کے قصبات میں نیشنل اسکول کی طرح اسکول قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی جیب خاص سے ایک رقم بھی مختص کرلی مگر اچانک انتقال سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ اور اعظم گڑھ کو وہ جن بلندیوں پر پہنچانا چاہتے تھے ان کا وہ خواب ادھورا رہ گیا۔ علامہ شبلی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ گھر اور زمینداری کی دیکھ بھال کا تمام تر ذمہ انہیں کے سر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے غم انتقال کو وہ برداشت نہ کر سکے اور علامہ شبلی خود بھی بقول شخصے اسی غم میں جنت سدھارے۔

محمد اسحاق وکیل کا علامہ شبلی نے جو پردرد مرثیہ لکھا ہے، وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ علامہ شبلی نے اور مقامات پر بھی ان کا ذکر کیا ہے، مگر مرثیہ کے ایک ایک شعر سے ان کے انتہائی رنج وغم کا اظہار ہوتا ہے۔ مرثیہ کے دو بند ملاحظہ ہوں:

تازہ تھا دل پہ مرے مہدی مرحوم کا داغ
کہ مرا قوت بازو تھا مرا چشم و چراغ
اس کو جنت میں جو خالق نے دیا گنج فراغ
میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تر و تازہ ہے یہ باغ
یعنی وہ آئینہ خوبی اخلاق تو ہے
اٹھ گیا مہدی مرحوم تو اسحاق تو ہے
آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا
میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراق پریشاں بھی گیا
عتبہ والد مرحوم کا درباں بھی گیا
گلہ خوبی تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

(۳) مشہور مزاحیہ شاعر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی: سید اکبر حسین، اکبر الہ آبادی [۱۸۴۶-۱۹۲۱ء]

اردو میں طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے باوا آدم شبلی کے بڑے پرستار تھے۔ فرماتے ہیں:

واہ !کیا بات ہے تیری شبلی
نثر میں بھی ادائے غالب لی

اڈیٹر بول اٹھے دیکھ کر شبلی کے فوٹوکو
اسی کے دم سے اب زندہ ہے مشرق کا کتب خانہ

علامہ شبلی کی الہ آباد آمد ورفت رہتی تھی۔ یہاں کا ایک دلچسپ واقعہ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

''میر اکبر حسین صاحب قافیوں کے بادشاہ تھے۔الہ آباد میں ایک دفعہ مولانا [شبلی] نے کہا کہ میر صاحب میں آپ کی تلاش قافیہ کا جب قائل ہوں گا، جب آپ میرے نام کا قافیہ باندھیں۔میر صاحب نے ہنس کر فرمایا'' دیکھئے میں آپ کو بھی باندھتا ہوں''۔بات ہنسی میں ختم ہوگئی۔ایک- دو روز کے بعد میر صاحب نے ۲۳/نومبر ۱۹۰۷ء کو دعوت کا ایک منظوم رقعہ ان کے پاس بھیجا۔

یہ وہی منظوم رقعہ ہے۔علامہ شبلی نے بھی اس کا منظوم جواب بھیجا:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال — لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف وکرم کا مجھے انکار نہیں — حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا — اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگر نہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

[حیات شبلی ص۴۷۳، طبع جدید]

(۴) مکاتیب شبلی ج ا ص ۳۴-۳۵

(۵) مولوی عبدالرزاق کانپوری [۱۸۶۲-۱۹۴۸ء] کانپور کے رہنے والے تھے۔تحصیل کے بعد کانپور

میونسپلٹی میں ملازمت کر لی۔ وہیں منشی رحمت اللہ رعد سے تعلقات قائم ہوئے اور انہی کے ذریعہ وہ مولانا سید عبدالحی حسنی اور علامہ شبلی نعمانی تک پہنچے۔ علامہ شبلی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان سے ملاقات کے لئے علی گڑھ جاتے۔ وہ کان پور آتے تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ علامہ شبلی نے سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام تیار کیا اور المامون اور الفاروق لکھی تو ان سے متاثر ہو کر انہوں نے سلسلہ وزرائے اسلام شروع کیا اور البرامکہ اور نظام الملک طوسی سپرد قلم کی۔ البرامکہ کا انتساب بھی علامہ شبلی کے نام ہے۔

علامہ شبلی جب ندوہ آ گئے تو یہاں بھی آمد و رفت رہی۔ البتہ علامہ شبلی وفات کے بعد جب انہوں نے اپنی کتاب یادِ ایام لکھی تو اس میں علامہ شبلی سے متعلق افسانے لکھے۔ آخر میں بھوپال چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۸رفروری ۱۹۴۸ء کو وفات پائی اور بھوپال ہی کی خاک کے سپرد ہوئے۔

(یادرفتگاں ص ۳۵۷-۳۶۱)

(۶) مسٹر تھیوڈر بیک: محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے پرنسپل تھے۔ ۱۸۹۹ء میں کم عمری میں انتقال کیا۔ یہ وہی بیک صاحب ہیں جن کے عہد پرنسپلی میں علامہ حمیدالدین فراہی کالج میں عربی و فارسی مضامین کے استثناء کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور انہیں بیک صاحب کو سر سید احمد خاں کی یہ بات ناگوار گذری تھی کہ یہ ایک ایسے طالب علم ہیں جن کی صلاحیت اساتذہ کے ہم پلہ ہے۔ اسی موقع پر علامہ شبلی نے مسٹر بیک سے کہا تھا کہ میرے لئے تو یہ فخر کی بات ہے کیونکہ سرسید کے یہ ممدوح عربی و فارسی دونوں زبانوں میں میرے شاگرد ہیں۔ علامہ شبلی ان کی ماتحتی میں علی گڑھ میں پروفیسر رہے۔ مگر ان کو اور دوسرے انگریز اساتذہ کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ یہ سرسید کو غلط سلط مشورے دیتے ہیں۔

(۷) خان بہادر راجہ تصدق رسول: اودھ کے تعلقہ جہانگیر آباد کے تعلقہ دار تھے۔ بڑے بااثر، مخیّر اور دینی کاموں میں صرف کرنے والے تھے۔ جدید تعلیم کے حامی اور سرسید کے ہم نوا تھے۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔

(۸) چودھری نصرت علی خاں، سکریٹری انجمن تعلقہ داران اودھ۔

(۹) عبدالرزاق کان پوری، یادِ ایام ص ۴۸-۴۹

(۱۰) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ص ۱

(۱۱) حیات شبلی ص ۱۷۱

(۱۲) سید صباح الدین عبدالرحمٰن [۱۹۱۱ - ۱۹۸۷ء] دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے سابق ناظم اور ہندوستان کے نامور مورخ و مصنف تھے۔ دیسنہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد پٹنہ کالج سے فارسی و انگریزی میں ایم اے کیا۔ سید سلیمان ندوی نے انہیں دارالمصنّفین کا رفیق منتخب کیا۔ چنانچہ وہ مدۃ العمر اس سے وابستہ رہے۔ رفیق کی حیثیت سے انہوں نے متعدد گراں مایہ کتابیں سپرد قلم کیں اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات کے بعد نظامت ملی تو انہوں نے نظامت اور معارف کی کی شاندار ادارت کی اور آخری سانس تک ادارے کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۸ رنومبر ۱۹۸۷ء کو لکھنو میں ایک حادثہ میں وفات پائی اور دارالمصنّفین میں علامہ شبلی کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔

(۱۳) مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص ۱۵

(۱۴) خطوط سر سید ص ۱۳۶

(۱۵) حیات شبلی ص ۱۷۱

(۱۶) ماہنامہ دلگداز لکھنو اگست ۱۸۸۸ء بحوالہ حیات شبلی ص ۱۷۱

(۱۷) جرجی زیدان: مشہور عیسائی مورخ و مصنف اور مجلّہ الہلال مصر کا ایڈیٹر جس نے پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ ''تاریخ التمدن الاسلامی'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں اس نے بظاہر اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھی ہے، لیکن درحقیقت اس نے مسلمانو کی تحقیر کی ہے۔ اس کی آڑ میں اس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو مطعون کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی نے اس کی تردید میں ایک کتاب الانتقاد لکھی۔ ناچیز نے الانتقاد کا آثار شبلی میں [ص ۲۸۱] تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

(۱۸) تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۳-۴، مطبوعہ الہلال مصر ۱۹۰۴ء

(۱۹) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، مطبوعہ قومی پریس لکھنو، ۱۸۸۸ء

(۲۰) ضمیمہ، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، مطبوعہ قومی پریس لکھنو، ۱۸۸۸ء، ص ۸۱

(۲۱) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ص ۸۱

(۲۲) کلیات شبلی فارسی ص ۱-۳

(۲۳) مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۲-۱۹۵۶] اردو کے نامور ادیب و انشا پرداز اور محقق و مصنف تھے۔ اعظم گڑھ کے ایک موضع علاء الدین پٹی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے خسر مولوی عبداللہ چاند پاروی سے حاصل کی۔ کان پور اور آگرہ میں تحصیل علم کے بعد ندوہ پہنچے اور وہیں تکمیل کی۔ پہلے ماہنامہ الندوہ کے نائب مدیر رہے پھر الہلال کلکتہ کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء میں دارالمصنّفین قائم ہوا تو اس سے وابستہ ہو گئے پھر مدۃ العمر کسی اور طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

وہ علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ بلکہ انہیں جن لوگوں پر ناز تھا ان میں ایک مولانا عبدالسلام ندوی بھی تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی اردو کے ایک بڑے مصنف تھے۔ علم و ادب کے مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں سپرد قلم کیں۔ ان میں اسوۂ صحابہؓ و صحابیاتؓ، امام رازی، ابن خلدون، اقبال کامل، فقرائے اسلام، تاریخ الحرمین شریفین، شعر الہند، حکمائے اسلام، تاریخ فقہ اسلامی، سیرت عمر بن عبدالعزیز وغیرہ بے حد اہم کتابیں ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے اور شمیم تخلص کرتے تھے۔ دارالمصنّفین ہی میں وفات پائی اور اسی کے احاطہ میں مدفون ہیں۔

(۲۴) خطبات شبلی ص ۸

(۲۵) سید صاحب: سید صاحب سے مراد بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ سر سید احمد خاں ہیں۔

(۲۶) خطبات شبلی ص ۸-۱۰

(۲۷) مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سر سید احمد خاں، ص ۳۴۰-۳۴۱

(۲۸) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال ص ۲۷

○○○

تیسرا اجلاس۔لاہور

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تیسرا سالانہ اجلاس لاہور میں سردار محمد حیات خاں (۱) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ۲۷ تا ۲۹ ؍دسمبر ۱۸۸۸ء تین دن تک یہ مجلس آراستہ رہی۔ اس اجلاس میں علامہ شبلی نعمانی شریک نہیں ہو سکے تھے۔ مگر ایم اے او کالج علی گڑھ کے ایک طالب علم یاقوت خاں نے مختصر سی تقریر کے بعد علامہ شبلی کا یہ قصیدہ پیش کیا:

اردو قصیدہ

بزم احباب ہے پر جوش ہے جلسا کیسا — جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا
صفحہ عیش کی سطریں ہیں برابر دیکھو — حسن و خوبی سے یہ مجمع ہے صف آرا کیسا
نوجواں جمع ہیں یا عیش کی تصویریں ہیں — ہم نے اس بزم کا کھینچا ہے سراپا کیسا
صف بہ صف لوگ ہیں اور صدر ہیں وہ سید پاک — دیکھ اس لوح پہ کھلتا ہے یہ طغرا کیسا
جوش کی آتی ہیں ہر سو سے صدائیں کیسی — گونج اٹھا زمزمہ عیش سے خیما کیسا
آئیں اس بزم میں اور قوم کا ڈنگل دیکھیں — کہتے ہیں جو کہ یہ ہوتا ہے تماشا کیسا
ہاں ترقی کے لئے پھر جو کمر بستہ ہم — وہ کریں گے جو کیا کرتے تھے دعویٰ کیسا
اپنے ہی ہاتھ میں ہے عقدہ کشائی اپنی — کیا زمانہ کا گلہ چرخ کا شکوا کیسا
دیکھنا آپ کھڑے ہوں گے ہم اپنے بل پر — غیر سے چارہ نوازی کا تقاضا کیسا
قوم کی رگ میں ہے ابتک وہی اسلاف کا خوں — ہو کے پژمردہ بھی ہے یہ گل رعنا کیسا

اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر ہیں پنہاں　　اب بھی اک فتنہ ہے یہ شاہدِ زیبا کیسا
دیکھنا ذرے کا چمکے گا ستارہ اک دن　　دیکھنا قطرہ یہ بن جاتا ہے دریا کیسا
تم بھی سن لوگے حریفو کبھی انشاء اللہ　　قافلہ قوم کا منزل پہ وہ پہنچا کیسا
ہم ہی وہ سیل بلا تھے کہ عرب سے جو بڑھے　　آگیا رو میں یہ سب عرصہ دنیا کیسا
ہم الٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں　　ہم سے پرشور تھا یہ گنبد مینا کیسا
سب کو ہے یاد کہ تاتار سے لے کر تا روم　　ہم نے پامال کیا عرصہ ہیجا کیسا
سب کو ہے یاد کہ اٹلی کے افق پر ہم نے　　فتح و نصرت کا اڑایا تھا پھریرا کیسا
دیکھنا تم کو جو یورپ میں ہمارا ہو جلال　　پوچھو اسپین سے تھا قلعہ حمرا کیسا
ذکر آتا ہے ترقی کا تو آنکھوں میں وہیں　　صاف پھر جاتا ہے بغداد کا نقشا کیسا
کچھ فقط تیغ وسناں ہی میں نہ تھے ہم مشہور　　ہم نے ہر فن میں دکھایا ید بیضا کیسا
روشنی علم کی پھیلائی تھی ہم نے پہلے　　ورنہ چھایا تھا زمانے میں اندھیرا کیسا
اب بھی اسلاف کے موجود ہیں جوہر ہم میں　　دیکھنا جوش میں آتا ہے یہ دریا کیسا
ہاں کمربستہ ہو، اے قوم ترقی کے لئے　　آج کے کام میں اندیشہ فردا کیسا
نوجوانوں یہ زمانے کو دکھا دینا ہے　　اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا
قوم کے تازہ نہالان چمن ہو تم لوگ　　دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخل تمنا کیسا(۲)

سید الطاف علی بریلوی[۱۹۰۵-۱۹۸۶ء](۳) نے لکھا ہے کہ کانفرنس کے پہلے اجلاس علی گڑھ ۱۸۸۶ء منعقدہ بصدارت مولوی سمیع اللہ خاں[۱۸۳۴-۱۹۰۸ء]اور دوسرے اجلاس لکھنو ۱۸۸۷ء منعقدہ بصدارت منشی امتیاز علی کاکوروی میں کوئی نظم نہیں پڑھی گئی۔(۴) لیکن دوسرے اجلاس میں علامہ شبلی نے ''قصیدہ عیدیہ'' سنایا تھا۔اور یہی وجہ ہے کہ رسالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' کے پہلے ایڈیشن میں جو ۱۸۸۸ء میں قومی پریس لکھنو سے شائع ہوا ہے اس میں ''قصیدہ عیدیہ'' بطور ضمیمہ شامل ہے۔(۵)

تعلیقات وحواشی:

(۱) خان بہادر سردار محمد حیات خاں واہ ضلع راول پنڈی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لئے انہیں بڑے بڑے عہدے ملے۔ سرسید نے جب جدید تعلیم کی تحریک شروع کی تو یہ ان کے سچے ہم نوا ہو گئے۔ اور دل وجان سے ان کا ساتھ دیا۔ ۱۸۸۲ء میں سرسید جب پنجاب گئے تو یہی میزبان تھے۔ سردار صاحب اس وقت گورداس پور میں مجسٹریٹ تھے۔ سرسید کا زندہ دلان پنجاب نے بڑا والہانہ استقبال کیا اور بڑی خاطر مدارات کی۔ سرسید کا سفرنامہ پنجاب جس پر علامہ شبلی نے پیش لفظ لکھا ہے پڑھنے سے وہاں کے حالات سے پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ پہلی بار پنجابی خواتین نے بھی سرسید کو سپاس نامہ پیش کیا۔ سرسید سے اخلاص کے سبب اور اس نقطہ نظر کے حامل افراد کی کمی کی وجہ سے سردار محمد حیات خاں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ۱۸۸۸ء، ۱۸۸۹ء، اور ۱۸۹۰ء تین اجلاسوں کی صدارت کی اور جدید تعلیم اور نئے خیالات پر خطبے دئے۔ ان کی تاریخ پیدائش ووفات معلوم نہ ہو سکی۔

(۲) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص ۳۸-۳۹

(۳) سید الطاف علی بریلوی [۱۹۰۵-۱۹۸۶ء] سابق مدیر ماہنامہ العلم ماہر تعلیم تھے۔ بریلی اتر پردیش میں پیدا ہوئے تحصیل علم کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بطور آفس سکریٹری وابستہ ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر گئے اور کراچی میں ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ قائم کی۔ اس کے زیر اہتمام سرسید گرلز کالج کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ایک علمی و تعلیمی رسالہ العلم جاری کیا جو آج بھی جاری ہے۔

سید الطاف علی بریلوی ایک پختہ مشق مصنف تھے۔ ان کے قلم سے حیات حافظ رحمت خاں، چند محسن چند دوست، مقالات بریلوی، تحریک علی گڑھ اور قومی نظمیں، مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد، تعلیم و تعلم، تعلیمی مسائل پس منظر و پیش منظر، راہی اور راہ نما، تخلیقات و نگارشات، حاصل مطالعہ وغیرہ اہم کتابیں نکلیں۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ء میں کراچی میں وفات پائی اور سخی حسن کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

(۴) ایضاً ص ۳۶

(۵) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ص ۸۱

ooo

چوتھا اجلاس۔علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا چوتھا اجلاس علی گڑھ میں بتاریخ ۲۷ تا ۳۰ ؍ دسمبر ۱۸۸۹ء منعقد ہوا۔اس کی میز بانی جسٹس سید محمود[۱۸۵۰-۱۹۰۳ء](۱) خلف سر سید نے کی۔اور اس کے تمام اخراجات بھی انہیں نے اٹھائے۔اجلاس کی صدارت سردار محمد حیات خاں کے ذمہ تھی مگر وہ بروقت نہ پہنچ سکے تو یہ ذمہ داری خان بہادر برکت علی خاں[۱۸۲۱-۱۹۰۵ء](۲) ادا کی اور ان کی عارضی صدارت میں اجلاس کا آغاز ہوا۔علامہ شبلی نعمانی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ اور اس کی دوسری نشستوں اور پروگراموں میں بھی حصہ لیا۔

اجلاس میں سو ۱۰۰ ؍روپئے کے ایک انعامی مضمون کے لئے یہ رزولیشن پیش ہوا کہ ''ملکی ترقی کے لئے اعلیٰ تعلیم کی کوشش مفید ہے یا ادنیٰ تعلیم کی۔''اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ

> ''اس کانگریس کی یہ رائے ہے کہ مندرجہ مضمون پر اردو یا انگریزی زبان میں ایک ایس سے (مضمون) لکھوایا جائے ،جس کی مقدار فلس کیپ کے سو صفحوں سے جو معمولی خط سے لکھے گئے ہوں کم نہ ہو۔اور کانگریس کی طرف سے اس شخص کو سو روپیہ ملے گا جس کا جوابی مضمون وہ کمیٹی جو اس غرض سے مقرر ہوگی پسند کرے۔

(مضمون)

> موجودہ حالت میں ملک کی ترقی کے لئے اعلیٰ تعلیم پر کوشش کرنا اور اس کے لئے سامان جمع کرنا زیادہ مفید ہے یا ادنیٰ درجہ کی تعلیم پر۔دونوں کا مقابلہ کرو اور بتاؤ کہ اگر اعلیٰ تعلیم پر کوشش کرنی زیادہ مفید ہے تو کیوں؟ اور اگر ادنیٰ تعلیم پر کوشش

مفید ہے تو کیوں؟ اور درصورتیکہ امر اول تسلیم کیا جاوے تو ہم کو کیا کرنا چاہئے اور یہ کہ آیا موجودہ حالت ملک کی ایسی ہے کہ وہ دونوں قسم کی تعلیم پر برابر فائدہ رسانی کی کوشش کرسکتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو جو کوشش ہم کریں گے وہ اعلیٰ تعلیم پر صرف کریں یا ادنیٰ پر۔ ادنیٰ تعلیم سے مراد اسکول تک کی تعلیم ہے اور اعلیٰ تعلیم سے مراد کالج کی تعلیم ہے۔(۳)

علامہ شبلی نعمانی نے اس رزولیشن کو نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کی تائید وحمایت میں ایک تقریر بھی کی۔ وہ تقریر اعلیٰ اور ادنیٰ تعلیم کے موضوع پر عمدہ مباحث ونکات پر مشتمل ہے۔ وہ تقریر درج ذیل ہے:

تقریر

جناب پریسڈنٹ وممبران انجمن!

جس رزولیشن کی تحریک کرنے کی میں نے جرات کی ہے وہ ایک نہایت صاف اور بدیہی رزولیشن ہے، جس کو سکریٹری صاحب نے اجلاس میں پڑھ کر سنا دیا ہے۔ اس کی نسبت مجھ کو کچھ زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ تمام حضرات جو اس وقت اس بڑے ہال میں جمع ہیں بخوبی واقف ہیں کہ جس طرح اب سے چند برس پہلے ان لوگوں کی تعداد نہایت کم تھی جو انگریزی تعلیم کو جائز سمجھتے تھے، آج وہ لوگ صرف معدودے چند ہیں جن کو انگریزی تعلیم کی ضرورت سے انکار ہے۔ اب یہ صدا نہایت عام ہوگئی ہے۔ گھر گھر اس کے چرچے ہیں۔ ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک ہر جگہ اسی کا رونا ہے۔ صرف زبانی باتوں پر بس نہیں ہے، بلکہ عموماً عملی کارروائیاں بھی شروع ہوگئی ہیں۔ ہر جگہ کلب، انجمنیں، مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں، لیکن یہ تعجب ہے کہ اس سرگرمی اور جوش کا کوئی معقول اثر ملک میں محسوس نہیں ہوتا۔ ہماری تعلیم کو جو غیر قوموں سے نسبت تھی، اس میں بہت کم فرق پیدا ہوا ہے۔ اعلیٰ تعلیم اسی طرح پستی کی حالت میں ہے۔ گریجویٹوں کی تعداد اب بھی اکائی کی حد سے نہیں بڑھتی، جس کی وجہ میرے خیال

میں صرف یہ ہوسکتی ہے کہ قوم نے تعلیم کے مختلف درجوں کی ضرورتوں پر غور نہیں کیا۔مختلف لوگ مختلف کوششوں میں مصروف ہیں، جس کی وجہ سے کوئی مجموعی طاقت نہیں پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے تمام قوم کو یہ طے کر لینا چاہئے کہ ہم کو کس تعلیم کی زیادہ تر ضرورت ہے۔ جب ایک خاص تعلیم کی ضرورت عموماً تسلیم ہو جاوے تو سب مل کر اس پر متوجہ ہوں۔اس طرح قوم کی مجموعی کوششوں کا رخ ایک طرف بدل جائے گا۔لیکن یہ تعیین کوئی آسان مضمون نہیں ہے۔ اور جب تک کہ قوم کے بہت سے عالی خیال حضرات اس پر بحث نہ کریں اور ان میں باہم مبادلہ خیالات نہ ہو اس کا قطعی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ انہیں وجوہ سے میری خواہش ہے کہ اس مضمون پر کہ کون سی تعلیم مقدم تر اور ضروری تر ہے، ''ایس سے'' لکھوائے جائیں اور جو''ایس سے'' سب سے عمدہ ہو اس پر ایک انعام جو مقدار میں سو۱۰۰روپئے سے کم نہ ہو مقرر کیا جاوے۔

اس طرح اس بحث کے تمام پہلو قوم کے سامنے آجاویں گے اور پھر جو فیصلہ ہوگا وہ قطعی اور مسلم الثبوت ہوگا۔

میں نے مختصر طور پر رزولیوشن کی ضرورت بیان کر دی ہے،لیکن امید ہے کہ میرے موید جناب آنریبل سید احمد خاں صاحب نہایت تفصیل کے ساتھ اس پر گفتگو فرمائیں گے۔(۴)

آنریبل سر سید احمد خاں نے اس قرارداد کی نہ صرف تائید کی بلکہ اپنے متعدد دلائل سے اس کی حمایت میں مدلل تقریر بھی کی۔(۵) سر سید احمد خاں کی یہ تقریر موضوع کے حوالہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اور اب بھی لائق مطالعہ ہے۔ وہ تقریر حسب ذیل ہے:

جناب صدر انجمن و دیگر بزرگان!

جو رزولیوشن کہ اس وقت پیش ہوا ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ آپ کو اس رزولیوشن سے یہ بات ظاہر ہوئی ہوگی کہ اس رزولیوشن کا مقصد اس وقت کسی مضمون پر بحث کرنے اور اس کے فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔ ایک مضمون کانگریس کے سامنے پیش کیا گیا ہے نہ اس لیے کہ اس پر بحث کی جاوے بلکہ اس لیے اس مضمون کو پرائس سے لکھوایا جاوے اور اس کے لیے یہ پابندی بعض شرطوں کے انعام مقرر کیا جاوے۔ پس اس وقت یہی امر بحث طلب ہے اور اس کے سوا اور کوئی

چیز بحث طلب نہیں ہے۔ حال یہ ہے کہ اسی قسم کے مضامین یا اس کے قریب قریب چند دفعہ پچھلے تین اجلاسوں میں پیش ہوئے اور ہر ایک صاحب نے دفعتہً بلا غور کامل یا بعد کسی قدر غور کے اس پر گفتگو شروع کی۔ گفتگوئیں آپس میں مختلف تھیں اور ہر ایک موید گفتگو نہ کل پہلو پر اور نہ اس کے کل منافع پر جامع تھی اور مخالف گفتگو کرنے والے کی گفتگو اس موید کی گفتگو کے نقصان اور اپنی تجویز کے منافع بیان کرنے کو کافی تھی۔ اس لیے ضرور ہے کہ لوگ بجائے خود غور و تامل کر کے اور ہر ایک صاحب کے تمام منافع و مضار پر غور کر کے اپنی رائے قایم کریں اور یہ مقصد اس صورت میں کہ اس مضمون پر متعدد پرائس سے تحریر ہوں جس کی تحریر رزولیوشن میں کی گئی ہے۔ بخوبی حاصل ہو سکتا ہے۔

حضرات! ہمارے ملک اور ہماری قوم کا عجیب حال ہے۔ کسی چیز کا ادنی یا اعلیٰ ہو عملی نام لو اور پوچھو کہ قوم کو اس کی ضرورت ہے تو ہر ایک کے لیے جواب ملے گا کہ ہاں اور کسی کی نسبت نہ کہا جاوے گا کہ نہیں۔ قرآن کے مکتبوں کی ہم کو ضرورت ہے۔ عربی فارسی کے مکتبوں کی ہم کو ضرورت ہے۔ حدیث و فقہ کے مدرسوں کی ہم کو ضرورت ہے۔ انگریزی تعلیم میں لیول پریمری (اپر پرایمری) مڈل و انٹرنس، ایف اے و بی اے اور ایم اے کی ہم کو ضرورت ہے۔ تجارت میں چھوٹی دکانداری سے بڑے بڑے کارخانہ کی ہم کو ضرورت ہے۔ صناعت میں رسوئی اور دیا سلائی بنانے سے عمدہ عمدہ جیسی گھڑیاں اور عجیب عجیب تھرمامیٹر اور نازک نازک کلیں بنانے کی ہم کو ضرورت ہے، سوت کاتنا، کاغذ بنانا، کپڑا بننا غرض کہ اس زمانہ کی چیزوں میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی ہم کو ضرورت نہ ہو۔ پس بلحاظ امورات متعلق تعلیم کے ہی ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ادنیٰ درجہ کی تعلیم پھیلانے کی قوم میں بڑی ضرورت ہے۔ دوسرا کہہ سکتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہ ہونے سے قوم کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے۔ دونوں کا کہنا بلحاظ قوم کی حالت کے صحیح ہے اور ان کے دلائل قابل رد و قدح نہیں ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ دو لوگ جو اس گری ہوئی قوم کو سنبھالنا چاہتے ہیں جو ادنیٰ سی چیز سے اعلیٰ تک کی محتاج ہے اس کے سنبھالنے کا ان کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیا سب چیزوں کو ایک ساتھ اختیار کرنا جس کا انجام محالات سے ہے اور قوموں کے متفرق ہو جانے سے ایک چیز کا بھی ہونا ناممکن ہے ہم کو مناسب ہے یا کسی ایک چیز کو جو سب خرابیوں کی جڑ ہے

اختیار کرنا لازم ہے۔

فرض کرو کہ ایک شخص بیمار ہے اور متعدد بیماریاں اس کو لاحق ہیں۔ اس طبیب کو جو اس کا معالج ہے دفعتہً تمام بیماریوں کا ایک دم علاج کرنا مناسب ہے یا اول اس بیماری کا تدارک کرنا اس کو مناسب ہے جو مہلک ہے۔ قوم من حیث المجموع ایک شخص واحد کا حکم رکھتی ہے درحقیقت اس کو بہت سی بیماریاں لاحق ہیں۔ سوال بحث طلب صرف یہی ہے کہ کون سی بیماری سب سے زیادہ سخت اور مہلک ہے جس کے علاج میں سب سے اول ہم سب کو متفق ہو کر کوشش کرنی چاہئے۔

مجھے امید ہے کہ اس اصول سے جس کو بڑے بڑے حکماء نے تسلیم کیا ہے کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کرے گا۔ اختلاف رائے جہاں تک ہوسکتا ہے وہ اس بیماری کے تشخیص کرنے میں ہوسکتا ہے جس کو سب سے زیادہ سخت مہلک قرار دیا جاوے۔

ایک مدت دراز سے ہماری قوم پر مردنی چھائی ہوئی تھی لیکن اب کچھ ہلنے لگی ہے اور کروٹیں بدلتی ہے۔ جس کی حرکتیں غیر منضبط اور بسمل کی سی حرکتیں ہیں۔ یا اس کی مثال ایک بند پانی کی تھی جو ایک مدت سے ایک جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ بیشک اس میں حرکت آئی ہے مختلف طرح سے اس نے بہنا شروع کیا ہے۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مقاموں سے بہنا شروع کرے اور چھوٹی چھوٹی شاخیں اس سے پیدا ہوں اس کا نتیجہ بجز اس کے کہ تھوڑی دور چل کر سوکھ جاوے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ قوم کے سنبھالنے والوں کا یہ کام ہے جو اس کے بہنے کے لیے ایک عمدہ موقع تجویز کریں اور ان تمام شاخوں کو پھیر کر ایک رستہ پر ڈالیں تا کہ وہ سب مل کر ایک دریا یا رفتہ رفتہ سمندر ہو جاوے۔

مجھ کو اپنی قوم کی حالت پر بہت بڑا افسوس تھا مگر نہایت خوشی ہے کہ اس بند پانی کا بند ٹوٹ گیا ہے اور مختلف رستوں پر بہنے لگا ہے۔ خدا سے امید ہے کہ وہ سب دھاریں ایک ہو جاویں گی اور سب مل کر ایک دریا بن جاوے گا۔ پس تم کو اس بات پر غور کرنی چاہیے کہ وہ مختلف دھاریں کیونکر ایک ہوں اور کیونکر سب مل کر دریا بن جاویں۔ یہ بھی مقصود اس مضمون کا ہے جو پیش ہوا ہے۔ بلا شبہ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس پر ہر ایک شخص اپنی رائے کے موافق اسے لکھے گا۔ لیکن اس

وقت میرے خیال میں ایک ایسا انگریزی لفظ ہے جس کا اردو ترجمہ میری دانست میں نہیں ہوسکتا۔ شاید مولوی نذیر احمد صاحب (۶) اس کا ترجمہ کرسکیں وہ لفظ یوٹیلیٹی ہے۔ اس کے مقابل کا لفظ اردو میں تو میں نہیں جانتا مگر جہاں تک ممکن ہوسکتا ہے اس کی تشریح کرتا ہوں۔ کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں ہے جس میں منفعت اور مضرت دونوں موجود نہ ہوں۔ یوٹیلیٹی کے یہ معنی ہیں کہ ایک طرف اس کی تمام منفعتوں کو بہ ترتیب رکھا جاوے اور ایک طرف اس کی تمام مضرتوں کو اور ہر ایک منفعت اور مضرت کا ویلیو (افسوس ہے کہ اس کی اردو بھی میں نہیں جانتا۔ جس کو شوق ہو مولوی نذیر احمد صاحب سے پوچھ لے) قرار دیں اور پھر جبر اور مقابلہ کے قاعدہ سے نکال لیں کہ اس میں منفعت زیادہ ہے یا مضرت۔ اور جس میں منفعت زیادہ ہو اس کو اختیار کریں۔ جبر و مقابلہ سے حساب کرنے میں ہم کو کچھ مشکل نہ پڑے گی کیونکہ شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ (۷) موجود ہیں وہ ایک منٹ میں حساب کرکے نکال دیں گے جس کے زیادہ نمبر وہ بتائیں وہ اختیار کرنا چاہیے۔

بہرحال یہ مضمون میری دانست میں اس بات کا مستحق ہے کہ ہر شخص جو اس پر کچھ لکھے نہایت غور و فکر سے ہر ایک پہلو پر خیال کرکے لکھے جب وہ رسالے آویں گے اور کمیٹی کے سپرد ہوں گے اور مجھ کو امید ہے کہ کمیٹی خود بھی یوٹیلیٹی پر عمل کرکے ان رسالوں میں سے کسی رسالہ کو پسند کرے گی۔ اس وقت صرف یہ امر پیش ہے کہ ایسے ایسوں کا لکھا جانا منظور کیا جاوے اور امید ہے کہ اس میں کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ اگر کسی قدر اختلاف یا عذر کرنے والا ہوں تو میں ہی ہوں اور وہ عذر یہ ہے کہ جو انعام اس کے لیے تجویز ہوگا وہ اس سال کے چندہ ممبری سے نہیں دیا جاسکے گا۔ کیونکہ اس سال کے چندہ ممبری کے لیے یہ امر قرار پاچکا ہے کہ کل روپیہ بعد منہائے اخراجات چھاپہ وغیرہ اسکالرشپ کے فنڈ میں دیا جاوے گا۔ یہ اسی سال آئندہ اجلاس میں پیش ہوں گے اور سال آئندہ کے چندہ کی آمدنی سے وہ انعام دیا جاسکے گا۔ علاوہ اس کے سو روپیہ کا ایک انعام ہے۔ کم سے کم تین انعام مقرر ہونے چاہئیں۔ ایک روپیہ کا اور دو پچاس پچاس روپیہ کے تاکہ متعدد لوگوں کو نام آوری کے حاصل کرنے کا موقع ملے۔ (۸)

اس اجلاس میں متعدد اردو اور فارسی شعرانے اپنا کلام پیش کیا۔ ان میں مولانا الطاف

حالی، آغا کمال الدین سنجر، مولوی عبداللہ فخری لاہوری، منشی ارتضیٰ علی کاکوروی، حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی، مولوی عبدالمجید لاہوری، اور مولوی احسان علی خاں شاہ جہاں پوری کے نام شامل ہیں۔(۹) سید الطاف علی بریلوی نے یہ تمام نظمیں ''علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں'' میں یکجا کر دی ہیں۔(۱۰) اس اجلاس میں علامہ شبلی نعمانی نے بھی تعلیم کے موضوع پر اپنا فارسی ترکیب بند سنایا۔ جو درج ذیل ہے۔

ترکیب بند

حیرتم می برد اینک کہ بدیں زینت وساز — چیست کیں بزم بہ آئیں دگر بست طراز
جلوہ گاہیست ہما نامہ رنگ وہمہ بوی — بزم گاہیست ہمانامہ برگ و ہمہ ساز
مژدہ باد اہل نظر را کہ تماشا مفت ست — شاہد بزم دگر چہرہ بر افروخت بہ ناز
بسکہ شور طرب از خاک بگردوں برشد — باز ایں گنبد فیروزہ پرست از آواز
ہاں بہ آئیں ادب آئے کہ سرتا سر بزم — پردۂ دیدہ بود فرش بہ پہنا و دراز
بزم را تاچہ قدر پایہ بلند است امروز — بسکہ والا گہراں اند درد وجلوہ طراز
در صف صدر جواں حوصلہ پیرے بنگر — رہبر قافلہ ما بہ نشیب و بہ فراز
واں گراں مایہ بزرگاں کہ زبیتابی شوق — در نوشتند بپائے طلب ایں راہ دراز
ہمہ خوش خوئے و ہمایوں نفس و پاک نہاد — ہمہ دانش طلب ودیدہ ور و نکتہ نواز
گرحدیث از شرف نسبت ایشاں گزرد — انجمن را بتواں گفت کہ بر خویش بناز
فرۂ بزم نگر گرمی ہنگامہ بہ بیں — ور بہ پرسی کہ چرا ایں ہمہ زیب ست وطراز
باز لختے بہ سخن پیچم و در ذوق سخن — ندہم پاسخ وافسانہ زسر گیرم باز
انتظار توۂ شوق تو چو از حد گذرد — لاجرم پردہ کشایم ز رخ شاہد راز
تہنیت گویم واز جاروم از جوش طرب — مژدہ برمژدہ رسانم کہ بصدزینت وساز
باہمہ فرۂ و فر باہمہ تمکین وشکوہ — چار میں مجلس تعلیم نہادند آغاز

ہی چہ آغاز کہ پیرایہ ایام است ایں
ہی چہ آغاز کہ طغرائے صدانجام است ایں

ہاں بیا عرصہ گہہ شوق و تمنا بنگر   ہاں بہ دریوزہ فیض آئے و مواسا بنگر
انچہ از گرمی ہنگامہ وانبوہے ناز   ہیچ جائے نتواں یافت بہر جا بنگر
گوشہ ہا محو نواہاے دل آویز ببیں   دیدہ ہا راہمہ حیران تماشا بنگر
آں گراں مایہ بزرگاں کہ بدانش مثل اند   ہمہ را جائے دریں بزم دل آرا بنگر
درنشاں می طلبی بہر شناسا بودن   فرۂ تابش اقبال بہ سیما بنگر
نگہ ازمہرسوئے حالی آزادہ فگن   واں نذیراحمد طوطی شکر خا بنگر
آں یکے را بلب آں نغمہ جاں سوز ببیں   واں دگر را بکف آں دفتر انشا بنگر
پس ازاں پایہ فرود آئی و بہ پائیں بساط   شبلی دل زدہ را زمزمہ پیرا بنگر
نالہ چند کہ ریزد زلبش باز شنو   پس زجا رفتن دل ہائے شکیبا بنگر
تا بسنجی کہ فغانش نبود بے چیزے   انچہ برما رود از چرخ ستم زا بنگر
ہرچہ از شوکت اسلام شنیدی زیں پیش   اینک آں زمزمہ رامایہ سودا بنگر
اینک آں دفتر اقبال پراگندہ بہ بیں   اینک آں نسخہ اسلام مجزا بنگر
دود ماں باہمہ سرگشتہ حرماں دریاب   خان و مانہا ہمہ در رفتہ بہ یغما بنگر
آں جگر دوز فغاں سنجی احباب شنو   واں دل آشوب شکرخندہ اعدا بنگر
بگذر از کجروی چرخ و گونساری بخت   انچہ برما رود از جور ہم از ما بنگر

چند با بخت و فلک دست و گریباں باشیم
صرفہ آنست کہ از کردہ پشیماں باشیم

روزگاریست کہ سر گشتہ سعئیم ، مگر   نخل اندیشہ ما ہیچ نیاورد ثمر
ہرچہ گفتیم و شنیدیم بجائے نرسید   گرچہ صد بار بگفتیم و بگوئیم دگر
ہیچ از ناوک تدبیر نیامد بہ نشاں   ہمہ بگذار ہمیں کانگریس را بنگر

چارسال است کہ ایں جادہ نوردیم وہنوز　　حاصل ما نبود زاں ہمہ جز بوک ومگر
تاچہ سود است کہ در بزم بہ ہنجار سخن　　نغمہ چند سرانید بآہنگ اثر
تاچہ سود است کہ درعرضہ سالی دو سہ روز　　مصرعی چند ببافند و نجوانند ازبر
ہم زہر ناحیہ دیدہ دراں جمع آیند　　وانکہ آں دفتر پارینہ کشایند ازسر
آں یکے گرم زجا خیزد واستدعا برپائے　　رو بہ بزم آرد و بخشے نہد اندر محضر
ہم برآں حرف دلآویز زبرہان وحجج　　گوید آں گونہ کہ رسم است درآئین ہنر
حاضران جملہ بہ تسلیم و بہ انکار آیند　　خود گماں بردہ کہ از پئے بودش نفع وضرر
پس فراواں سخن از گفتہ ونا گفتہ رود　　تابجائے کہ خود آں حرف شود یک دفتر
دوسہ بحثے کہ گزینند بپایان سخن　　جملہ دارند قبولش کہ ازیں نیست مفر
بعد ازاں کانہمہ ہنگامہ نشیند از پائے　　بزم برہم شود و خلق شود راہ سپر
آں سخن ہا ہمہ افسانہ و افسوں گردد　　آں بناہا ہمہ یک بار شود زیر وزبر
دل زاندیشہ تہی گردد ویاران عزیز　　مست خسپند بہ غفلت کدہ تا سال دگر

خود ہمیں است گر آئیں طلب گاری ما
وائے برما وبریں ہرزہ زیاں کاری ما

چندسال ست کہ یک کس زعزیزاں دیار　　می ندانست کہ چوں می گذرد لیل ونہار
تا چہ نیرنگ ہمے آورد از پردہ سپہر　　تا چہ درباخت زبازی فلک عربدہ کار
از غلط کاری ما برسر اسلام چہ رفت　　تاچہ بودیم وچہ ہستیم وچہ داریم شعار
غافل از کار وہم از فتنہ گریہای فلک　　فارغ از خویش وہم از خستگی خویش وتبار
ہمہ را بادۂ دوشینہ فرو بردہ بخواب　　ہمہ را ہستی پیشینہ در افزودہ خمار
ماہماں مست بخواب اندر ونیرنگ سپہر　　فتنہ ہا ریخت نہ چنداں کہ تواں کرد شمار
سختی دہر چو از حوصلہ صبر گذشت　　برگرفتیم سر از خواب سراسیمہ و زار
لب برازمویہ کہ آہ ایں چہ جفا رفت بما　　دل در اندیشہ کہ ہی تاچہ بود چارۂ کار

ہر یکے گرم براہ طلب افتاد چناں | کہ درآں پویہ ندانستی روز از شب تار
گرچہ را ندند دریں رہ بہ نشیب وفراز | ہایہ ہا گرچہ دریں مرحلہ ماند از رفتار
ہم زبے راہ روی بود کہ باایں تگ وپوے | خود بسر منزل مقصود نیفتاد گذار
از تبہ کاری و بربادی ما ہیچ نکاست | ما ہما نیم و ہماں برہمی شہر و دیار
سئی بخت ہم امروز چنان ست کہ وی | حالت جملہ ہم امسال ہماں است کہ یار
داورا ایکہ جہاں دار و جہاں بخش توئی | بندگان تو دریغ است کہ باشند نزار
می پسند اینکہ نشنیند بایں روز سیاہ | خاک بوساں سر کوئے رسول مختار

داورا ہاں پسند اینکہ دریں کد باشیم
ما کہ از حلقہ بگوشان محمد باشیم(۱۱)

اس اجلاس کی متعدد نشستوں میں متنوع موضوعات اور رزولیشن زیر بحث آئے۔امان اللہ خاں شروانی نے اس کی تفصیل اس طرح قلم بند کی ہے:

۱۔زکوٰۃ کا پیسہ مسلمان بچوں کی تعلیم پرخرچ کیے جانے کی اپیل کی گئی۔

۲۔تاریخ کی درسی کتابوں سے ایسے ابواب جن سے مذہب اسلام کی اہانت ہوتی ہے نکالے جانے کی مانگ کی گئی۔

۳۔اس اجلاس میں ملک کی ترقی کے لئے اعلی تعلیم اورابتدائی کی اہمیت پر بحث کی گئی۔

۴۔ملک کی تمام انجمنان اسلامیہ سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد کو پورا کرنے میں مدد کرنے کی درخواست کی گئی۔

۵۔تجویز پاس کی گئی کہ عام اسکولوں میں ٹکنیکل تعلیم نہیں دینی چاہئے بلکہ اس کے لئے علاحدہ ادارے کھولے جائیں۔

۶۔کم عمر بچوں کے لئے نصاب تعلیم مرتب کیے جانے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی۔

۷۔پانچویں اجلاس ۱۸۹۰ء کا سب سے اہم فیصلہ یہ تھا کہ ایک تجویز کے ذریعہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانگریس کا نام بدل کر ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کر دیا گیا۔

۸۔اس اجلاس میں کچھ علمی اورادبی کاموں کے متعلق بھی بڑے اہم فیصلے ہوئے،مثلاً:
اس پر تحقیق کی جائے کہ مسلمانوں نے السنہ ہندوستان پر کہاں تک قدرت حاصل کی تھی۔اس کے لئے مندرجہ ذیل حضرات سے درخواست کی جائے کہ

(الف)مولوی سید علی بلگرامی سے درخواست کی جائے کہ وہ ایک نسخہ علامہ فیضی کے کلام کا سنسکرت سے تیار کریں اوراس کلام پرانگریزی میں حاشیہ تحریر فرمائیں اور فارسی اور سنسکرت کے اتحاد زبان پر تبصرہ فرمائیں۔

(ب)مولانا حالی سے استدعا کی جائے کہ وہ امیر خسرو دہلوی کے کلام کو جمع کریں۔

(ج) سید اقبال علی جج ہائی کورٹ حیدرآباد سے اپیل کی جائے کہ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا لفظی ترجمہ ہندی سے اردو میں فرمائیں اور مولانا حالی سے درخواست کی جائے کہ اس ترجمہ کو اردو میں نظم فرمائیں۔

(د)ان تمام کتابوں کو کانفرنس کی طرف سے شائع کیا جائے۔

(ہ)یہ بھی طے کیا گیا کہ بچوں کے لئے اردو زبان میں اخلاقی مضامین لکھوائے جائیں اورانہیں شائع کرایا جائے۔(۱۲)

یہ قراردادیں اور فیصلے ہم نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال سے نقل کئے ہیں۔جس کے مصنف نے اجلاس چہارم اور پنجم کے فیصلوں یکجا کر دیا ہے۔اس لئے یہاں بھی دونوں ساتھ ہی بیان کردئے گئے ہیں۔مقصود یہ دکھانا ہے کہ کانفرنس اوراس کے شرکا قوم وملت کی ترقی کے لئے کس قدر اہم مباحث پر بحث وتحقیق کر کے فیصلے لیتے تھے۔

تعلیقات وحواشی:

(۱) جسٹس سید محمود[۱۸۵۰-۱۹۰۳ء]،سرسید کے صاحبزادے تھے۔کوئنس کالج بنارس میں تعلیم پائی ۱۸۵۹ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔۱۸۷۳ء میں قانون کی تعلیم مکمل کی۔پہلے ڈسٹرکٹ جج پھر ہائی کورٹ الہ آباد کے جج مقرر ہوئے۔اس موقع پر اعظم گڑھ میں مبارک باد پیش کرنے کے لئے

علامہ شبلی نے ایک جلسہ منعقد کیا۔اس جلسہ میں انہوں نے جو تقریر کی تھی وہ ان کی ابتک کی دریافت سب سے قدیم تقریر ہے۔علامہ شبلی جب علی گڑھ میں پروفیسر ہوئے تو ان سے اچھے مراسم رہے۔ یہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ اور علی گڑھ کالج کے تمام اختیارات کے لئے حصول کی کوشش شروع کی اس زمانہ میں ان سے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔انہیں کی وجہ سے علامہ شبلی کو سرسید کی بنگلیہ چھوڑنی پڑی اور چند دنوں کے لے نواب اسماعیل دتاولی کے گھر رہنا پڑا۔علی گڑھ کی پروفیسری سے علامہ شبلی نے اپنا استعفٰی انہی کو مئی ۱۸۹۸ء میں سونپا تھا۔

سرسید کی وفات کے بعد چند ماہ کالج کے سکریٹری رہے لیکن پھر انہیں دست بردار ہونا پڑا اور نواب محسن الملک سکریٹری نامزد ہوئے۔۱۹۰۳ء میں انہوں نے وفات پائی۔

(۲) خان بہادر محمد برکت علی انجمن اسلامیہ پنجاب کے جنرل سکریٹری اور سرسید کے دوستوں میں تھے۔۱۸۸۹ء کے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں صدر سردار حیات خاں نہ پہنچ سکے تو بار صدارت انہیں کے کاندھوں پر ڈالا گیا تھا اور انہوں نے اسے نبھایا۔ان کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔

(۳) انوار احمد مارہروی۔مرقع کانفرنس ص۳۰-۳۱

(۴) بحوالہ باقیات شبلی ص۴۳-۴۵

(۵) ایضاً

(۶) مولوی نذیر احمد: اردو بالخصوص اردو ناول کے بنیاد گذاروں میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد دہلوی [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اردو میں ناول نگاری کی بنیاد انہیں کے مبارک ہاتھوں پڑی۔انہوں نے اپنی بچیوں کی تربیت کے لئے جو ناول لکھے تھے وہ ہر بچی کی تربیت کے لئے مفید اور کارآمد ٹھہرے۔مراۃ العروس [۱۸۶۹ء] بنات النعش [۱۸۷۳ء] توبۃ النصوح [۱۸۷۷ء] اور ابن الوقت [۱۸۸۸] وغیرہ ناول ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں بجنور میں پیدا ہوئے۔دلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔تحصیل علم کے بعد پنجاب میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔تحصیل دار اور افسر بندوبست کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ایک عرصہ تک اعظم گڑھ میں بھی انہوں نے محکمہ بندوبست میں کام کیا۔اسی زمانہ میں سرسید احمد

خاں اعظم گڑھ آئے تھے۔۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل. ایل.ڈی.کی اعزازی ڈگری ملی۔۱۹۱۲ء میں دہلی میں وفات پائی۔

علامہ شبلی عمر میں ان سے ۲۱/برس چھوٹے تھے۔باوجود اس کے ڈپٹی نذیر احمد ان کی بڑی پذیرائی کرتے۔ایک بار علی گڑھ اسٹریچی ہال میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا۔مولانا شبلی بھی موجود تھے۔دوران تقریر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ ''میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی۔اب تو ایسا ذہول ہو گیا ہے کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ دیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں۔'' (حیات شبلی ص ۶۱۵)

(۷) شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی [۱۸۳۲-۱۹۱۰ء] دہلی کے رہنے والے تھے۔ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے۔اسی کالج میں ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد بھی زیر تعلیم تھے۔تحصیل علم کے بعد اسی کالج میں ریاضی کے استاذ مقرر ہوئے۔آگرہ کالج میں بھی کچھ دنوں تک اردو فارسی کی تعلیم دی۔اس کے بعد انسپکٹر آف اسکول مقرر ہوئے۔آخر میں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔یہیں سے سبکدوشی حاصل کی۔انہیں مختلف موضوعات تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعات، سیاسیات اور اخلاقیات وغیرہ سے دلچسپی رہی اور ان تمام موضوعات پر تحریریں ان کی یادگار ہیں۔انہوں نے ۱۴۳/کتابیں لکھیں۔دس جلدوں میں تاریخ ہندوستان ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

علامہ شبلی جب انجمن ترقی اردو کے سکریٹری نامزد ہوئے تو یہ نائب صدر تھے۔علامہ شبلی نے انجمن کی طرف سے ترجمہ ہونے والی کتابوں کی جانچ کے لئے جو کمیٹی بنائی تھی منشی ذکاء اللہ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ملا واحدی کے بقول علامہ شبلی دہلی آتے تو ان سے ملاقات کے لئے ان کے گھر جاتے۔

(۸) مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچز سرسید احمد خاں ص ۴۳۷-۴۴۰

(۹) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص ۴۳

(۱۰) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص ۴۳-۷۷

(۱۱) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص ۵۱-۵۴، کلیات شبلی فارسی ص ۳-۶

(۱۲) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال ص ۴۰-۴۱

ooo

پانچواں اجلاس۔الہ آباد

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پانچواں اجلاس الہ آباد میں ۲۸ تا ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۰ء منعقد ہوا۔مولانا سید سلیمان ندوی(۱) نے ''حیات شبلی'' میں پانچویں اجلاس کا سنہ انعقاد ۱۸۹۱ء لکھا ہے(۲)،لیکن تمام کتابوں میں اس کا سنہ انعقاد ۱۸۹۰ء ہے۔(۳)

سر سید احمد خاں نے اس اجلاس کا اس قدر اہتمام کیا تھا کہ اس کے نظم وانصرام کے لئے ایک ماہ قبل ہی الہ آباد پہنچ گئے تھے۔اس کی صدارت بھی گذشتہ اجلاس کے صدر سردار محمد حیات خاں نے کی تھی۔اس میں بھی ملک کے متعدد ممتاز اشخاص شریک ہوئے۔علامہ شبلی نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ان کے دوست منشی رحمت اللہ رعد کانپوری [۱۸۵۷-۱۹۲۱ء](۴) بھی شریک ہوئے۔انہوں نے کم عمر بچوں کے لئے نصاب تعلیم بنائے جانے کا رزولیشن پیش کیا تو علامہ شبلی نے اس کی تائید کی۔(۵)

یونانی علوم پر مسلمانوں کے اضافہ پر رسائل کی ضرورت:

علامہ شبلی نے اسی اجلاس میں مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں بالخصوص عہد عباسیہ میں یونانی علوم پر جو اضافے کئے،اس پر رسائل لکھے جانے کی قرارداد پیش کی،جو درج ذیل ہے:

> ''اس جلسہ کی رائے یہ ہے کہ اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں جو علوم یونان،مصر و ہندوستان وفارس سے حاصل کئے تھے،ان پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کئے۔اس رسالہ میں ہر ایک امر اور

مسائل اور مباحث کو بالتفصیل بحوالہ اسناد ثابت کیا جائے۔"(۶)

اس قرارداد کو پیش کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے مختصر مگر بڑی جامع تقریر کی۔ بعد ازاں سرسید احمد خاں ڈائز پر تشریف لائے اور علامہ شبلی کی اس قرارداد کی تائید کی۔(۷) انہوں نے کہا کہ

"یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے، جس کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ تمام علمی مجلسیں اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں، مگر بحث اس میں ہے کہ اس کو لکھے گا کون؟ ہمارے ہاں ایک مثل ہے "جو بولے وہی گھی کو جاوے" پس مولوی شبلی ہی اس کو لکھیں گے، شبلی ہی لکھیں گے۔ تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے، مولوی شبلی ہی لکھیں گے۔"(۸)

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "اس تجویز کا خاکہ مولانا [شبلی] کے ذہن میں آچکا تھا اور وہ رسالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے ایک حاشیہ پر یہ لکھ چکے تھے کہ

"اگر زمانہ نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اور اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمانوں کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے اور ان کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھا دیا، ایک مستقل رسالہ میں لکھوں گا اور شاید اسی انجمن (کانفرنس) کے کسی دوسرے جلسہ میں پیش کرنے کا اتفاق ہو۔"(۹)

مگر شاید زمانہ نے مساعدت نہیں کی اور اس کا اتفاق نہیں ہوا کہ وہ یہ مقالہ سپرد قلم کرتے۔ بہت بعد میں ماہنامہ الندوہ لکھنو میں یونانی منطق کے اغلاط پر علامہ شبلی نعمانی نے ایک مقالہ لکھا جو "مقالات شبلی" جلد چہارم میں بھی شامل ہے۔ اسے مولانا سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ کی توسیع قرار دیا ہے۔(۱۰) پھر یہ سلسلہ اسی پر موقوف ہو گیا۔ اور دوسرے علوم وفنون کا ذکر نہیں آسکا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اسی اجلاس میں اس کے نام میں ترمیم کی گئی اور کانگریس کی جگہ کانفرنس کیا گیا۔

تعلیقات وحواشی:

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء]ممتاز سیرت نگار،مورخ،مصنف ،ماہر تعلیم ،علامہ شبلی کے جانشین اورنہایت قابل شاگرد تھے۔دارالمصنّفین انہیں نے چلایا۔رسالہ معارف کے بانی مدیر تھےاوراسے بھی اپنے استاذ کےخوابوں کی تکمیل ہی میں جاری کیااورنہایت بلند علمی معیار عطا کیا۔انہوں نے جس موضوع پر لکھااسے انتہا تک پہنچایا۔ان کے بہت سے علمی ،ادبی، تصنیفی کارنامے ہیں۔ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے استاذ علامہ شبلی ہی کی طرح نوجوان اہل قلم کی تربیت کی اور مصنف بنائے۔دارالمصنّفین کے بیشتر رفقاء ومصنّفین انہیں کے فیض یافتہ تھے۔

سید صاحب دیسنہ میں پیدا ہوئے ندوہ میں تکمیل کی ۔الہلال سے کچھ دنوں تک وابستہ رہے پھر علامہ شبلی نے دکن کالج پونہ میں پروفیسر بنوادیا تھاان کی وفات بعد سب چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے اور دبستان شبلی کی آبیاری کی ۔آخر میں قاضی ہوکر ریاست بھوپال سے وابستہ ہوگئے تھے۔ریاست ختم ہوئی تو اپنی بیٹی سے ملاقات کے لئے کراچی گئے اور پھر آنے کی کوئی شکل نہ بن سکی۔وہیں وفات پائی اور کراچی کی خاک کا حصہ بنے۔رحمہ اللہ

(۲) حیات شبلی ص۲۰۹

(۳) مرقع کانفرنس ص۳۴

(۴) منشی مولوی رحمت اللہ رعد[۱۸۵۷-۱۹۲۱ء]ابن شیخ مراد بخش،شاعر تھے اور رعد تخلص تھا۔محقق کان پوری کی صحبت میں شعروشاعری کا آغاز ہوا۔نواب علی نفیس سے بھی اصلاح لی۔۱۸۸۲ء میں مطبع نامی کانپور قائم کیا۔پریس کی ضرورت سے خوش نویسی، مصلح سنگی اور مصوری میں مہارت حاصل کی۔ان کا مطبع خوبصورت طباعت کے لیے پورے ہندوستان میں مشہور تھا۔اسی پریس سے یہ بڑی معلوماتی جنتری شائع کرتے تھے، جوتمام ہندوستان میں مقبول تھی۔اپنے پریس سے ایک اخبار''اخبار عالم'' باتصویر جاری کیا۔خود ہی اس کی ادارت بھی کی۔ان کے ایک تربیت یافتہ مولوی فضل الرحمٰن تھے جن کی غیر معمولی سعی سے حلیم مسلم کالج قائم ہوا۔

علامہ شبلی کی متعدد کتابیں انہوں نے بڑے اہتمام سے شائع کیں۔الفاروق اسی مطبع سے نکل کر

شہرت کی بلندیوں پر پہنچی۔اس وجہ سے ان سے مراسم قائم ہو گئے تھے۔وہ سرسید کے دوست،کالج کے محسن اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سرگرم رکن تھے۔اس کے اجلاسوں میں اہتمام سے شریک ہوتے۔ قراردادیں پیش کرتے اور دوسروں کی قراداوں کی تائید بھی کرتے۔اس سے ان کے تعلیم سے شغف اور ملی ہمدردی کا اندازہ ہوتا ہے۔بقول مولوی عبدالرزاق کان پوری ''قومی مجالس میں ان کی تقریریں سننے کے قابل ہوتی تھیں۔فصیح البیان اور لطیفہ سنج تھے۔(یادایام ص۲۱۲-۲۱۳)

(۵) مرقع کانفرنس ص۳۱

(۶) مرقع کانفرنس ص۳۹

(۷) مرقع کانفرنس ص۳۹

(۸) روداد کانفرنس الہ آباد،ص۱۹۱،بحوالہ حیات شبلی ص۲۰۹

(۹) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ص۱۷

(۱۰) ایضاً

ooo

چھٹا اجلاس۔علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا چھٹا اجلاس ۲۷ تا ۳۰ ر دسمبر ۱۸۹۱ء کو کانفرنس کے مرکز علی گڑھ میں منعقد ہوا۔اس کی صدارت نواب محمد اسحاق خاں سی ایس آئی [۱۸۶۰-۱۹۱۷ء](۱) ابن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ [۱۸۶۰-۱۹۱۷ء] نے کی۔

علامہ شبلی اس اجلاس میں بھی شریک رہے۔پروگرام کا آغاز ہوا تو ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری نے سال گذشتہ ۱۸۹۰ء کی رپورٹ پیش کی۔اس رپورٹ میں جن اصحاب کمال نے ایجوکیشنل کانفرنس کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا،ان کا ذکر کیا گیا ہے۔اس میں ایک نام علامہ شبلی نعمانی کا بھی ہے۔اس رپورٹ میں ان کے مشہور علمی وتاریخی کارناموں مثلاً مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم،الجزیہ،المامون اور سیرۃ النعمان کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔اور ان کو کانفرنس کی تگ ودو کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔(۲) ہم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۳) کے اس نقطہ نظر سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں کہ علامہ شبلی کی یہ تمام علمی کاوشیں ان کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہیں۔سوائے ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' کے ان کی کسی کتاب کا تعلق ایجوکیشنل کانفرنس سے نہیں ہیں۔البتہ ایم اے او کالج کے مالی فائدے کی غرض سے انہوں نے یہ کتابیں کالج کو دیدی تھیں اور کالج نے انہیں شائع کیا۔یہ بات سرسید نے بھی لکھی ہے۔اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

کسی بھی میٹنگ کا طریقہ کار یہی ہے کہ اولاً گذشتہ میٹنگ کی قراردادوں پر عمل درآمد اور اس کی کارگذاری پیش کی جاتی ہے۔اور پھر اس کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ آیا گذشتہ قراردادوں اور فیصلوں پر عمل ہوا یا نہیں۔چنانچہ آنریری سکریٹری نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔بعد علامہ شبلی نعمانی

نے اس پر تبصرہ کیا۔ یہ تبصرہ ایجوکیشنل کانفرنس کی روداد سے مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] نے خطبات شبلی میں نقل کیا ہے۔ چونکہ یہ ایجوکیشنل کانفرنس کا بڑا اہم حصہ ہے، اس لئے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ اس دور میں علامہ شبلی کے تبصرے اور تجزیے کا انداز کیا تھا۔؟

ایجوکیشنل کانفرنس کی سالانہ رپورٹ پر ریمارک

جناب صدر انجمن صاحب!

میں آپ سے اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ گذشتہ سال کی ایجوکیشنل کانفرنس کی کارروائیوں کے متعلق آنریبل سکریٹری نے جو رپورٹ پڑھ کر سنائی ہے، اس پر کچھ ریمارک کروں۔

بے شبہ یہ افسوس کی بات ہے کہ پارسال جو رزولیشن پاس ہوئے ان کے متعلق عملی کارروائیاں بہت کم ہوئیں۔ نہ اسکالرشپ فنڈ میں کوئی معقول اضافہ ہوا، نہ اعلا تعلیم اور ادنی تعلیم کے موازنہ پر مضامین لکھے گئے، تاہم میں سکریٹری صاحب کے ان الفاظ سے کہ ''ہماری کانفرنس بے فائدہ چیز ہے اور مفت میں ہزاروں روپئے برباد کرتی ہے۔'' ہرگز اتفاق نہیں کرسکتا بلکہ اگر سکریٹری صاحب (۴) معاف فرمائیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی یہ رائے غلط اور بالکل غلط ہے۔

بے شبہ ایک ایسا شخص جو ایک عمر سے ان کوششوں میں مصروف ہے جس نے ان ہی افکار میں اپنے بال سفید کر دئے، جس کو معمولی طور پر دنیا میں زیادہ رہنے کی توقع نہیں رہی ہے ضرور ہے کہ اس کا دل تھوڑی تھوڑی بات پر رنجیدہ ہو اور اس حالت میں وہ مجبورانہ ناامیدی کے الفاظ کہہ اٹھے۔ بے شبہ وہ یہی چاہے گا کہ ہتھیلی پر سرسوں جمائے اور اپنی کوششوں کے تمام نتیجے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ برسوں کے کام دو دن میں نہیں ہو سکتے۔ قوم میں ایک مدت سے خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تعصب، غفلت، جہالت کی کچھ حد نہیں رہی تھی۔ تمام روحانی قوتیں افسردہ ہوگئی تھیں۔ دل و دماغ عموماً بیکار ہوگئے تھے۔ کیا ایسی قوم صرف دو چار لکچروں اور

اسپیچوں سے سنبھل سکتی ہے؟

ایسی مردہ قوم کے لئے کم ازکم پچاس برس کا زمانہ درکار ہے کہ اس کو ترقی کا خیال بھی آئے۔ ہماری کانفرنس کی کچھ کم کامیابی ہے کہ اتنے ہی دنوں میں اس نے تمام قوم میں ایک سرگرمی پیدا کردی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت کانفرنس ہال قریباً ایک ہزار کرسیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کیا پانچ برس پہلے بھی آپ ایسے مجمع اور سرگرمی کی توقع کر سکتے تھے؟۔

ہندوستان میں آج تک مسلمانوں کا ایک بھی ایسا عظیم الشان مجمع ہوا ہے؟ اس سے پہلے کبھی کسی موقع کا نشان دیا جاسکتا ہے؟ جس میں لوگ تعلیمی مقاصد پر غور کرنے کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ یہ جوش اور سرگرمی کس نے پیدا کی؟ کانفرنس کے ان ہی گذشتہ اجلاسوں نے جن کو ہمارے آنریبل سکریٹری بے سود اور بے فائدہ بتاتے ہیں۔

یورپ جس کی ترقیوں پر آج تمام زمانہ رشک کر رہا ہے، ایک دن میں اس حالت پر نہیں پہنچا تھا۔ یہ سب کچھ مبالغہ نہیں کہ یورپ نے جس تدریج سے ترقی کی تھی، ہمارے ملک کی رفتار اس نسبت سے زیادہ تیز ہے۔

انسان کی یہ ظاہر بینی ہے کہ اس کی نگاہ صرف ان باتوں پر پڑتی ہے جو علانیہ ظاہر اور محسوس ہوں۔ وہ ان پوشیدہ اثروں سے اکثر بے خبر ہوتا ہے جو اندر اندر اپنا کام کرتے ہیں اور آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتے۔

دنیا میں اس قسم کے جتنے کام ہوئے ہیں ایک مدت تک ان کا مادہ بنتا رہا ہے۔ پھر ان کی صورت ظہور میں آئی ہے۔

عباسیوں کی حکومت بہ ظاہر ایک دن میں قائم ہوگئی تھی، لیکن اس کی بنیاد کی ریشہ دوانیاں ایک مدت سے ہو رہی تھیں۔ جس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ ہماری کانفرنس کا اثر بہ ظاہر کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوا لیکن اس کی وجہ سے رفتہ رفتہ دلوں میں تعلیم کی طرف جو میلان پیدا ہوتا جاتا ہے وہ ذرا سے غور سے صاف معلوم ہو سکتا ہے۔ بہت سے لوگ جو کانفرنس سے اٹھ کر جاتے ہیں۔ ان کو خود نہیں محسوس ہوتا کہ وہ کانفرنس سے کیا چیز لے کر گئے، لیکن ان جلسوں کا اثر چھپ کر ان کے

ساتھ جاتا ہے۔

قوم کو آج جس چیز کی سخت ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کی قوتیں متحد ہو کر کام کریں۔ ترقی کا خیال لوگوں کو عموماً پیدا ہو گیا ہے لیکن تدبیریں مختلف اختیار کی جاتی ہیں اور اس وجہ سے کوئی معقول نتیجہ نہیں پیدا ہوتا۔ کسی کی رائے ہے کہ ترقی کے لئے صنعت وحرفت کی ضرورت ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ ادنی تعلیم کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص کی الگ الگ رائے ہے اور وہ اپنی رائے کے موافق اس کام میں مصروف ہے، لیکن جب تک سب کی رائے متفق ہو کر ایک طرف نہ مصروف ہو گی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔

اس کانفرنس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے اور اسی سے اس نتیجہ کی امید کی جاسکتی ہے کہ ایک دن رایوں کے اختلافات رفع ہو کر سب ایک رستہ پر آجائیں گے۔

ترقی کے لئے بڑی ضروری چیز یہ ہے کہ لوگوں میں قومی مذاق پیدا کیا جائے، جو صرف اس طریقہ سے حاصل ہو سکتا ہے کہ قوم کا ایک معتدبہ گروہ ایک جگہ جمع ہو اور سب کے خیال میں ہو کہ ہم صرف قوم کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ غرض جس قدر اس کانفرنس سے حاصل ہو سکتی ہے، ہرگز کسی دوسری چیز سے نہیں ہو سکتی۔ اس مجمع میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں جو باتیں سنتے ہیں، جس طرف آنکھ اٹھاتے ہیں، جس سے ملتے ہیں، جہاں بیٹھتے ہیں، ہر لحظہ، ہر وقت قومی ہی خیال ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی عمدہ اثر ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم کو ایک قومی میلہ کی ضرورت ہے، جہاں کہ جو کچھ ہو قومی لباس میں ہو۔ ہماری یہ کانفرنس فرض کرو کچھ کام نہیں کرتی۔ بلا سے نہیں کرتی، لیکن وہ ایک قومی میلہ تو ہے۔

ہندوستان کے بڑے بڑے میلے جہاں ہزاروں کوس کا سفر کر کے لوگ پہنچتے ہیں، کیا اس سے زیادہ دلچسپی کے قابل ہیں۔ اس ہال میں جس رتبہ کے لوگ جمع ہیں کیا ان کی صورتوں سے بڑھ کر کوئی چیز دیکھنے کے لائق ہے۔ کون دل ہے جس کو یہ آرزو نہیں ہے کہ اس مشہور مصنف اور مدبر ملک کے خیالات سے واقف ہو، جس کے زور قلم نے ہماری زبان کو یورپ کی زبانوں کا ہم سر

بنا دیا ہے، کس کو یہ تمنا نہیں کہ اس نامور ماہر لغات کی صورت دیکھے، جس نے یورپ کی متعدد زبانوں میں وہی کمال حاصل کیا ہے جو مشرقی زبانوں میں اس کو حاصل ہے۔ کون ہے جس کی یہ خواہش نہیں ہے کہ اس بلند رتبہ شاعر کا کلام سنے جس نے اردو میں نیچرل نظم کی بنیاد ڈالی ہے۔ کس کو یہ ہوس نہیں ہے کہ اس مشہور مصنف سے ملے جس کے قلم نے ایک لاکھ صفحے لکھ کر ڈال دئے ہیں۔ کیا ہندوستان میں اور کوئی مجمع ہے جو نواب عماد الدولہ مولانا سید علی بلگرامی (۵) جو امید ہے کہ آج ہی آنے والے ہیں، مولوی الطاف حسین حالی، شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی کو ایک جگہ مجتمع دکھا سکتا ہے۔ ہزاروں میل کا سفر، تکلیفات مسافرت، صرف زر، ان سب کا یہ کافی معاوضہ ہے کہ ہم ان نامور شخصوں کی صورتیں دیکھ لیں۔ غالباً یہ صرف میرا خیال نہیں ہے بلکہ ان نو سو بزرگوں سے جو اس ہال میں جمع ہیں، اگر پوچھا جائے تو سب یک زبان ہو کر میرا ساتھ دیں گے اور ایک شخص بھی آنریبل سکریٹری کے اس قول سے متفق نہ ہوگا کہ ہماری کانفرنس بے فائدہ اور بے حاصل ہے۔" (۶)

علامہ شبلی کی اس جذباتی اور مدلل تقریر کے بعد اجلاس کے شرکاء کا نقطہ نظر بدل گیا اور سرسید نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔ اسی اجلاس میں مولوی بشیر الدین [۱۸۵۸-۱۹۵۶ء] مدیر اخبار البشیر اٹاوہ (۷) نے ایک قرارداد پیش کی کہ

> "اس جلسہ کی رائے ہے کہ اسلامی تاریخ کے بعض امور اہم کی نسبت یورپ میں شدید غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں اور رفتہ رفتہ یورپ کے مصنفوں نے ان کو بطور اصول موضوعہ بلکہ مثل علوم متعارفہ کے اپنی تصنیفوں میں قرار دیا ہے۔ مسلمان ان کو پڑھ کر غلطی میں پڑتے ہیں۔ ان غلطیوں کے دور کرنے کی غرض سے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں رسالے لکھے جائیں۔ اور انگریزی رسالے یورپ میں شائع کئے جائیں۔" (۸)

بانی کانفرنس سرسید احمد خاں نے اس کی تائید کی۔ علامہ شبلی نے بھی اس قرارداد کی حمایت کی اور اس کی تائید میں ایک مختصر سی تقریر بھی کی۔ اس تقریر کا عنوان "اسلامی علوم وفلسفہ کی تاریخی

ترتیب'' تھا۔ وہ تقریر درج ذیل ہے:

اسلامی علوم وفلسفہ کی تاریخی ترتیب

جنابِ صدر انجمن!

ہماری کانفرنس کا اصلی مقصد اگرچہ صرف مسلمانوں کی موجودہ تعلیم سے بحث کرنا ہے لیکن ضمنی واستطرادی طور پر مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم بھی اس کی وسعت کے دائرہ میں داخل ہے اور اسی بنا پر کانفرنس کے پچھلے اجلاسوں میں اس موضوع پر متعدد مضامین پڑھے جا چکے ہیں۔

یورپ میں چند برس سے ایک کانفرنس قائم ہے، جس کا مقصد مشرقی اقوام کے علوم کی تحقیق ہے، اس کانفرنس کے متعدد اجلاس یورپ کے مشہور شہروں میں بڑی شان وشوکت سے منعقد ہوئے اور السنۂ مشرقیہ کے بڑے بڑے ماہروں نے جمع ہو کر نہایت نادر اور عجیب تحقیقاتیں پیش کیں، ویانا کے اجلاس میں ایک فاضل نے ہارون الرشید (۹) کے دفتر خراج کا ایک کاغذ پیش کیا، جو خود ہارون الرشید کے زمانہ کا لکھا ہوا تھا، کانفرنس نے اس عجیب یادگار کا فوٹو لیا جو روئداد کانفرنس کے ساتھ شامل کر کے شائع کیا گیا ہے۔

یورپ نے یہ مہتم بالشان کام جو اپنے ذمہ لیا درحقیقت ہمارا فرض تھا، اگر ہم اپنی کوششوں سے یورپ کو بالکل سبک دوش نہیں کر سکے، تاہم کم از کم اس قدر تو ضرور ہے کہ ہم ان تحقیقات کے متعلق جو خود ہماری نسبت ہوں یورپ کا ہاتھ بٹائیں، یہی خیال ہے جس نے مجھ کو اس رزولیوشن کے پیش کرنے کی جرأت دلائی ہے۔

رزولیوشن کا مضمون بہ ظاہر ایک پامال مضمون ہے اخبارات اور رسالوں میں متعدد تحریریں اس پر لکھی جا چکی ہیں، لیفٹیننٹ گورنر بنگال نے انعام کا اشتہار دے کر اس قسم کے مضمون پر ''ایسے'' لکھوائے تھے اور مولوی عبیداللہ (۱۰) اور مولوی کرامت علی (۱۱) نے اس پر نہایت مفید رسالے لکھے۔ اگرچہ اشتہار کا عنوان اسی قدر تھا کہ مسلمانوں نے یونان سے کیا کیا لیا اور یورپ میں مسلمانوں کے ذریعہ سے وہ علوم وفنون کیوں کر پہنچے، لیکن ان رسالوں میں جستہ جستہ مسلمانوں کی

خاص علمی ایجادات سے بھی بحث تھی اور کچھ شبہہ نہیں کہ جس زمانہ میں یہ رسالے لکھے گئے، اس وقت کے لحاظ سے نہایت قابل قدر اور جدید معلومات پر شامل تھے۔ ان رسالوں کے بعد اس قسم کے سینکڑوں مضامین لکھے گئے ہیں، جن میں اگرچہ علمی تحقیقات کا عنصر کم تھا، لیکن چونکہ مدح وفخر کی چاشنی تھی، اس لیے ان کو قبول عام حاصل ہوا۔ اور رفتہ رفتہ یہ دعویٰ کہ ہم نے یونانیوں پہ یہ علوم اضافہ کیے ہمارے قومی لٹریچر کے علوم متعارفہ بن گئے ،۔ اس سے ایک سخت نقصان یہ ہوا کہ تحقیقات کی رغبت کم ہوگئی اور جو مسئلہ نہایت بحث، نہایت غور، نہایت کاوش کے قابل تھا، مقلدانہ طریق پر طے کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال نہایت غور طلب ہے کہ مسلمانوں نے علوم حکمیہ میں کوئی معقول اضافہ کیا یا نہیں، ہمارے ہاں تو اس کی تحقیق کے وسائل مفقود ہیں، لیکن یورپ جو ان تحقیقاتوں کا مرکز ہے، وہ بھی اس بحث کا قطعی فیصلہ نہیں کر سکا ہے، یہ سچ ہے کہ یورپ کے بعض مصنّفین مثلاً ڈریپر (۱۲)، گبن (۱۳) جامعین انسائیکلو پیڈیا نے نہایت آب وتاب سے مسلمانوں کے کارنامے دکھائے ہیں، لیکن ایجاد واختراع کا ذکر ان کی تحریروں میں بھی کم آتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر یہ مصنّفین عربی زبان اور عربی تصنیفات سے واقفیت نہیں رکھتے، اس لیے ان کی رائیں اجتہاد کا رتبہ نہیں رکھتیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض موقعوں پر ان کی مدح تحسین ناشناس ہوجاتی ہے، ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ''علم الحیوانات'' پر دمیری (۱۴) نے جس رتبہ کی کتاب لکھی ہے، کئی سو برس کے بعد بھی گبن کو اس رتبہ کی کتاب لکھنی نصیب نہیں ہوئی۔'' دمیری کی کتاب الحیوانات ہمارے سامنے ہے اور جس رتبہ کی ہے ہم خود اس سے شرمندہ ہیں۔

دوسری طرف یورپ میں ایک گروہ کثیر کی رائے ہے کہ مسلمانوں نے علوم حکمیہ میں کچھ اضافہ نہیں کیا۔ یہ معمولی لوگوں کا خیال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے مصنّفین جو عربی زبان کے پورے ماہر ہیں، ان کی رائے ہے۔ رینان (۱۵) فرانس کا ایک مشہور پروفیسر ہے جس نے حکیم ابن رشد (۱۶) کی لائف اس جامعیت اور تحقیق سے لکھی ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ اس نے ایک بڑے مجمع میں لکچر دیا تھا۔ جس کا عنوان تھا، ''اسلام اور سائنس'' اس کے بعض فقرے یہ ہیں۔

مسلمان ان تمام چیزوں سے جن کو علوم عقلیہ کہا جاسکتا ہے کئی سو میل دور ہیں۔ مسلمان اپنے زمانہ کے مشہور فاتح تھے، لیکن یقیناً وہ فلاسفر نہ تھے۔ فلسفہ کو مسلمانوں سے صرف یہ تعلق تھا کہ وہ عربی زبان میں نقل ہو کر آگیا ہے، نہ یہ کہ وہ مسلمانوں کا ہے۔

ابوالفرج جو یورپ کا مشہور عربی داں مورخ ہے لکھتا ہے کہ ''عرب کا علم جس پر ان کو ناز ہے، علم اللسان، واقفیت اصطلاحات، سخن سنجی اور شاری ہے، لیکن اگر فلسفہ کی نسبت پوچھتے ہو تو خدا نے ان کو یہ دماغ ہی نہیں دیا تھا۔ رینان اس قول کو نقل کر کے کہتا ہے کہ کیا اس سے زیادہ سچ ہوسکتا ہے۔'' پروفیسر منک (۱۷) فرانس کا ایک مشہور عالم ہے۔ جس نے فلسفۂ عرب پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور چونکہ وہ عربی، عبرانی، لاطینی زبانوں کا بہت بڑا ماہر تھا اور مسلمانوں کی تصنیفات اصلی اور ترجمہ شدہ دونوں پر اس کو کافی اطلاع حاصل تھی، اس لیے اس نے جو کچھ لکھا ہے، مجتہدانہ لکھا ہے۔ وہ فارابی (۱۸)، بوعلی سینا(۱۹)، ابن رشد کی تصنیفات پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ لوگ فلسفہ ارسطو (۲۰) کے نہایت عمدہ شارح ہیں، لیکن خود کسی فلسفہ کے موجد نہیں ہیں۔ ہمارے علماء کے اقوال سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ عبدالکریم شہرستانی (۲۱) نے ملل ونحل میں لکھا ہے کہ فارابی وابن سینا نے جو کچھ کہا ہے وہ نہایت خفیف اختلاف کے ساتھ صرف ارسطو کا فلسفہ ہے۔

رینان اور منک کے سوا اور بہت سے یورپ کے نامور مصنفوں کی یہی رائے ہے۔ لیکن چونکہ ہم صدائے مدح کے زیادہ خوگر ہو گئے ہیں، اس لیے ان کی آوازیں ہمارے کان میں نہ پہنچ سکی ہیں۔ خود ان لوگوں کے خیالات سے متفق نہیں ہوں، لیکن اس قدر ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ جیسا کہ آج تک بدیہی سمجھا گیا ایسا بدیہی نہیں ہے۔ اور دو چار یورپین مصنفوں کی تقلید کی بنا پر طے نہیں کیا جاسکتا۔

اصل یہ ہے کہ اب تک یورپ میں اس بحث پر پوری توجہ نہیں کی گئی۔ مخالف اور موافق دونوں فریق نے زیادہ استقرا اور تفتیش سے کام نہیں لیا اور درحقیقت ایک غیر قوم کو ہماری علمی ترقیوں پر اس سے زیادہ توجہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ بے شبہہ یورپ میں مسلمانوں کی علمی ترقیوں پر

بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ ان بے شمار تصنیفات میں صرف دو ہی چار کتابیں ہیں جو مجتہدانہ اور اصل ماخذ کی واقفیت سے لکھی گئی ہیں۔ اس خاص امر میں یورپ نہایت الزام کے قابل ہے کہ اگلے زمانہ میں جب یورپ مسلمانوں کی ہر بات کو رقابت اور مخالفت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اس وقت مسلمانوں کے اخلاق، علوم، تمدن کی نسبت جو رائیں قائم ہوگئیں، آج تک مختلف طریقوں میں ان ہی خیالات کا تتبع کیا جاتا ہے۔ زمانہ حال کے مصنّفین میں بہت کم ہیں جنھوں نے عربی کے اصل ماخذ کی تلاش وجستجو کی ہو اور اس بحث پر مجتہدانہ رائے قائم کرنے کا حق حاصل کیا ہو۔ یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ انصاف پرست یورپین مصنفوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ مسلمانوں کی عمدہ سے عمدہ تاریخ جو زمانۂ حال میں لکھی گئی ہیں، موسیو سدیو فرانسیسی (۲۲) کی تاریخ ہے۔ وہ اس بحث میں لکھتا ہے کہ

''موجودہ زمانہ تک ایشیائی ہیئت اور ریاضی کی تاریخ بالکل تاریکی میں پڑی ہوئی ہے۔ علوم اور السنہ کے دوستوں نے اکثر یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ رخنہ بھر دیا جائے، لیکن ان علما نے جو قلمی کتابوں کی تحقیق اور جستجو میں شب بیداریاں کرتے ہیں، اس طرف بہت کم توجہ کی۔ ہم لوگ جب ان تصنیفات کو پڑھتے ہیں جو اس صدی کے آغاز میں عرب کی تحقیقات کے متعلق لکھی گئیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو دستاویزیں ہمارے ہاتھ میں دیں، وہ بالکل ناکافی ہیں تو ہم کو کسی قدر رنج ہوتا ہے۔ دو چار مختصر رسالے جو بعض بعض مقامات میں چھاپے گئے، چنداں ضروری نہیں ہیں۔ چند کتابیں جو لیٹین زبان سے نہایت غلط ترجمہ کی گئیں، جن کے مترجم اصطلاحی الفاظ کا بڑا حصہ نہیں سمجھتے تھے اور صرف آواز اور صورت کا ترجمہ کرنا چاہتے تھے، چند مفروضات اور قیاسات جو شکوک سے لبریز ہیں۔ چند عام نتیجے جن کی دلیلیں موجود نہیں صرف یہ سرمایہ ہے جس کی بنا پر ہم ان ترقیوں کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں، جو عہد اوسط (یعنی مسلمانوں کے زمانہ) میں علم ہیئت کے متعلق ظہور میں آئیں۔ ایسے ادھورے اور ناتمام سامان پر یہ عجیب

خفیف العقلی ہے کہ یورپ نے قطعاً ان مسائل کا فیصلہ کر دینا چاہا ہے جو علوم کی تاریخ میں نہایت امپارٹنٹ مسائل ہیں، نہ تو عربی کے کم یاب نسخوں کی طرف رجوع کیا گیا، نہ اطمینان اور یقین کے ضروری سامان بہم پہنچائے گئے۔ تاہم یورپ چلا کر کہتا ہے کہ عرب کے ہیئت داں صرف یونانیوں کے قیاسات کے پیرو ہیں۔عرب نے یہ البتہ کیا ہے کہ حساب میں کارڈ کے بجائے سائن رکھ دیا ہے، لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھے۔

موسیو سیدیو نے ان کے بعد اپنے والد پروفیسر سیدیو کی اس اتفاقی اطلاع کا ذکر کیا ہے جو ان کو ایک عربی کتاب سے ہوئی اور جس سے معلوم ہوا کہ بہت سے علمی ایجادات جن کو یورپ والے رنگوا ٹین اور بنکوراہی وغیرہ کی ایجاد سمجھتے تھے،عرب کی ایجاد تھی۔موسیو سیدیو نے ایک تفصیلی بحث کے بعد یہ جملے لکھے ہیں،''بہت سی وہ کتابیں جو ہم تک نہیں پہنچیں ممکن ہے کہ ان اطلاعوں پر شامل ہوں جو نئے نظام کی تکمیل میں کام آسکیں،ممکن ہے کہ عرب وحشیوں کی یہ تصنیفات ہم کو سکھا دیں کہ وہ ایجادات جن کی ایجادات کا فخر ہم دور جدید کے علمائے یورپ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔اہل عرب ان سے بے خبر نہ تھے۔

موسیو سیدیو کی یہ امید بیجا نہیں ہے۔ یورپین مصنّفین جنھوں نے مسلمانوں کی نسبت یہ قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ انھوں نے''علوم وفنون قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا'' یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انھوں نے اسلامی تصنیفات کا کافی استقصا کیا ہے۔ابن سینا نے جس کی نسبت پروفیسر منک کہتے ہیں کہ وہ صرف ارسطو کے فلسفہ کا شارح ہے،تصریح کی ہے کہ کتاب الشفا میں میں نے ارسطو کے مسائل بیان کیے ہیں،لیکن میرے نزدیک جو''فلسفہ صحیح ہے اس کو میں دوسری کتاب حکمۃ مشرقیہ میں لکھ چکا ہوں۔'' ابن سینا کی یہ تصنیف پروفیسر منک کو نہیں ملی،جیسا کہ انھوں نے خود اپنی کتاب میں اعتراف کیا ہے۔اسی طرح فارابی،امام غزالی،فخر

رازی وغیرہ کی بہت سی تصنیفات ہیں جن سے یورپ آج تک بے خبر ہے۔

میری اس تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ یہ مسئلہ نہایت غور طلب اور قابل بحث مسئلہ ہے اور اس قابل نہیں کہ مقلدانہ طور پر خوش اعتقادی کے ساتھ اس کا کوئی پہلو تسلیم کر لیا جائے۔ ہماری کانفرنس میں ایسے نامور علما شامل ہیں جو ایشیا اور یورپ کی مختلف زبانوں کے پورے ماہر ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ عرب کے اصل ماخذ اور یورپ کی تحقیقات ان دونوں کے موازنہ سے اس بحث کا تصفیہ کریں۔ اور جو پہلو اختیار کریں، اس کو ایسے قوی اور مصرح دلائل سے ثابت کریں کہ شک وشبہہ کا موقع باقی نہ رہے۔ اسی بنا پر میں کانفرنس کے سامنے یہ رزولیوشن پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس مضمون پر ''ایسے'' لکھوائے جانے کے لیے وہ اپنی منظوری ظاہر کرے۔'' (۲۳)

بعد ازاں اس اجلاس میں پیش کردہ تمام قراردادوں کا جائزہ لیا گیا۔ اور درج ذیل امور فیصل ہوئے:

۱۔ تعلیم نسواں کی اہمیت کے احساس کے ساتھ اسے ترقی دینے کا فیصلہ ہوا۔

۲۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ کانفرنس کا ایک اپنا ترجمان شائع کیا جائے۔

۳۔ طے پایا کہ کم عمر بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان نہ بھیجے جانے کی تلقین کی جائے۔

۴۔ اسلامی تاریخ پر کچھ انگریز اور مغربی مصنّفین کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے کانفرنس کی طرف سے رسالوں کی اشاعت کی جائے۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے جو مختلف کتابیں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، الجزیہ، المامون اور سیرۃ النعمان وغیرہ تحریر فرمائی ہیں ان کے لئے موصوف کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور ان کی ادبی اور تاریخی خدمات کی توصیف میں بھی ایک تجویز پاس کی گئی۔ (۲۴) اور انہی فیصلوں پر کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچی۔

تعلیقات وحواشی:

(۱) نواب محمد اسحاق خاں سی ایس آئی [۱۸۶۰-۱۹۱۷ء] جہاں گیرآباد میرٹھ کے تعلقہ دار، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پوتے تھے۔ الطاف حسین حالی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آگرہ کالج سے اول درجہ میں انٹرنس پاس کیا۔ ۳۲/سال کی عمر میں سول سروس کے لئے منتخب ہوئے۔ اسسٹنٹ مجسٹریٹ سے ملازمت کا آغاز کیا اور ترقی کر کے سیشن جج ہوئے۔ کچھ دنوں تک ریاست رامپور میں فائنانس منسٹر رہے۔ ۱۹۱۲ء میں سفر حج کیا، جس میں مقامات مقدسہ بیت المقدس اور حلب وغیرہ گئے۔ واپس آکر نواب وقارالملک کی خواہش پر ملازمت ترک کر دی اور علی گڑھ کالج کے آنریری سکریٹری منتخب ہوئے۔ یہ خدمت وہ آخری سانس تک کرتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں انتقال کیا اور دہلی کے قبرستان حضرت نظام الدین میں مدفون ہیں۔ (خطبات عالیہ ص ۵۷-۵۹)

(۲) مرقع کانفرنس، ص ۴۳

(۳) مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۴-۱۹۵۰ء] رئیس حبیب گنج علی گڑھ، عالم وادیب تھے۔ دسیوں کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ ان کے علمی وادبی مقالات کا مجموعہ مقالات شروانی کے نام سے شائع ہوا۔ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ مجموعہ کلام کاروان حسرت شایع ہو چکا ہے۔ برسوں تک ریاست حیدرآباد میں وزیر محکمہ امور مذہبی رہے۔ جامعہ عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر ہونے کا فخر انہیں کو حاصل ہے۔ تحریک ندوہ میں پیش پیش رہے اور اس کی بڑی خدمت انجام دی۔

(۴) سکریٹری: سرسید احمد خاں تھے۔

(۵) مولوی سید علی بلگرامی [۱۸۵۱-۱۹۱۱ء] جیسا کہ نام سے واضح ہے کہ بلگرام کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں عربی وفارسی کی تحصیل کی بعدازاں کیننگ کالج لکھنو میں داخل ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ رڑکی کالج سے انجینئرنگ بھی کی۔ پھر انگلستان گئے اور وہاں جرمن اور فرانسیسی زبان سیکھی نیز کیمیا، طبیعات، معدنیات وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ انگلستان سے جرمنی اور فرانس گئے۔ واپسی میں کچھ دن اٹلی میں قیام کیا اور اطالوی زبان بھی سیکھی۔ واپس آئے تو حیدرآباد میں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں ہوم سکریٹری بنائے گئے۔ اس

کے بعدانہوں نے مرہٹی زبان سیکھی اورکیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔وہ ۱۴؍ زبانیں جانتے تھے۔اوران کے لہجے میں بولتے تھے۔ان کی علمی قابلیت کے اعتراف میں انگلستان کی یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی سندتفویض کی۔موسیو لیبان کی تمدن ہنداورتمدن عرب کا انہوں نے اردو میں ترجمہ کیا۔۳مئی ۱۹۱۱ءکووفات پائی۔

(۶) بحوالہ خطبات شبلی ص ۱۷-۲۰

(۷) مولوی بشیرالدین [۱۸۵۶-۱۹۵۶ء] بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے ایک رسالہ البشیر نکالتے تھے۔جو بہت پڑھاجاتا تھا۔ابتدامیں علامہ شبلی نعمانی سے بڑے تعلقات تھے۔ بعدمیں تعلقات اچھے نہیں رہے۔وہ ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوتے اوراس سے بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ سرسیداحمد خاں اورعلی گڑھ کالج کے بڑے حامی تھے،اس زعم میں وہ اکثر علامہ شبلی اورندوہ پرسخت تنقیدیں کیا کرتے تھے۔علامہ شبلی کوندوہ سےاس قدر دلچسپی تھی کہ وہ اس پر تنقیدیں برداشت نہیں کرسکتے تھے۔یہی تنقیدیں دونوں میں دراڑ کا سبب بنیں۔

(۸) مرقع کانفرنس ص ۴۵

(۹) خلیفہ ہارون الرشید[۷۶۶-۸۰۹ء] مشہورعباسی خلیفہ جو۷۸۶ء سے۲۴؍مارچ ۸۰۹ءتک مسندخلافت پرمتمکن رہےاورحکومت عباسیہ کوبڑااستحکام بخشا۔ایک زمانہ میں اس کی فوجیں فاسفورس تک پہنچ گئی تھیں لیکن معاہدہ امن قرار پایااورواپس آگئیں۔اس کا دورحکومت ثقافتی،سائنسی اور مذہبی رواداری کادورقراردیاجاتا ہے۔

(۱۰) مولوی عبیداللہ:تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۱) مولوی کرامت علی:تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۲) ڈریپر:(John William Draper.1811-1882) یہ متعددعلوم وفنون میں درک رکھتے تھے۔ امریکہ سے گریجویشن کیا۔نیویارک یونیورسٹی میں استادرہے۔متعددکتابیں لکھیں۔ان کی مشہورکتاب History of the Conflict between Religion and Scince ہے۔اس میں سائنس اورمذہب کے درمیان رشتے کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(۱۳) گبن: (Edward Gibbon.1737-1794) مشہور ادیب اور مورخ و مصنف تھا۔ آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی۔اس نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں قلم بند کیں۔انگلش گرامر پر اس کی کتاب نے بڑی شہرت پائی۔اس نے پہلی کتاب An Essay on the Study of Litratur لکھی۔بعد میں The History of the Decline and Fall of the Roman Empire مرتب کی۔ یہ کتاب ۶/جلدوں میں ہے۔۱۷۸۸ء میں آخری جلد شائع ہوئی، اس میں ۱۱۸۰ء سے ۱۴۵۳ء تک کی تاریخ ہے۔گبن ۱۷۸۱ء سے ۱۷۸۴ء تک پارلیامنٹ کا رکن بھی رہا۔ ۱۶/جنوری ۱۷۹۴ء میں لندن میں وفات پائی۔

(۱۴) علامہ محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ بن علی کمال الدین محمد الدمیری[۱۳۴۱-۱۴۰۵ء] حلقہ اردو میں علامہ دمیری کے نام سے معروف ہیں۔قاہرہ میں پیدا ہوئے۔جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی۔اور اپنے عہد کے ممتاز محدث، فقیہ، ماہر فلسفہ و تاریخ قرار پائے۔ان کا سب سے عظیم الشان کارنامہ حیات الحیوان ہے۔ بلکہ ان کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر آج بھی مفقود ہے۔اس میں انہوں نے روئے زمین پر پائے جانے والے ۱۰۶۹ جانوروں کا ذکر کیا ہے۔جس میں ان جانوروں کا حلیہ، رنگ و نسل وغیرہ کی تمام تفصیلات قلم بند کی ہیں۔اس کتاب کے مفصل جائزے پر متعدد مقالات لکھے گئے۔ان کے علاوہ علامہ دمیری نے خلفاء کا تذکرہ بھی لکھا ہے۔

(۱۵) رینان Ernest Renan [۱۸۲۳-۱۸۹۲ء] فرانسیسی مستشرق: فرانس کے شہر ٹریگر میں ایک ملاح کے گھر پیدا ہوا۔عیسائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ابن رشد پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ دسیوں کتابیں لکھیں۔اور بیشتر کتابوں میں اسلام، شعائر اسلام اور شارع اسلام پر ناروا تنقیدیں کی ہیں۔ چونکہ عربی زبان سے پورے طور پر واقف نہیں تھا، اس لئے سخت غلطیاں کیں۔علامہ شبلی نے اس کی بعض کتابیں پڑھی تھیں اور بعض کے تراجم کے ذریعہ اس کے خیالات سے واقفیت تھی، سیرت اور مکاتیب میں اس پر تنقید کی ہے۔

(۱۶) علامہ ابن رشد (Averroes.1126-1198) امام محمد بن احمد بن رشد۔ابن رشد کے نام سے معروف ہیں۔ان کو ارسطو کے ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے۔قرطبہ میں پیدا ہوئے۔قانون اور طب کی تعلیم

قرطبہ میں حاصل کی۔طبیب کی حیثیت سے مراکش گئے لیکن جلد ہی قرطبہ بلالئے گئے اور قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔انہیں سائنس اور فلسفہ میں درک حاصل تھا۔یہ ایک بڑے مصنف تھے۔ضائع ہونے کے باوجود بڑی قیمتی تصنیفات یادگار ہیں۔تہافت التہافت ارسطو کی بوطیقا اور مابعدالطبیعات کی شروح اور مذہب وفلسفہ کے باہمی روابط ان کی اہم تصنیفات ہیں۔خاص طورآخرالذکر بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے۔اس کے فلسفیانہ مباحث پرابن رشد کومسلمانوں نے ملحد ٹھہرایااور یورپ نے بھرپور استفادہ کیا۔ ۱۰ردسمبر ۱۱۹۸ء میں مراکش میں وفات پائی۔

(۱۷) پروفیسر منک:تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۸) ابونصرمحمد بن محمد الفارابی [۸۷۰-۹۵۰ء]مشہور مسلمان ماہر فلسفہ اور سائنس داں تھے۔مدۃ العمر علم وفن کی تحصیل میں سرگرم رہے۔مطالعہ اور تحصیل علم ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ایک روایت کے مطابق انہوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال حصول علم میں صرف کئے۔فارابی ہی کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک رات وہ مطالعہ میں مشغول تھے کہ چراغ کا تیل ختم ہوگیا۔ان کی ابھی تشنگی علم دور نہیں ہوئی تھی۔چنانچہ وہ گھر سے باہر نکل آئے اور پہرہ دار سے کہا کہ وہ کچھ دیر رک جائے تو اس کے چراغ کی روشنی میں اپنا سبق یاد کرلے۔چنانچہ پہرہ دار ٹھہر گیا اور ابونصر فارابی نے اس کے چراغ کی روشنی میں اپنا سبق یاد کیا۔ دوسرے دن پھر فارابی نے پہرہ دار کو روکا،مگر وہ آج نہیں رکا تو ابونصر فارابی نے اس سے ساتھ چلنے اور راہ میں اس کے چراغ کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی اجازت چاہی۔پہرہ دار نے اجازت دیدی،مگر فارابی کے روز روز کے مطالبہ سے بچنے کے لئے اگلے دن پہرہ دار نے ایک چراغ اسے لاکر دیدیا۔

ابونصر فارابی فلسفہ وسائنس کے علاوہ متعدد علوم میں درک وبصیرت رکھتے تھے۔ان کی سائنسی ایجادات وتحقیقات کا شہرہ بھی یورپ تک پہنچا اور ایک عرصہ تک یورپ ان کے علم وفن سے خوشہ چینی کرتا رہا۔علامہ شبلی نے اسی برتری علم وفن کے سبب اپنے کلام میں ان کا ذکر کیا ہے:

اب بھی لندن میں غزالی کی ہے شہرت کیسی
اب بھی جرمن میں ہے بو نصر کا چرچا کیسا

(۱۹) شیخ الرئیس ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا [۹۸۰-۱۰۳۷ء] جوابن سینااور بوعلی سینا کے

ناموں سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ابن سینا طب ،حکمت اور فلسفہ کے میدان میں یکتائے روزگار بلکہ دانائے راز تھے۔''القانون فی الطب''ان کی انتہائی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔جس سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔حتیٰ کہ یہ کتاب ایک مدت تک یورپ کے نصاب تعلیم میں شامل رہی اور پڑھی پڑھائی گئی۔''الادویہ''ان کی دوسری مشہور کتاب ہے۔دنیائے طب وحکمت میں ان دونوں کتابوں کو صحائف کا درجہ حاصل ہے۔

سفر قسطنطنیہ میں وہاں کے کتب خانوں میں علامہ شبلی نے ابن سینا کی تصنیفات وتالیفات کو بغور دیکھا تھا۔اس کی تفصیل سر سید احمد خاں[۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے نام خطوط میں لکھی ہے۔اس کے کارناموں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ابن سینا کا ذکر علامہ شبلی نے اپنے ایک قصیدے میں وہاں پر کیا ہے جہاں انہوں نے مسلمان حکماء وفلاسفہ اور دیگر علوم وفنون کے نادرہ روزگار اشخاص کا ذکر کیا ہے۔مثلاً فرماتے ہیں:

روم واٹلی کے مدرسے میں کئی صدیوں تک

تھا سند فلسفہ بوعلی سینا کیسا

(کلیات شبلی اردو ص:۷۷)

(۲۰) ارسطو[۳۸۴-۳۲۲ق،م]مشہور اور نامور یونانی فلسفی تھا۔افلاطون کا شاگرد اور سکندر اعظم کا استاذ تھا۔ایک بڑا مفکر اور ماہر منطق تھا۔علم طب میں بھی اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ بقول شخصے ''حیوانیات ، ریاضیات ،علم ہیئت، سیاسیات، مابعدالطبیعات اور علم الاخلاق پر قدیم حکماء کے مابین وہ مستند اور صاحب الرائے عالم وفاضل تسلیم کیا جاتا ہے۔ارسطو کی انتہائی مشہور کتاب ''بوطیقا'' سے تو ہر شخص واقف ہے۔اس کے اردو میں پانچ سے زاید ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔عزیز احمد کا ترجمہ جو''فن شاعری'' کے نام سے شائع ہوا ہے،زیادہ مقبول ومتداول ہے۔ نامور ادیب ونقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اس کا ترجمہ کیا ہے۔ جسے ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔

بوطیقا کے علاوہ بھی ارسطو نے متعدد کتب ورسائل یادگار چھوڑے ہیں۔الاخلاق،المعقولات، مابعدالطبیعہ ،العبارہ، البرہان ،الجدل، الخطابہ، الشعر، النفس، الحیوان، الحس والمحسوس وغیرہ اس کی انتہائی قیمتی اور یادگار زمانہ تصنیفات وتالیفات ہیں۔

ارسطو کی بلند فلسفیانہ حیثیت کے سبب اہل قلم اس کا اور اس کے فکر و فلسفہ کا ذکر کرتے ہی رہتے ہیں۔علامہ شبلی نے بھی ''کلیات شبلی'' اردو میں اس کا ذکر کیا ہے۔

نام لیتے تھے ارسطو کا ادب سے ہر چند
تھے فلاطون الٰہی کے بھی گو شکر گذار

علامہ شبلی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہم علم کے قدر داں تھے اور اہل علم کا نام ادب اور احترام سے لیتے تھے، مگر اب تو یہ حالت ہے کہ

ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک محدود
کہ جہاں تک انہیں معقول بتائیں اغیار

(۲۱) عبدالکریم شہرستانی [۱۰۸۶-۱۱۵۸ء] عالم، محدث، فقیہ، واعظ، فلسفی، مورخ، ماہر تقابل ادیان اور وقائع نگار تھے۔ خراسان کے شہر شہرستان میں پیدا ہوئے۔۱۱۵۸ء میں اپنے وطن میں وفات پائی۔زندگی کا بیشتر حصہ نیشاپور بغداد میں گذرا۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ کتاب الملل والنحل کی تصنیف ہے۔ان کی ایک تصنیفی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے دیگر مذاہب کی بنیادی کتب کے صحیح اقتباسات نقل کئے اور ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔اس کا فیصلہ قاری کے لئے چھوڑ دیا ہے۔البتہ فرق اسلامی مرجیہ، کیسانیہ اور معتزلہ وغیرہ کا رد لکھا ہے۔انہیں بعض نے مائل بہ الحاد بھی لکھا ہے اور بعض نے اس کی تردید کی ہے۔

(۲۲) پروفیسر موسیو سیدیو [۱۷۷۷-۱۸۳۲ء] مشہور فرانسیسی مستشرق، جس نے تاریخ العرب لکھی اور جو ۱۸۷۷ء میں اس کی موت کے بعد شائع ہوئی۔تمدن عرب اور تمدن ہند اس کی اہم تصنیفات ہیں۔دونوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۲۳) بحوالہ خطبات شبلی ص ۱۱-۱۶

(۲۴) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال ص ۴۲-۴۳

ooo

ساتواں اجلاس۔ دہلی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ساتواں اجلاس ۱۸۹۲ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔اس کی صدارت مولوی حشمت اللہ خاں [۱۸۵۷-۱۹۱۹ء] (۱) نے کی تھی۔علامہ شبلی نعمانی کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجلاس سے وہ پہلے سے متنفر اور بیزار تھے۔ برادر خرد مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد [م: ۵/اگست ۱۹۱۴ء] کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ

> ''دسمبر میں شاید آنے کا قصد اس لئے ہے کہ کانفرنس دہلی میں شریک ہوسکوں، لیکن میرا قصد خود شرکت کا نہیں ہے۔ کانفرنس غالباً اب کی پھیکی ہوگی۔ مولوی حشمت اللہ و میرزا حیرت (۲) کی بڑ بہت سن چکے۔مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے۔مولوی نذیر احمد صاحب بھی غالباً چپ رہیں اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہوچکا۔(۳)

لیکن سید الطاف علی بریلوی کی کتاب ''تحریک علی گڑھ اور قومی نظمیں'' سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔اور نہ صرف شرکت کی تھی بلکہ شب میں احباب کے مجمع میں ایک نظم جوانہوں نے قسطنطنیہ میں رسم سلاملق دیکھنے کے بعد لکھی تھی اور جس کا عنوان ''موکب سلطانی'' ہے، سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا۔(۴)

موکب سلطانی

مہر چو از نقیب افق سر کشید   خاست زہر ناحیہ گلبانگ عید

دیده پر از خواب چو بر خاستند　　پیر و جواں جملہ تن آراستند
طفل کہ ایں شیوہ ندادند درست　　مادرش از مہر تن و روی شست
شیوہ و آئین طرب تازہ گشت　　کوچہ و بازار پر آوازہ گشت
مژدہ رسید ایں کہ شہ چارہ ساز　　زود بر آید بادائے نماز
تا برد از خوان کرم توشہ　　خلق بروں ریخت زہر گوشہ
بسکہ عنان طلب انگیختند　　طفل و جواں برسر ہم ریختند
پیک نظر راہ تماشا نیافت　　نقش قدم ہم بزمیں جا نیافت
جملہ بصد شوق و بصد آرزوی　　سوی بشک طاش نہادند روی
سرمہ خاک رہ شہ خواستند　　جا بہ گذرگاہ سپہ خواستند
از دو سوی راہ بہ کسب شرف　　خلق بہ آئین ادب بست صف
مہر چو در ہر جہت افشاند نور　　کوکبہ شاہ عیاں شد ز دور
گشت روان ازلی ہم خیل و فوج　　موج تو گوئی کہ شکستی بہ موج
بود شعار ہمہ از ہم جدا　　ہر ہمہ را رایت و پرچم جدا
پرتو آں اسلحہ تاب ناک　　نور ہمی ریخت بداماں خاک
باہمہ تمکین چو گذشت ایں گروہ　　گشت بیک بار زمیں پر شکوہ
غلغلہ بر خاست کہ بادا نوید　　مہر جہاں تاب خلافت دمید
داغ نہ جبہہ خورشید و ماہ　　حضرت خاقان خلافت پناہ
قاعدۂ دولت و دیں را مدار　　آئینہ رحمت پروردگار
پیکر لطف و کرم کبریائی　　سایہ یزداں شہ کشور کشائی
خسرو لشکر شکن و قلعہ گیر　　شاہ فلک عتبہ و گردون سریر
فاتحہ دولت و طغرائے دیں　　زیب دہ افسر و تاج و نگیں
شاہ فلک کوکبہ عبدالحمید　　ایدہ اللہ بنصر مزید

فرۂ شاہی زجبیں آشکار　　حاشیہ بوسان بہ یمین و یسار
مرکب شہ پیش چو بہ گذاشت پائے　　خلق بہ یک بار در آمد زجائے
طلعت شہ باز چو پرتو فگند　　بانگ دعا گشت زہر سو بلند
شور بر آمد کہ بود تا جہاں　　باد بکارم تو زمین و زماں
چرخ بداں مایہ کہ گردندہ است　　زندہ بماں کزتو جہاں زندہ است
زیب و طراز ہمہ عالم توئی　　سایہ یزداں بہ جہاں ہم توئی
جملہ بدانند کہ در غرب وشرق　　ہست ترا تاج خلافت بفرق
آں توئی امروز کہ در روزگار　　ہست برو دولت و دیں را قرار
تازگی بدر وحنین از تو ہست　　زیب و طراز حرمین از تو ہست
جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ　　آں کہ بود شرع نبی را پناہ
فرۂ دین نبوی از تو ہست　　بازوی اسلام قوی از تو ہست
شرع بہ دین جاہ تو چو شد ارجمند　　باد بہ فرمان تو چرخ بلند

سکہ اقبال بنام تو باد
ہر چہ بہ گیتی است بکام تو باد(۵)

تعلیقات وحواشی:

(۱)　مولوی حشمت اللہ خاں[۱۸۵۷-۱۹۱۹ء] نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن بانس بریلی کے مکتب میں حاصل کی۔ ۱۵رسال کی عمر میں عربی وفارسی کے فارغ التحصیل ہوگئے تھے۔ بڑے ذہین تھے۔اس کے بعد مڈل کا امتحان پرائیویٹ طور پر دیا اور کامیاب ہوئے۔اس وقت ان کے والد مولوی عظمت اللہ بستی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ چنانچہ گورکھپور سے انٹرنس پاس کیا۔ریاست رامپور کے وظیفہ سے الہ آباد سے ایف اے اور بی اے پاس کیا۔پھر کلکتہ سے ایم اے پاس کیا۔بعدازاں آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھے اوراول آئے۔۱۸۸۶ء میں میرٹھ میں تعینات ہوئے۔مختلف مقامات پر ملازمت کی ۱۹۱۶ء میں سبکدوش

ہوئے۔۱۸۹۲ء میں سرسید مولانا حالی اور علامہ شبلی کے ساتھ حیدرآباد کا انہوں نے بھی سفر کیا تھا۔ سرسید کے قریبی لوگوں میں تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس میں ابتدا ہی سے شریک رہے اور جب تک قویٰ نے ساتھ دیا ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ کالج کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۱رنومبر ۱۹۱۹ء کو آگرہ میں وفات پائی۔ اور مزار شاہ ابوالعلاؒ کے متصل سپرد خاک ہوئے۔

(۲) مرزا حیرت دہلوی[۱۸۳۷-۱۸۹۹ء] دہلی میں پیدا ہوئے۔ روایتی طریقہ پر عربی وفارسی کی تحصیل کی اور میں بڑی صلاحیت ولیاقت پیدا کی۔ الفنسٹن کالج بمبئی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان میں ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر، حیات فردوسی، سوانح عمری سعدی شیرازی، چراغ دہلی، مضامین حیرت، انشائے حیرت، سوانح عمری حکیم لقمان، سوانح عمری عمرعیار وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

(۳) مکاتیب شبلی ج۲ص۴۶

(۴) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص۹۶

(۵) ایضاً ص۹۶-۹۷۔ کلیات شبلی فارسی ص۵۰-۵۱

ooo

آٹھواں اجلاس۔علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا آٹھواں اجلاس علی گڑھ میں بتاریخ ۲۷ تا ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۳ء منعقد ہوا۔اس اجلاس کی صدارت ایجوکیشنل کانفرنس کے اعزازی سکریٹری نواب محسن الملک [۱۸۳۷-۱۹۰۷ء] نے کی۔علامہ شبلی نعمانی اس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اس اجلاس کے لئے اردو میں ایک ترکیب بند بھی کہا اور اجلاس کی دوسری نشست میں پیش کیا۔یہ ترکیب بند آج بھی دلوں میں گرمی پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔علامہ شبلی کی یہ تخلیق اب ''کلیات شبلی'' اردو میں شامل ہے۔

ترکیب بند

بجا ہے آج گر اس بزم میں یہ زیب وساماں ہیں
یہ ان کی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں
خلیل اللہ سے مہماں نوازی جن کو پہنچی ہے
ہزاروں کوس سے آ آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں
فقط اک جذبہ قومی انہیں واں کھینچ لایا ہے
جہاں زور حکومت ہے نہ حاجب ہیں نہ درباں ہیں
ہماری خدمتوں کا وہ اٹھانے آئے ہیں احساں
کہ اسلامی جماعت پر ہزاروں جنکے احساں ہیں

ہنر میں علم میں اخلاق میں مجد و شرافت میں
یہی وہ صورتیں ہیں جن پہ ہم تم آج نازاں ہیں
خدا نے ان کو بخشی ہے حکومت اور سطوت بھی
کہ جسم سلطنت کے یہ جوارح اور ارکاں ہیں
مگر ان کو کسی عزت پہ نازش ہے تو اس پر ہے
کہ یہ اسلام کے ہیں نام لیوا اور مسلماں ہیں
نہ عہدوں کا تفاوت ہے نہ کچھ فرق مراتب ہے
یہاں جس سادگی سے یہ شریک بزم اخواں ہیں
معمر بھی ہیں ان میں نوجواں بھی اور کم سن بھی
مگر شان اخوت میں مدارج سب کے یکساں ہیں
یہ وہ ہیں جن میں ہے اسلاف کا اب تک اثر باقی
یہ وہ ہیں جن میں جوہر نسل عدنانی کے پنہاں ہیں
انہی کے بازوؤں میں زور تھا کشورستانی کا
انہی کی یادگاریں جابہ جا اب تک نمایاں ہیں
یہ وہ ہیں جان ودل سے جو فدائے قوم وملت ہیں
یہ وہ ہیں نام پر اسلام کے جو دل سے قرباں ہیں
نہ ہوگا ایک بھی دل درد قومی سے جو خالی ہو
بظاہر گرچہ سب مسرور ہیں خرم ہیں شاداں ہیں
انہیں احساس ہے آئین وملت کی تباہی کا
یہ واقف ہیں کہ بیڑے قوم کے اب غرق طوفاں ہیں
انہیں معلوم ہے جس تاک میں ہے گردش گردوں
انہیں محسوس ہے جس گھات میں ایام دوراں ہیں

خبر ہے ان کو جس آزار میں چھوٹا بڑا ہے اب
یہ واقف ہیں کہ پہلے قوم کیا تھی اور کیا ہے اب
علاج اپنا ہم اب تک تو سمجھتے تھے کہ آساں ہے
مگر وہ درد نکلا جس کو ہم سمجھے تھے درماں ہے
دوا ہر بار جب اپنا اثر الٹا ہی دکھلائے
تو بس سمجھو کہ اب بیمار کوئی دم کا مہماں ہے
جو سچ پوچھو تو ہے اسلامیوں کی اب یہی حالت
مرض دونا بڑھا دیتی ہے خود وہ شے جو درماں ہے
سلف کا تذکرہ جو ہمت و غیرت کا ہے افسوں
ہمارے حق میں وہ سرمایہ خواب پریشاں ہے
یہ افسانے بڑھاتے ہیں ہماری نیند کی شدت
یہ افسوں حق میں اپنے اور مدہوشی کا ساماں ہے
ہمیں احساس تک ہوتا نہیں اپنی تباہی کا
کہ سب پیش نظر اسلاف کی وہ شوکت وشاں ہے
ہماری کلفتیں سب دور ہوجاتی ہیں یہ سن کر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنون احساں ہے
مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں
کہ یورپ دولت عباس کا اب تک ثنا خواں ہے
نہیں رہتے گو یاں گھر تک مگر چرچے یہ رہتے ہیں
کہ اب تک قصر حمرا قبلہ گاہ رہ نورداں ہے
ہیں خود ان پڑھ مگر اس زعم میں اترائے پھرتے ہیں
کہ دنیا میں ہمیں سے زندہ اب تک نام یوناں ہے

نظر آتے ہیں ہم کو عیب اپنے خوبیاں بن کر
ہم اپنے جہل کو بھی یہ سمجھتے ہیں کہ عرفاں ہے
بسر ہوتی ہے گر اوقات فیاضی پہ غیروں کی
تو سمجھے ہیں کہ بس زہد اور توکل کی شاں ہے
حمیت اور خودداری نہیں ہے گر طبیعت میں
تو اچھا ہے کہ مسکینی تو اول شرط ایماں ہے
طبیعت میں اگر ہیں فتنہ پردازی کے کچھ جوہر
تو دعوی ہے کہ تدبیر اور سیاست فرض انساں ہے
وہ قوم اور وہ جماعت جس میں یہ اخلاق محکم ہیں
بلائیں اس پہ جو آئیں وہ کم ہیں اور بہت کم ہیں
یہ جو کچھ سن چکے ہو قوم کی تم حالت ابتر
نہ سمجھو یہ کہ ہے اس داستاں کا خاتمہ اس پر
ہماری سب سے بڑھ کر بدنصیبی جو ہے وہ یہ ہے
کہ بے پروا ہیں وہ بھی قوم کے جو آج ہیں لیڈر
گیا وہ وقت ہم کو ناصحوں کی جب ضرورت تھی
فلک نے کردیا اک اک کو آپ اپنا نصیحت گر
گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی
کہ دو آنسو بہالیں قوم کی درماندہ حالت پر
گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے
ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سرتاسر
ضرورت اب ہے گر ہم کو تو بس ہے ان بزرگوں کی
کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جوہر

فقط باتیں نہ ہوں کچھ کام بھی بن آئے ہاتھوں سے
نہیں جو کچھ وہ منہ میں سے کہہ دکھائیں اس سے بڑھ کر
نہیں گر یہ تو بس اک گرمی صحبت کے ساماں ہیں
یہ قومی مرثیے یہ وعظ یہ اسپیچ یہ لکچر
طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر
تمہیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل سے مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آجاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر
ابھی تک تم میں ہے اسلاف کا کچھ کچھ اثر باقی
شرر گو بجھ چکے پر گرم ہے اب تک وہ خاکستر
ابھی کچھ کچھ مہک باقی ہے ان مرجھائے پھولوں میں
ابھی کچھ کاٹ ہے اس تیغ میں گو مٹ چکے جوہر
کمی جس بات کی یا نقص جو تم میں ہے وہ یہ ہے
کہ تم ان قوتوں کو صرف بے جا کرتے ہو اکثر
وہی فیاضیاں تم میں ہیں جو تھیں معن و حاتم میں
مگر بے ہودہ رسموں کے لئے وہ وقف ہیں یکسر
کچھ اس میں کم ہوا تھا صرف تجہیز اسامہ میں
لٹا دیتے ہو تقریبوں میں جتنا تم زر و زیور
فقط آپس کے جھگڑوں میں تم اس سے کام لیتے ہو
وہ جودت اور ذہانت جس میں اب بھی تم ہو نام آور
سنبھلنا اب گر چاہو تو ہے وقت اور ضرورت بھی
وگرنہ پھر نہیں رہنے کی جو کچھ ہے یہ حالت بھی (۱)

ابتک ایم اے او کالج اور کانفرنس کے اجلاسوں میں علامہ شبلی کا فارسی میں قصائد، نظمیں اور ترکیب بند پیش کرنے کا معمول تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اردو ترکیب بند پیش کیا۔ اسے علی العموم پسند کیا گیا۔ نواب محسن الملک نے صدارتی تقریر میں اپنی پسندیدگی کا اظہار اس طرح کیا:

''حضرات!

مولانا شبلیؒ نے جو نظم اس وقت سنائی وہ بلحاظ الفاظ کی عمدگی اور معانی کے پاکیزگی کے اس قابل ہے کہ قوم ہمیشہ اسے حرز جاں بناوے اور اس کا دردرکھے اور اس پرعمل کریں۔

''صاحبو! مولوی شبلی صاحب کی نظم یا نثر اس کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ خصوصاً مجھ سا ناچیز جاہل جس کی تعریف درحقیقت تحسین ناشناس ہے مگر وہ جوش جو اس نے دلوں میں پیدا کر دیا ہے اور وہ حالت جو اس کے دردناک شعروں نے طاری کردی ہے، مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں مجلس کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کروں اور شکریہ کے ووٹ پاس کرنے کا محرک ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہر ایک شخص جو اس وقت مجلس میں موجود ہے میرے ساتھ اتفاق کرے گا اور ایک ایسے عالی دماغ، روشن خیال عالم کا جس نے اپنی بے نظیر تالیفات سے ایک نئی روشنی قوم کو دکھائی اور ایک نیا اور سیدھا راستہ تصنیف کا بتایا ہے، دل سے شکریہ ادا کرے گا۔''(۲)

لیکن واقعہ یہ تھا کہ بعض لوگوں نے علامہ شبلی کی فارسی شاعری پر جو اکثر وہ کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش کرتے تھے، تنقیدیں کی تھیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

''مولانا نے خلاف معمول یہ قصیدہ اردو میں لکھا اور ترنم کے بغیر سادہ رنگ میں پڑھا۔ میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا شبلی چونکہ فارسی میں کہتے ہیں جس میں ایک خاص قسم کی شان ہے اور پڑھتے بھی ترنم سے ہیں، جس سے

سننے والوں پر خاص اثر پڑتا ہے ۔ ورنہ فی نفسہ ان کی شاعری میں کوئی کمال نہیں۔مولانا نے یہ سن کراس دفعہ اپنا قصیدہ بھی اردو میں لکھا اور سنایا بھی سادہ طریقہ سے ،مگرمحفل پر رنگ وہی چھایا رہا۔ اس نظم کا مضمون بھی مولانا حالی کی (۳)نظموں سے ملتا جلتا ہے۔‘‘(۴)

مگر سچ تو یہ ہے کہ’’صدر ہر جا کہ نشیند صدر است‘‘ کے مصداق علامہ شبلی نعمانی نے جس میدان میں قدم رکھا اسے قابل ذکر بنادیا۔حقیقت یہ ہے کہ ایسے جامع کمال اشخاص مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔سید الطاف علی بریلوی نے اس کے علاوہ ایک اور نظم کے اشعار بھی نقل کئے ہیں جو اس اجلاس میں پڑھے گئے:

گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے
ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سرتاسر
گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کانام ہمدردی
کہ دو آنسو بہالیں قوم کی درماندہ حالت پر
ضرورت اب ہے گر ہم کوتو بس ہے ان بزرگوں کی
کہ جن میں خیر سے کچھ کردکھانے کے بھی جوہر ہیں
فقط باتیں نہ ہوں کچھ کام بھی بن آئے
کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھ کر
نہیں گر یہ تو بس اک گرمی صحبت کاساماں ہیں
یہ قومی مرثیے ، یہ وعظ ، یہ اسپیچ ، یہ لکچر
طلب اورسعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر
تمہیں جو کام ہیں در پیش گو مشکل سے مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آجاؤ تو آساں سے ہیں آساں(۵)

تعلیقات و حواشی:

(۱) بحوالہ کلیات شبلی اردو، طبع جدید، ص ۶۷-۱۷

(۲) مجموعہ لکچرز و اسپیچز، حصہ اول، ص ۱۷۴-۱۷۵

(۳) مولانا الطاف حسین حالی [۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء] مرزا غالب [۱۷۹۷-۱۸۶۹ء] کے شاگرد تھے۔ ان کا شمار اردو کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ ان کے ذکر کے بغیر اردو شعر و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے اردو کو آبرو بخشی اور شعر و ادب کے مختلف میدانوں میں وہ کارنامے انجام دئے جو ان سے پہلے ہماری ادبی روایت کا حصہ نہ تھے۔ ان کے مقدمہ شعر و شاعری نے اردو میں انقلاب برپا کیا اور آج بھی وہ تنقید کے دستور اساسی کا حکم رکھتا ہے۔ وہ ادیب، شاعر، نقاد اور بلند پایہ سوانح نگار تھے۔ مدوجزر اسلام (مسدس حالی، مطبوعہ ۱۸۷۹ء) حیات سعدی (مطبوعہ ۱۸۸۶ء) دیوان حالی (۱۸۹۳ء) مقدمہ شعر و شاعری (مطبوعہ: ۱۸۹۳ء) یادگار غالب (۱۸۹۷ء) حیات جاوید (۱۹۰۱ء) ان کی اہم علمی ادبی، تاریخی اور سوانحی یادگاریں ہیں۔

مولانا حالی شرافت و مروت میں انسان نہیں فرشتہ تھے۔ عمر میں علامہ شبلی سے بیس برس بڑے ہونے کے باوجود ان کی عزت واحترام اور اعتراف علم و فضل میں کمی نہ کرتے۔ فرماتے ہیں:

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

علامہ شبلی نے بھی مولانا حالی کی قدر و منزلت اور عزت و عظمت کا ہمیشہ خیال رکھا۔ ان کے فضل و کمال، تصنیفات، سوانح نگاری اور علمی اجتہادات کا برملا اعتراف کیا۔ البتہ سرسید احمد خاں کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' (مطبوعہ ۱۹۰۱ء) کے بارے میں ان کے خیالات ان کی دیگر کاوشوں کے برعکس تھے۔ اسے انہوں نے کتاب المناقب اور مدلل مداحی قرار دیا ہے۔

(۴) حیات شبلی ص ۲۱۰

(۵) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں ص ۱۰۶

○○○

نواں اجلاس۔علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نواں اجلاس ۱۸۹۴ء میں جسٹس میاں محمد شاہ دین بی اے خان بہادر بیرسٹر [۱۸۶۸-۱۹۱۸ء] کی صدارت میں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ علامہ شبلی اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے تھے، مگر گذشتہ اجلاس میں انہوں نے جو ترکیب بند پیش کیا تھا اور جس کی داد نواب محسن الملک نے اپنے صدارتی خطبہ میں دی تھی اس کا ذکر اس بزم میں بھی رہا۔ صدر اجلاس جسٹس میاں محمد شاہ دین بیرسٹر (۱) نے گذشتہ اجلاس میں پیش کئے گئے علامہ شبلی نعمانی کے چند اشعار کو اپنے صدارتی خطبے میں اس طرح پیش کیا۔

''یاد رکھو وہ دل میں چبھتے ہوئے الفاظ جو کہ پچھلے اجلاس میں اسی چمنستان علم کے نغمہ سنج عندلیب مولانا محمد شبلی صاحب کی موثر زبان سے نکلے تھے:

گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے
ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سر تا سر

گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی
کہ دو آنسو بہالیں قوم کی درماندہ حالت پر

ضرورت اب ہے گر ہم کو تو بس ہے ان بزرگوں کی
کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جو ہر

فقط باتیں نہ ہوں کچھ کام بھی بن آئے باتوں سے
کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھ کر

نہیں گر یہ تو بس اک گرمی صحبت کے ساماں ہیں
یہ قومی مرثیے ، یہ وعظ ، یہ اسپیچ ، یہ لکچر

طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر

تمہیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل سے مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آجاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر(۲)

تعلیقات وحواشی:

(۱) خان بہادر جسٹس میاں محمد شاہ دین بی اے بیرسٹر ایٹ لا[۱۸۶۸-۱۹۱۸ء] باغبان پور متصل شالامار لاہور کے قریب جو میاں خاندان آباد ہے جسٹس میاں محمد شاہ دین اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔یہیں پیدا ہوئے اور یہیں بی اے تک تعلیم حاصل کی۔۱۸۸۷ء میں انگریزی تعلیم کی تحصیل کے لئے انگلستان گئے۔واپس آ کر وکالت کا شغل اختیار کیا اور بڑی نیک نامی حاصل کی۔لاہور بار ایوسی ایشن کے کامیاب بیرسٹر اور ماہر قانون داں تسلیم کئے جاتے تھے۔محض ۲۶/سال کی عمر میں وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور نہایت شاندار خطبہ دیا۔۱۹/برس بعد۱۹۱۳ء میں آگرہ میں وہ دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔

(۲) خطبات عالیہ حصہ اول ص۱۰۳

دسواں اجلاس۔شاہ جہاں پور

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دسواں اجلاس ۲۷ تا ۳۰ردسمبر ۱۸۹۵ء میں شاہ جہاں پور میں منعقد ہوا۔اس اجلاس کی صدارت نواب محسن الملک بہادر نے کی۔علامہ شبلی نعمانی اس میں شریک ہوئے (۱)،مگراس اجلاس میں ان کی کسی علمی وادبی سرگرمی کا ذکر ابتک نہیں ملا۔

اس اجلاس میں زعمائے ملک وملت کثرت سے شریک ہوئے۔اور متعدد قراردادیں منظور ہوئیں۔امان اللہ خاں شروانی نے لکھا ہے کہ

''اس اجلاس میں بڑی تعداد میں اکابرین قوم اوراہل قلم حضرات نے شرکت فرمائی تھی۔حالی،شمس العلماءمولوی نذیراحمد،جسٹس سید محمود،مولانا شبلی اور مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی (۲)،خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس اجلاس میں حسب ذیل اہم باتوں پر تجاویز منظور کی گئیں:

۱۔ملک کے تمام مسلم تعلیمی اداروں کی نگرانی اور مشورہ کے لئے ایک محمڈن ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ قائم کیا گیا۔اس شعبہ کی ڈائرکٹری کے لئے پرنسپل مدرستہ العلوم علی گڑھ کومقرر کیا گیا۔

۲۔کانفرنس کے نام میں اینگلواورینٹل کا اضافہ کیا گیااوراس کا نام ''آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ہوگیا۔

۳۔مغربی علوم کی اچھی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جائے۔

۴۔پہلی مرتبہ آنریری جوائنٹ سکریٹری کی پوسٹ کا اضافہ کیا گیااورسید

محمود پہلے آنریری جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔''(۳)

انہی فیصلوں پر یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

تعلیقات وحواشی:

(۱) مرقع کانفرنس ص۵۶

(۲) مولوی وحیدالدین سلیم [۱۸۶۹-۱۹۲۸ء] پانی پتی، ایڈیٹر مسلم گزٹ لکھنو۔علامہ شبلی نے انہیں مسلم گزٹ کا ایڈیٹر مقرر کرایا تھا۔انہوں نے طلبائے ندوہ کی اسٹرائک کے زمانہ میں علامہ شبلی کے خلاف مسلم گزٹ میں خبریں اور مضامین شائع کئے۔اسی زمانہ میں کسی وجہ سے حکومت نے انہیں شہر بدر کرادیا تھا۔

مولوی وحیدالدین بڑے لائق شخص تھے۔ سرسید احمد خاں کے معاون رہے اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت بھی انہوں نے کی تھی۔وہ اچھے اہل قلم تھے۔ان کے مضامین کے دو مجموعے افادات سلیم اور مضامین سلیم شائع ہوئے ہیں۔

(۳) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال ص۵۰-۵۱

○○○

تیرہواں اجلاس۔کلکتہ

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے گیارہویں اور بارہویں اجلاس میں جو ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۸ء میں میرٹھ اور لاہور میں منعقد ہوئے تھے ان میں علامہ شبلی کی شرکت کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ۱۸۹۹ء کے تیرہویں اجلاس میں جو کلکتہ میں جسٹس سید امیر علی [۱۸۴۹-۱۹۲۸ء] (۱) کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں وہ شریک ہوئے ۔اور مسٹر تھیوڈور ماریسن [۱۸۶۳-۱۹۳۶ء] کے درج ذیل رزولیشن کی تائید کرنے کا ذکر بھی مرقع کانفرنس کے مصنف نے کیا ہے۔ مسٹر تھیوڈر ماریسن کا رزولیشن یہ تھا کہ

> ''اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ بی اے کی ڈگری کے لئے فارسی کا بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے۔اور یہ کہ جو نصاب تعلیم ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہے اس میں اصلاح اور ترقی کی گنجائش ہے۔'' (۲)

چونکہ انگریزی حکومت نے بی.اے. کے نصاب سے فارسی زبان کو خارج کر دیا تھا، اس لئے علامہ شبلی نعمانی نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے موقف کی تائید میں بڑی زبردست تقریر کی۔ اس وقت گورنر بنگال سر جان ووڈبرن [۱۸۴۳-۱۹۰۲ء] (۳) موجود تھے۔ انہوں نے علامہ شبلی کی تقریر نہایت غور سے سنی۔ علامہ شبلی نے نہ صرف مسٹر تھیوڈر ماریسن کی تائید کی بلکہ اس قدر مدلل گفتگو کی کہ گورنر سر جان ووڈبرن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بلکہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی تقریر میں اس کا ذکر کیا۔ (۴)

یہ تقریر مولانا عبدالسلام ندوی کو خطبات شبلی کی ترتیب و اشاعت کے وقت دستیاب نہیں

ہوئی تھی اس لئے اس میں شامل نہیں ہوسکی ہے۔ بعد میں اقبال احمد مجددی (۵) نے اسے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۶۸ء میں شائع کرایا۔ باقیات شبلی میں بھی یہ تقریر شامل ہے۔

فارسی زبان وادب

حضرات!

پیشتر اس کے کہ میں باضابطہ اس رزولیوشن کی تائید کروں، میں چاہتا ہوں کہ ان دلائل پر جن کی وجہ سے فارسی الہ آباد یونیورسٹی کے تعلیمی کورس سے خارج کی گئی ہے غور کروں۔ اس قسم کی تجویز کے بانی مسٹر نیس فیلڈ (۶) تھے، اور یہ تجویز وقتاً فوقتاً یونیورسٹی سینٹ میں پیش ہوا کی، فارسی کے مخالفین کے دو خاص دلائل ہیں، ایک تو یہ کہ فارسی ایک اختیاری مضمون ہے جس کو طالب علم بجائے مشرقی کلاسیکل (یعنی عربی یا سنسکرت) کے لے سکتا ہے، جب تک کہ ان زبانوں کے کورس میں تفاوت رہے گا، ہرگز یہ امید نہیں ہوسکتی کہ طلبہ عربی یا سنسکرت کو لیں گے، یا ان زبانوں کے کورس کو فارسی کے آسان کورس پر ترجیح دیں گے، اس رزولیوشن کے لائق پیش کنندہ نے متذکرۂ بالا دلیل کا جواب دیا ہے اور رائے دی ہے کہ وہ تفاوت بالکل رفع ہوسکتا ہے، اگر فارسی کورس اتنا ہی مشکل کر دیا جائے جتنا کہ عربی یا سنسکرت کا کورس ہے، اور اس کے پڑھنے اور یاد کرنے میں طالب علم کو اتنی محنت کرنی پڑے جیسی کہ ان دو زبانوں کے کورس میں کرنی پڑتی ہے، یہ بات کہ ''فارسی کورس کافی طور پر مشکل کیا جاسکتا ہے'' اس کورس سے جو کہ ہم نے حال میں طیار کیا ہے، عملی طور پر ثابت ہوگئی ہے، اور اس میں ناکام طالب علموں کی تعداد اتنی ہی بڑھ گئی ہے جتنی کہ دوسرے مضامین میں ہوتی ہے، یہ بات اس کے مشکل ہونے کی ایک کافی شہادت ہے۔

دوسری دلیل بڑے غور سے دیکھنے کے لائق ہے۔ فارسی کے مخالفین کہتے ہیں کہ یہ کلاسیکل زبان نہیں ہے، اس لئے قوت متخیلہ کو تربیت دینے کی طاقت اس میں نہیں ہے جیسی کہ دیگر زبانوں میں ہے، جو ایسے علم وادب سے پڑھیں جن میں قوت متخیلہ پوری طرح کام میں لائی جاسکتی ہے، اس کے لٹریچر میں علوم وفنون اور حقیقی شاعری نہیں ہے، لٹریچروں میں اس زبان کے

لٹریچر کا رتبہ بالکل ادنیٰ ہے۔مسٹر ماریسن (۷) کی تقریر کے بعد میرے لئے جو کام باقی رہا ہے وہ یہ ہے کہ میں اس دوسری دلیل کو غلط ثابت کروں۔ان تمام باتوں کو کہنے کے لئے جو اس بارے میں کہی جاسکتی ہیں، کم سے کم دو گھنٹے کی ضرورت ہوگی،اس لئے اس مختصر وقت میں جو مجھے ملا ہے، اپنے دلائل کو خلاصۃً بیان کروں گا۔میں پہلے علوم وفنون کی جانچ کروں گا،اوراس بات کو دیکھوں گا کہ آیا وہ علوم وفنون جو زبان عربی (جس کے علم اخلاق کی خوبی کے ہمارے مخالفین خود مقر ہیں) میں پائے جاتے ہیں، وہ زبان فارسی میں موجود ہیں یا نہیں، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم کی تمام شاخیں جو عربی زبان میں ہیں، فارسی میں بھی موجود ہیں اگرچہ کتابوں کی تعداد میں زبان فارسی عربی کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔تفسیر، حدیث، فقہ، معانی وبلاغت کا ایک قابل قدر ذخیرہ زبان فارسی میں ہے۔فلسفہ اور منطق میں سے ہر ایک کی ایک ایک مکمل تصنیف موجود ہے، درۃ التاج (۸) فلسفہ کی ایک عمدہ کتاب ہے، فارسی زبان میں شفاء ابن سینا (۹) کا ایک مفید خلاصہ موجود ہے جس کا علم طب پر حاوی ہونا سب تسلیم کرتے ہیں، ابوریحان بیرونی (۱۰) کی تمام تصنیفات فارسی میں ہیں جو اس قدر کارآمد ہیں کہ عربی کے علماء کو بھی بعض اوقات ان کے حوالے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن زبان فارسی میں علم کی ایک شاخ ایسی ہے جو کہ صرف اسی زبان میں پائی جاتی ہے، وہ مسلمانوں کے مشہور زمانوں کی بیش بہا تاریخ ہے، مجھے علم تاریخ کے فوائد بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یونیورسٹی کی تعلیم میں اس علم کا مفید ہونا ایک مسلم امر ہے۔مشکل سے کوئی مشہور تاریخ عربی زبان میں ایسی ہوگی جو فارسی میں نہ ہو، لیکن چند تاریخی تصنیفات زبان فارسی میں ایسی ہیں جو عربی میں نہیں ہیں، مثلاً شاہنامۂ فردوسی، جو فارس کے زمانۂ سلف کی ایک قابل اعتبار تاریخ ہے، اس حیرت انگیز کتاب کے سچے اور جھوٹے واقعات کو جدا کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ شاہ ضحاک (۱۱) کے خونخوار افعی اور سفید دیو وغیرہ کے قصے محض کتاب کی زینت کے واسطے ہیں، جو فردوسی کے زمانے کے اشخاص کے پسند خاطر تھے، لیکن اس کتاب کی اصل تہ سچے واقعات کی ہے، جو ان تاریخی معلومات پر جو دیگر ذرائع سے اس قدیم سلطنت کے بارے میں حاصل ہوسکتے ہیں، منطبق ہوجاتے ہیں، اس میں اس زمانے کے شہزادوں کی طرز تعلیم، ان کے

حسب ونسب، ان کی کیفیتِ مزاج، ان کی حکومت کے حالات وغیرہ تاریخی ہیں۔

سر جان ملکم (۱۲) نے جن کو فارس میں عرصہ تک مقیم رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اور جنہوں نے بڑی تحقیقات کے بعد اپنی کتاب تصنیف کی ہے، فی الحقیقت ان معلومات میں جو کہ ہم کو فردوسی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں کوئی ضروری اضافہ نہیں کیا ہے۔ فردوسی کی تصنیف میں باطل مشرقی عقائد کو حذف کرنے کے بعد ایسے واقعات نہ پائے جائیں گے جو ملکم صاحب کی تاریخ سے مغائرت رکھتے ہوں۔ شاہنامہ میں ذکر ہے کہ جب کیکاؤس ماژندران گیا تو سحر کے زور سے دن رات میں تبدیل ہو گیا۔ ملکم اس واقعہ کے متعلق کہتا ہے کہ دوسری شہادت کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن چندر گرہن تھا۔ ہیروڈوٹس (۱۳) جو یورپ میں ایک مسلم کلاسک ہے، رائج الوقت جانچ کو اس حد تک برداشت نہ کر سکے گا جتنا کہ شاہنامہ، جس کے بیانات غیر حقیقی اور پر از مبالغہ معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے دور بھی ہیں جن کے حالات فارسی ہی زبان میں ہیں۔ خاندان صفاری (۱۴) کے تاریخی حالات جو تیمور لنگ (۱۵) کا ہم عصر تھا، صرف فارسی میں ہیں۔ سلطنت مغلیہ کی تمام تاریخیں فارسی میں ہیں، جن کو اگر ہم علاحدہ کر دیں تو ہمارے پاس چھ سو برس کے ملکی اور انتظامی حالات کی واقفیت کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔

فارسی میں ایک چیز اور بھی ہے جو عربی میں نہیں پائی جاتی اور جو انگریزی کے قبضہ میں بھی سو برس پیشتر تک نہ تھی، وہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمریاں اور روزنامچے ہیں، میں نے جہانگیر کے عہد حکومت کے حالات کے بارے میں مختلف اشخاص کی بیسیوں تصنیفات دیکھی ہیں، لیکن کسی میں ایسی سچائی اور حقیقت کے ساتھ واقعات کا ذکر نہیں ہے جیسا کہ تزک جہانگیری (۱۶) میں جو اس کی خود تصنیف ہے اور جس میں تاریخ کو ناول کے رنگ وروپ میں دکھایا گیا ہے۔

اس طرح سے یہ ظاہر ہے کہ فارسی میں علوم کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، اب اس کی رنگینی عبارت دکھانا باقی ہے، میں اس موقعہ پر فارسی لٹریچر کے حصۂ نثر کو الگ رہنے دوں گا اور اس کے نظم کے حصوں کی جانچ کروں گا، کہتے ہیں کہ فارسی نظموں میں وہ آزادی کی روح نہیں ہے جو عربی

زبان میں بہ تخصیص حاصل ہے، یہ سچ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک جنگلی اور خانہ بدوش قوم کے چال چلن کو منعکس کرتی ہے، جو ریگستان میں آزادی سے زندگی بسر کرتی ہے اور کسی کے تابع حکومت نہیں ہے، لیکن فارسی شاعری میں جس کی بنیاد اور ترقی بادشاہوں کے عہد حکومت میں ہوئی قدرتی طور پر ماتحتی اور چاپلوسی کی روح ہے۔ اس نقص کے علاوہ فارسی شاعری عربی شاعری کا نہایت عمدگی سے مقابلہ کرسکتی ہے اور بعض حالتوں میں اس سے بڑھ سکتی ہے۔ ہم یورپین علماء کے بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے ہم کو ایک نہایت عمدہ میدان فارسی کی تحقیقات کا بتلا دیا ہے جو قوت متخیلہ کو کافی ورزش دے سکتا ہے۔ وہ فارسی کے علم لسان کا علاقہ، سنسکرت اور یورپین زبانوں کے ساتھ جو آریہ قوم کی زبان سے تعلق رکھتی ہیں دریافت کرنے کا ہے۔ جرمن پروفیسروں کی اس مضمون پر بہت سی تصنیفات ہیں اور جس کا آغاز اس ملک میں سخندان پارس کی تصنیف سے ہوا ہے، جو کہ ہمارے اردو لٹریچر کے عالی دماغ ہیرو پروفیسر محمد حسین آزاد (۱۷) کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔'' (۱۸)

علامہ شبلی کے موقف کی مسٹر محمد شفیع [۱۸۸۳-۱۹۶۳ء] (۱۹) مسٹر عبدالرحمٰن (۲۰) اور نواب محسن الملک [۱۸۳۴-۱۹۰۷ء] نے بھی تائید کی۔ اور باتفاق رائے یہ قرارداد منظور ہوئی۔ علامہ شبلی کی یہی وہ تقریر ہے، جس نے فارسی کو یونیورسٹی کے نصاب سے خارج ہونے سے محفوظ رکھا۔

تعلیقات وحواشی

(۱) جسٹس سید امیر علی [۱۸۴۹-۱۹۲۸ء] ذی علم اور بڑے بیدار مغز مسلمان تھے۔ یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کی اپنے عہد میں وہ ایک شناخت بن گئے تھے۔ انگریزی زبان پر دست رس حاصل تھی۔ انگریزی قوانین اور تاریخ وغیرہ سے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ جس میں اسپرٹ آف اسلام (Spirit of Islam) اور تاریخ اسلام جس کا ترجمہ باری علیگ نے کیا ہے، بہت مقبول ہوئیں۔ ان کے بعض خیالات سے اہل علم و دانش کو اختلاف بھی رہا، تاہم ان کے علم و فضل کے سب معترف و مداح تھے۔ علامہ شبلی نے ان کو مخاطب کر کے ایک نظم کہی ہے جو کلیات شبلی اردو میں شامل ہے۔ اس کا عنوان ''خطاب بہ رائٹ

آنریبل سید امیر علیؒ ‘‘ ہے۔ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے اس پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ

> ’’۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ نے اپنے اہم اجلاس کے لئے جس میں احرار کی در اندازی کا خوف تھا، آنریبل سید امیر علی کو صدارت کے لئے نامزد کیا تھا۔ انہوں نے منظور کیا، مگر عین وقت پر اس لئے انکار کیا کہ لیگ سفر خرچ کی رقم مہیا نہ کر سکی۔‘‘ (کلیات شبلی اردو، ص۱۴۴)

علامہ شبلی نے اپنی نظم میں اس صورت حال پر جو تنقید کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں جو نکتہ آفرینی اور جدت طرازی یعنی بات سے بات پیدا کی ہے وہ خاص قابل ذکر ہے۔ شاعری میں یہ طنز و تعریض اور کاٹ بس علامہ شبلی کا حق تھا اور انہی پر یہ سلسلہ ختم بھی ہو گیا۔

اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ علامہ شبلی مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ کو ناپسند ہی نہیں بلکہ اسے مضر بھی خیال کرتے تھے۔ ’’کلیات شبلی‘‘ میں مسلم لیگ پر جو متعدد نظمیں شامل ہیں، وہ ان کے ہندوستان میں نظریہ سیاسیات کا واضح اعلان بھی ہیں۔ اس نظم میں بھی جا بجا سید امیر علی[۱۸۴۹-۱۹۲۸ء] کے ساتھ مسلم لیگ اور لیگی خیالات و نظریات پر نقد اور طنز ہے۔ چند متفرق اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

ہر چند لیگ کا نفس واپسیں ہے اب
اس ہستی دو روزہ پہ جس کو غرور تھا

وہ دن گئے کہ بت کدہ کو کہتے تھے حرم
وہ دن گئے کہ خاک کو دعوی نور تھا

وہ دن گئے کہ شان غلامی کے ساتھ بھی
ہر بوالہوس خمار سیاست میں چور تھا

لے دے کے رہ گیا تھا سہارا بس آپ کا
یہ جسم مردہ منتظر نفخ صور تھا

امید تھی کہ اب کی بدل جائیں گے اصول
مٹ جائے گا نظام میں جو کچھ فتور تھا

یہ کیا ہوا کہ آپ نے بھی بے رخی سی کی
کیا آپ کو بھی راز نہاں پر عبور تھا

(کلیات شبلی اردو ص:۱۴۴)

(۲) مرقع کانفرنس ص۷۵-۷۶

(۳) سر جان ووڈبرن *(Sir John Woodborn.1843-1902)* یہ انگریز ۱۸۶۳ء میں ہندوستان آیا۔مختلف عہدوں پر فائز رہا۔اودھ میں کمشنر بنایا گیا۔آخر میں بنگال کا گورنر بنایا گیا۔اس عہدہ پر وہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء تک فائز رہا۔۲۱/نومبر ۱۹۰۲ء انتقال کیا۔

(۴) مرقع کانفرنس ص۷۶

(۵) پروفیسر اقبال احمد مجددی نامور مورخ ومحقق اور مصنف تھے۔گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے شعبہ تاریخ کے صدر رہے۔ان کے پاس کروڑوں روپئے کی مالیت کا سیکڑوں سال قدیم نادر کتب، نادر مخطوطات،شاہی فرامین وغیرہ کا بہت قیمتی ذخیرہ تھا۔یہ قیمتی ذخیرہ علوم وفنون انہوں نے عام استفادہ کے لئے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو وقف کر دیا۔انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔ان میں رسائل دردفاع امام ربانی مجددالف ثانی شیخ احمد سرہندی، احوال وآثار عبداللہ خویشگی قصوری، مقامات مظہری:احوال وملفوظات ومکتوبات حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہید، ملفوظات چہل روزہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی، بہجۃ الناظر فی براۃ الابرار: دردفاع حضرت شیخ احمد سرہندی مناقب مخدومین، مناقب مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی، رسائل خواجہ محمد ہاشم کشمی، وہ کتابیں اپنے آباء کی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(۶) مسٹر نیس فیلڈ *(John Nesfield,1836-1919)* برطانوی مصنف، جس نے متعدد کتابیں لکھیں۔ان میں انگلش گرامر پاسٹ اینڈ پرزنٹ جوتین حصوں پر مشتمل ہے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔۱۸۶۷ء میں ہندوستان آیااور کرشنا نگر بنگال کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر مقرر ہوا۔کچھ دنوں تک اودھ میں انسپکٹر آف اسکول بھی رہا۔

(۷) تھیوڈر ماریسن[۱۸۶۳-۱۹۳۶ء] پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ،کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے۔ تحصیل علم کے بعد حکومت کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہوئے۔بعدازاں ہندوستان آئے۔اور۱۸۸۹ء میں ایم اے او کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پھر۱۸۹۹ء میں پرنسپل بنائے گئے۔۵؍سال بعد مارچ ۱۹۰۵ء میں وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے تعلیمی معاملات ومسائل سے دلچسپی لیتے رہے۔فروری ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔

(۸) درۃ التاج: علامہ فیض محمد قادری کی مشہور تصنیف ہے۔

(۹) الشفاء: مشہور طبیب اور فلسفی ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا[۹۸۰-۱۰۳۷ء] کی مشہور کتاب ہے۔لیکن ان کی سب سے مقبول اور شہرۂ آفاق کتاب القانون فی الطب ہے۔ابن سینا نے چھوٹی بڑی پچاسوں کتابیں لکھیں۔پہلی کتاب بیس برس کی عمر میں لکھی تھی۔نوح بن منصور کسی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہوا۔ان کے علاج سے مایوس بادشاہ کو شفا مل گئی۔چنانچہ بادشاہ نے انہیں ایک کتب خانہ عطا کیا۔

(۱۰) ابوریحان البیرونی[۹۷۳-۱۰۴۸ء] نامور مسلمان فلسفی،محقق،سائنسداں،کیمیاداں،ریاضی داں، ماہر فلکیات اور طبیعات،مترجم،غرض مختلف علوم وفنون کا جامع کمال شخصیت کا نام ابوریحان بیرونی ہے۔آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ان کی مشہور کتاب ہے۔انہوں نے تاریخ وجغرافیہ،ریاضی اور علم ہیئت میں ایسی عمدہ کتابیں لکھی ہیں جو ابتک پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔بیرونی کئی برس ہندوستان میں مقیم رہ کر سنسکرت زبان اور ہندوؤں کے علوم سیکھے۔اپنی کتاب میں ان کے بارے میں ایسی باتیں لکھی ہیں،جن کا کہیں اور ذکر نہیں ملتا۔

(۱۱) ضحاک: باقیات شبلی کے مرتب مشتاق حسین نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ضحاک کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔اس نے شہنشاہ ایران جمشید کو شکست دے کر تخت سلطنت پر قبضہ

کر لیا تھا۔ یہ بہت ہی ظالم اور تند مزاج تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے کندھوں پر دو سانپ تھے جن کو دو آدمیوں کا مغز غذا میں روزانہ دیا جاتا تھا۔ اور اس طرح دو آدمی روزانہ قتل کئے جاتے تھے۔

(باقیات شبلی ص ۵۸)

(۱۲) گورنر جنرل سر جان ملکم: (Sir John Malcolm,1769-1833) ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈپلومیٹ تھا۔ اس نے تاریخ ہند پر کئی کتابیں لکھیں۔ مورخ، مصنف اور سیاست داں کی حیثیت سے مشہور تھا۔ ۱۷۶۹ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۳۳ء میں انتقال کیا۔ یہ ۱۸۱۰ء میں ایران گیا اور ۱۸۱۹ء میں اس نے تاریخ ایران لکھی۔ سر سید احمد خاں نے تاریخ ایران کے بعض حصوں کا ترجمہ سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ سے شائع کرایا تھا۔

(۱۳) ہیروڈوٹس [پ: ۴۸۴ق م۔ وفات: ۴۲۵ق م] قدیم یونانی مورخ جسے تاریخ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے یونانی زبان میں دنیا کی قدیم ترین تاریخ (The Histories) لکھی ہے۔ یہ کتاب اس نے ۴۵۰ق م اور ۴۲۰ق م کے درمیان لکھی جو نو ابواب پر مشتمل ہے اور تمام ابواب کے نام تعلیم کی ۹ ر دیویوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ اس میں اس نے بحیرۂ روم اور مغربی ایشیا کی ثقافتی روایات اور سیاسی نزاعات کا ذکر کیا ہے۔ نیز ہخامنشی سلطنت اور ان سے یونانیوں کی جنگوں کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ یونان سے لے کر سندھ، پنجاب، فارس اور متعدد ایشیائی علاقوں کی بھی سیاسی اور تمدنی واقعات بیان کئے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ مع تعلیقات و حواشی جناب یاسر جواد کے قلم سے نگارشات لاہور نے شائع کیا ہے۔

(۱۴) خاندان صفاری: سیستان کا ایک فارسی سنی خاندان تھا۔ اس نے ایران کے بعض حصوں پر ۸۶۱ء سے ۱۰۰۳ء تک حکمرانی کی۔ ان کا دارالحکومت زرنج تھا۔ یعقوب بن اللیث الصفار اس سلطنت کے بانی تھے۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلی سلطنت تھی جو عباسیوں سے آزاد تھی۔ یہ فارسی تہذیب و تمدن کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ علم و ادب اور فنون لطیفہ کے بڑے قدرداں تھے۔ محمد بن واصف السیستانی درباری شاعر تھے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد شعرا اور ارباب علم و کمال دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان تحقیق اور محققین کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔

(۱۵) امیر تیمور [۱۳۳۶-۱۴۰۵ء] جو عرف عام میں تیمور لنگ کہا جاتا ہے۔ اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین فاتحین میں ہوتا ہے۔ وہ ایک زبردست جنگ جو، فاتح اور سلطنت تیموریہ کا بانی تھا۔ چین سے لے کر بحیرہ روم تک کا علاقہ آن کی آن میں اس کے زیر نگیں ہو چکا تھا۔

تیمور سمرقند کے قریب ایک قصبہ ''کش'' میں پیدا ہوا جو اب ازبکستان میں واقع ہے۔ وہ ابتدا سے بڑا بہادر تھا۔ جنگوں میں مسلسل فتح و کامرانی حاصل کرتا ہوا وسط ایشیا پر قابض ہو گیا۔ اس کے قلمرو میں ترکستان، خوارزم، کاشغر، ہرات، خراسان، فارس، عراق، آذربائیجان، آرمینیا، میسوپوٹامیہ اور جارجیا وغیرہ شامل تھے۔ ۱۳۹۸ء میں اس نے ہمارے ملک ہندوستان پر بھی حملہ کیا اور محمود شاہ تغلق [۱۳۹۴-۱۴۱۴ء] کو شکست سے دوچار کیا۔ اس نے محمود شاہ تغلق کو صرف شکست ہی نہیں دی بلکہ دلی کو لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ یکے بعد دیگرے فتح نے اس کے حوصلے بلند کر دئے تھے۔ آخر میں چین کو بھی وہ فتح کرنا چاہتا تھا اور اس پر ایک بڑے حملے کی زور و شور سے تیاری کر رہا تھا کہ ۱۹؍ جون ۱۴۰۵ء کو اس نے دفعتاً انتقال کیا۔ اس کی قبر سمرقند، ازبکستان میں واقع ہے جو ازبکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔

امیر تیمور لنگڑا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کا اخیر عمر میں [۱۷؍ مئی ۱۹۰۷ء کو] بارود سے بھری ہوئی بندوق ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتے ہوئے ان کی بہو سے دب گئی اور گولی جا کے علامہ شبلی کے پنڈلی میں لگ گئی تھی۔ اس وجہ سے ان کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا تھا۔ مصنوعی پاؤں کے سہارے وہ ٹھہر ٹھہر کر چلتے تھے۔ ایک قطعہ میں جو علامہ شبلی نے اکبرالہ آبادی [۱۸۴۶-۱۹۲۱ء] کے رقعہ دعوت کے جواب میں لکھا تھا، اس میں اپنے پاؤں کے کٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود کو تیمور سے تشبیہ دی ہے:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

(کلیات شبلی اردو ص:۲۱۱)

(۱۶) مغل حکمراں جہاں گیر کی خودنوشت۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علامہ شبلی کا رسالہ ''جہاں گیر اور

تزک جہاں گیری''مطبوعہ وکیل امرت سر۔اسے مقالات شبلی جلد پنجم میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

(۱۷) مولوی محمد حسین آزاد[۱۸۳۰-۱۹۱۰ء]اردو کے عناصر خمسہ میں شامل ہیں۔اردو کی تاریخ میں ان کے کارنامے سنہرے حرفوں سے لکھے جاتے ہیں۔آب حیات،سخندان پارس،دربار اکبری،نیرنگ خیال ان کے بڑے عظیم الشان کارنامے ادبی ہیں۔وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔داغ دہلوی سے اصلاح لی۔۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے ان کے والد مولوی محمد باقر شہید کو گولی ماری۔آزاد بے سروسامانی کے عالم میں لاہور پہونچے،محکمہ تعلیم میں ملازمت کی۔بچوں کے لئے کتابیں لکھیں۔آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔حکومت نے انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا۔انجمن پنجاب میں مشاعروں کی طرح انہیں نے ڈالی۔دوبار ایران کی سیر کی۔آخر میں دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔۲۲رجنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال کیا۔علامہ شبلی ان کی عظمت کے بڑے معترف تھے۔خاص طور پر ان کے اسلوب نگارش پر تو بالکل فریفتہ تھے۔ایک خط میں لکھا ہے کہ''وہ گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔''

(۱۸) ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۶۸ء

(۱۹) سر محمد شفیع بیرسٹر[۱۸۶۹-۱۹۳۲ء]لاہور کے ایک بڑے جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔۱۸۹۲ء میں لندن سے بیرسٹری پاس کیا تھا۔امپیریل لجسلیٹیو کونسل اور پنجاب لجسلیٹیو کونسل کے رکن رہے۔کونسل آف امپائر میں ہندوستان کو شریک کار کا درجہ انہی کی کوششوں سے ملا تھا۔علی گڑھ تحریک اور اردو کے بڑے پرزور حامی تھے۔علامہ شبلی کے کئی خطوط میں ان کا ذکر ہے۔وقف علی الاولاد میں پنجاب کی طرف سے ان کا نام علامہ اقبال نے پیش کیا تھا۔

(۲۰) مسٹر عبدالرحمٰن:تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

ooo

چودہواں اجلاس۔رامپور

اس کے بعد ۱۹۰۰ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا چودہواں اجلاس رام پور میں ہوا۔ اس کی صدارت مولوی عمادالملک سید حسین بلگرامی [۱۸۴۴-۱۹۲۶ء] (۱) نے فرمائی۔ مولوی مہدی علی خاں نواب محسن الملک کی خواہش کے باوجود علامہ شبلی اس میں شریک نہیں ہوسکے۔ مولوی محمد اسحاق وکیل [م: ۵/اگست ۱۹۱۴ء] کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ

''مولوی مہدی علی کے سخت تقاضے آرہے ہیں، چونکہ کانفرنس رامپور میں ہورہی ہے اس لئے میری شرکت پر ان کو اصرار ہے۔'' (۲)

نواب محسن الملک کے اصرار کے باوجود علامہ شبلی نعمانی اپنی علالت، زمینداری کے بعض مسائل اور سب سے بڑھ کر والد کی خرابی صحت اور پھر اس اجلاس سے ایک ماہ قبل ان کی وفات کے سبب شرکت ممکن نہ ہوسکی۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل نے ۱۲/نومبر ۱۹۰۰ء کو بندول میں وفات پائی۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ (۳)

تعلیقات وحواشی:

(۱) عمادالملک سید حسین بلگرامی [۱۸۴۴-۱۹۳۶ء] قصبہ بلگرام کے ممتاز اہل علم، متعدد زبانوں انگریزی، فرانسیسی، بنگالی، عربی وفارسی کے ماہر تھے۔ اردو مضامین کا ایک مجموعہ ''رسائل عمادالملک'' کے نام سے معارف پریس سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ''انتخاب دیوان میر'' بھی ان کی ایک کاوش ہے۔ ریاست حیدرآباد میں عرصہ تک تعلیمات کے ڈائرکٹر رہے۔ علامہ شبلی سے گہرے مراسم تھے۔ ان کی

تحریک پر انہوں نے انگریزی ترجمہ قرآن مجید کا کام شروع کیا تھا جو ۱۵ر پاروں تک پہونچ کر شبلی کی وفات کے سبب ہمیشہ کے لئے رک گیا۔ علامہ شبلی سے گہرے تعلق ہی کی بنا پر انہیں دارالمصنّفین کی مجلس عاملہ کا صدر منتخب کیا گیا، جس پر وہ تا حیات متمکن رہے۔

(۲) مکاتیب شبلی ج ا ص ۴۶

(۳) علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ [م:۱۲ر نومبر ۱۹۰۰ء] اعظم گڑھ کے رئیس، نامور وکیل اور ایک بڑے زمیندار تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد رواج زمانہ کے مطابق فارسی زبان وادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ علامہ شبلی نے ''شعر العجم'' میں ان کے ذوق شعر وادب کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ

میری طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا

سر بہ بستاں چوں دہد جلوہ یغمائی را
اول از سر و کند جامہ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے۔ میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لئے شاعر اگر کند کے بجائے کشد کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔ جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں۔ سب چپ ہو گئے۔ والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ ''نہیں یہی لفظ شعر کی جان ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے۔ لباس اتارنے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اتارے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لئے جائیں یا نچوا لئے جائیں۔ فارسی میں اس کے لئے دو مختلف لفظ ہیں۔ جامہ کشیدن اور جامہ کندن۔ چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے اس لئے جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے۔ تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ داد دی۔''

(شعر العجم ج ۴ ص ۱۴۔ ۱۹۸۶ء)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ حبیب اللہ فارسی زبان وادب پر کس درجہ گہری نگاہ رکھتے تھے اوران کا مذاق شعروادب کس درجہ پختہ تھا۔

بعدازاں انہوں نے الہ آباد ہائی کورٹ سے وکالت کا امتحان پاس کیا اوراعظم گڑھ میں وکالت کرنے لگے۔ان کی سوجھ بوجھ،فہم وفراست اور سلیقہ مندی کی وجہ سے بہت جلدان کا شماراعظم گڑھ کے نامور وکلا اور قانون کے بڑے واقف کاروں میں ہونے لگا۔وکالت کے ساتھ انہوں نے زمینداری اور نیل کا کاروبار بھی جاری رکھا۔دیوارہ کی بعض زمینداریاں بھی خریدیں۔رفاہی کاموں میں بھی وہ بڑھ کر حصہ لیتے تھے۔اسی شعوروو جاہت کی بنا پرانہیں شہراعظم گڑھ میونسپلٹی کا آنریری سکریٹری نامزد کیا گیا،جس پروہ برسوں فائز رہے۔

ooo

پندرہواں اجلاس۔ مدراس

۱۹۰۱ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پندرہواں اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت جسٹس باڈم (ا) جج ہائی کورٹ مدراس نے کی۔اس اجلاس میں شرکت کے لئے نواب محسن الملک نے علامہ شبلی نعمانی کو باصرار مدراس بلایا اوران کی خواہش پر وہ مدراس تشریف لے گئے اور کانفرنس میں شرکت کی۔

لکچر: تاریخ اسلام

کانفرنس کے ایک اجلاس میں علامہ شبلی نے ''تاریخ اسلام'' کے موضوع پر ایک وقیع لکچر دیا۔ جس اجلاس میں یہ لکچر دیا گیا، اس کی صدارت نواب محسن الملک نے فرمائی تھی۔اس میں علامہ شبلی کے لکچر کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اس وقت جو مرض مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے وہ دو قسم کا ہے۔ایک تو وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے کوئی مسلمان دنیاوی ترقی نہیں کر سکتا، ان کا مقولہ ہے کہ ''دنیا ہیچ است وکار دنیا ہمہ ہیچ'' دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ دنیا ہے۔انگریزی پڑھواور دنیا میں ترقی حاصل کرلو۔اب غور طلب یہ امر ہے کہ اسلام نے دین و دنیا میں کیا رشتہ رکھا ہے۔اسلام نے بتایا ہے کہ دین کیا چیز ہےاور دنیا کیا چیز ہے۔اصلی دوا اسلام کے ڈاکٹر نے جو اس مرض کی بتائی ہے وہ مولوی شبلی صاحب نے بیان کر دی ہے اور کوئی ضرورت نہیں کہ

میں اب اس کے متعلق زیادہ بیان کروں۔''(۲)

علامہ شبلی کا یہ خطبہ تلاش بسیار کے باوجود ابتک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

کانفرنس کا یہ اجلاس بھی بڑی اہمیت کا حامل رہا۔اس میں مندرجہ ذیل اہم امور پر غور و خوض کے بعد تجاویز منظور ہوئیں۔

ا۔مدراس مسلم ایجوکیشن ایسوسی ایشن کا قیام :اس کے لئے طے پایا کہ یہ ایسوسی ایشن کانفرنس کی جگہ پر کام کرتی رہے۔

۲۔مدارس میں سرکاری امتحان میں اردو کو بھی میڈیم بنایا جائے۔

۳۔مسلم یونیورسٹی کی جدو جہد کو تیز کیا جائے۔

۴۔کانفرنس کی رائے میں وہ وقت آ گیا ہے کہ جب تعلیم یافتہ اور روشن ضمیر مسلمان تعلیم کے ساتھ ساتھ ان تباہ کن رسوم کے خاتمہ کے لئے کوشش کریں جن سے معاشرہ برباد ہو رہا ہے۔

۵۔سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم رائج کی جائے۔

۶۔مدراس میں مسلمانوں کے لئے تعلیم نسواں کی تحریک شروع کی جائے۔''(۳)

مذکورہ بالا قراردادیں اجلاس کی تمام پاس شدہ قراردادیں نہیں ہیں بلکہ محض چند اہم قراردادیں ہیں۔انہی مباحث پر اجلاس آئندہ اجلاس تک کے لئے ملتوی کیا گیا۔

تعلیقات و حواشی

(۱) جسٹس مسٹر باڈم، جج ہائی کورٹ مدراس۔یہ سرسید احمد خاں کی تحریک تعلیم جدید کے بڑے ہم نوا تھے۔ان کے بارے میں مزید کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

(۲) مجموعہ لکچرز و اسپیچز حصہ اول، ص ۴۴۵-۴۴۶

(۳) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال ص ۶۰-۶۱

ooo

سولھواں اجلاس۔ دہلی

ایجوکیشنل کانفرنس کا سولھواں اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۰۲ء سے ۴ رجنوری ۱۹۰۳ء تک دہلی میں ہوا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی اس اجلاس میں حیدرآباد سے آ کر شریک ہوئے۔ اس اجلاس کی صدارت ہز ہائینس سر آغا خاں [۱۸۷۷-۱۹۵۷ء] (۱) نے کی تھی۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ

> ''جو گریہ وزاری ہم قوم کی تباہی پر کرتے ہیں اگر وہ صدق دل سے ہے تو ہم کو چاہئے کہ اس کو اس حالت سے نکالنے کے واسطے متفق ہو کر کریں۔ اور اس کوشش میں سب سے پہلا اور سب سے مقدم کام یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔'' (۲)

> ''ہم چاہتے ہیں کہ ایسا انتظام کریں کہ مسلمان نوجوانوں کو نہ صرف بہترین تعلیم دی جاسکے بلکہ تربیت بھی اتنی عمدہ ہونی چاہئے کہ دنیا کے کسی ملک میں ممکن ہو۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ اگر کوئی مسلمان طالب علم علم کے یا صنعت وحرفت کے کسی صیغہ میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ آئندہ بھی انگلستان اور جرمنی جانے پر مجبور ہو۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اسلامی فنون کی جو شاخیں مرجھاتی جارہی ہیں ان کو تر وتازہ کر کے علم جدید کے دائرہ میں بذریعہ مسلمان علماء کے داخل کیا جائے۔'' (۳)

اس اجلاس میں تین اہم قراردادیں منظور ہوئیں۔

۱۔ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں قانون کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۲۔مسلمان طلبہ کے لئے مزید وظائف کا انتظام کیا جائے۔
۳۔ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ جات میں اضافہ۔(۴)

انجمن ترقی اردو کا قیام

ابتک ایجوکیشنل کانفرنس کے تین شعبے تعلیم نسواں، تعلیمی مردم شماری اور دینی تعلیم مدارس تھے۔اس اجلاس میں کانفرنس میں دو نئے شعبوں سوشل ریفارم اور لٹریری سیکشن کا قیام عمل میں آیا۔ لٹریری یعنی شعبہ ادبیات کا علامہ شبلی کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔کانفرنس کے اسی اجلاس میں ۴؍جنوری ۱۹۰۳ء کو ایک پرائیویٹ اجلاس منعقد ہوا، جس میں اس شعبہ کا نام انجمن ترقی اردو قرار پایا۔(۵) اس طرح علامہ شبلی نعمانی انجمن ترقی اردو کے بانی سکریٹری منتخب ہوئے۔دوسرے لفظوں میں انہیں بنیاد گذار اور موسس قرار دیا جاسکتا ہے۔

اسی پرائیویٹ اجلاس میں ''انجمن ترقی اردو'' کے دیگر ارکان وعہدہ داران بھی منتخب ہوئے۔ان کے نام اور عہدے حسب ذیل ہیں:

۱۔پروفیسر آرنلڈ	:	صدر
۲۔ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	:	نائب صدر
۳۔مولانا الطاف حسین حالی	:	نائب صدر
۴۔مولوی ذکاءاللہ دہلوی	:	نائب صدر
۵۔علامہ شبلی نعمانی	:	سکریٹری
۶۔حامد علی صدیقی (۶)	:	جوائنٹ سکریٹری

اگرچہ علامہ شبلی نعمانی کو باتفاق سکریٹری منتخب کیا گیا تھا مگر اصلاً یہ سکریٹری شپ بھی ان کے دوست نواب محسن الملک کی دوستی ہی کا نتیجہ تھی۔علامہ شبلی نعمانی ۱۹۰۵ء کے اوائل تک اس عہدہ پر فائز رہے۔اور ترقی اردو کے لئے مسلسل جدو جہد کی اور ہر ممکن اسے ترقی دینے کی کوشش کرتے رہے۔ابتداء میں اس کی روداد ماہ بہ ماہ لکھ کر ایجوکیشنل کانفرنس اور ایم اے او کالج کے سکریٹری

نواب محسن الملک کو پیش کرتے رہے۔ یہ روداد یں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہیں۔ اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ان رودادوں سے جہاں انجمن کی ابتدائی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے وہیں علامہ شبلی کی ابتدائی اور بنیادی جدو جہد،منصوبوں اور ترقی اردو کے لئے ان کی تڑپ کا بھی پتہ چلتا ہے۔مطبوعہ رودادوں کی دستیاب تفصیل اس طرح ہے:

۱۔رپورٹ انجمن ترقی اردو، ماہ اپریل ۱۹۰۳ء،علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ،۳۰ رمئی ۱۹۰۳ء

۲۔رپورٹ انجمن ترقی اردو، ماہ مئی ۱۹۰۳ء،علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۳رجون و۲۰رجون ۱۹۰۳ء

۳۔رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ جون ۱۹۰۳ء۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۵رجولائی ۱۹۰۳ء

۴۔رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ جولائی ۱۹۰۳ء،علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۹راگست ۱۹۰۳ء

۵۔رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ اگست ستمبر ۱۹۰۳ء،علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۶راکتوبر ۱۹۰۳ء

یہی نہیں علامہ شبلی نے اخبارات میں مراسلے لکھے۔تراجم کے لئے کتابوں کا انتخاب کیا۔ نئی کتابوں کے موضوعات کی تعیین کی۔ نئے لکھنے والوں کو مواد فراہم کئے۔ ہندوستان کے اس عہد کے تمام ممتاز اہل علم اور ادبا وشعرا کو انجمن سے وابستہ کیا۔علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] (۷)، مدیر الہلال کلکتہ مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] (۸)، مدیر زمیندار لاہور مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] (۹) اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۴-۱۹۵۰ء] اور دیگر متعدد ممتاز لوگوں کو انجمن کا رکن نامزد کیا۔

انجمن ترقی اردو کا اس وقت کوئی ترجمان نہیں تھا۔ چنانچہ اراکین انجمن کو ایک مراسلہ لکھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کے ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ کو انجمن کا آرگن قرار دیا۔(۱۰)

بعض ہندو ادیبوں نے اعتراض کیا کہ انہیں انجمن سے دور رکھا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اخبار میں باقاعدہ بیان شائع کرایا۔(۱۱) تو علامہ شبلی نے اس کی تردید کی اور واضح کیا کہ یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ انجمن نے اپنا پہلا انعام ایک ہندو ادیب کو دیا اور ہندو تہذیب و تمدن پر لکھی گئی کتاب پر دیا۔اس وضاحت سے ان کے دل صاف ہوئے اور متعدد ہندو ادیبوں اور شاعروں نے انجمن ترقی اردو کی رکنیت اختیار کی۔ یہی نہیں علامہ شبلی نے بعض انگریز افسروں کو

بھی انجمن کا رکن بنایا۔

انجمن ترقی اردو سے متعلق علامہ شبلی کی یہ کاوشیں اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے انجمن ترقی اردو کے لئے انتہائی محنت اور جدوجہد کی۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع شدہ مذکورہ بالا رودادوں کی نشاندہی ''باقیات شبلی'' کے مصنف مشتاق حسین (۱۲) سابق اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کی ہے۔ ممکن ہے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اور بھی رودادیں شائع ہوں۔؟ کاش! کوئی شخص انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ورق گردانی کر کے ان کی نشاندہی کر سکتا۔؟

انجمن ترقی اردو کی ان رودادوں سے علامہ شبلی کی ترقی اردو کی گہری دلچسپی کے ساتھ ان کے بعض نظریہ تعلیم سے بھی واقفیت ہوتی ہے، جو وہ بہت بے تکلفی کے ساتھ نواب محسن الملک کو لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً جب انجمن ترقی اردو نے تراجم کتب کے لئے اشتہار شائع کیا تو کس طرح کا حوصلہ افزا معاملہ سامنے آیا۔ علامہ شبلی ماہ جولائی ۱۹۰۳ء کی روداد میں لکھتے ہیں:

''جب انجمن اردو کی تجویزیں تمام ملک میں شائع ہوئی تھیں تو کلکتہ سے لے کر لاہور تک ہر طرف سے اس کثرت سے ترجمہ کرنے کے لئے درخواستیں آئیں کہ مجھ کو گمان ہوا ہندوستان عباسیوں کا بغداد بن گیا ہے۔ لیکن جب مقررہ کتابوں کا اشتہار چھپا تو تقریباً ہر طرف سے سناٹا تھا۔ کتاب النباتات (Story of the Planto) اور طبقات الارض (Story of the Earth) کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کتاب الروح (Story of Mind) کا صرف ایک ترجمہ اور سولر سسٹم کے تین ترجمے آئے جن کی کیفیت آگے آئے گی۔

آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ ترجمہ کرنے والے انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں لیکن بجز ایک کے باقی تمام ترجمے ناقص اور ابتر ہیں۔

کیا اس نتیجہ کے بعد بھی ہمارا قومی کالج علی گڑھ سائنس اور عربی زبان کی تعلیم پر خاص توجہ مبذول نہیں کرے گا۔ مترجمین کے گروہ کثیر میں سے اکثر نے

سائنس کا کورس ہی نہیں لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے مشتہرہ کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا اور جنہوں نے سائنس کو لیا تھا وہ عربی زبان سے ناآشنا تھے اس لئے علمی اصطلاحات کے ترجمہ کے لئے ان کو عمدہ اور مناسب الفاظ نہیں مل سکتے تھے۔

میں آپ سے پھر دوبارہ کہتا ہوں کہ عربی زبان کی تعلیم کے بغیر یورپ کے علوم وفنون سے قوم کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔'' (۱۳)

اس اقتباس کی آخری سطروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے بھی نواب محسن الملک کو اس طرف متوجہ کرا چکے تھے۔ البتہ یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ نواب صاحب نے اس کا کیا جواب دیا۔؟

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اسی اجلاس میں ۲رجنوری ۱۹۰۳ء کو علامہ شبلی نعمانی نے ''اسلام اور تعصب'' کے عنوان سے ایک وقیع لکچر دیا۔ نواب محسن الملک نے اس کا اعلان اس طرح کیا تھا۔

''مولانا شبلی صاحب جن کی عالمانہ قابلیت سے آپ خوب واقف ہیں اور جن کی تعریف میں خود نہیں کرنا چاہتا، وہ ایک لکچر دیں گے، جس کا عنوان ہے ''اسلام اور تعصب۔'' (۱۴)

خطبات شبلی میں یہ خطبہ ''تعصب اور اسلام'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

لکچر: تعصب اور اسلام

حضرات!

یہ موقع میرے لیے کسی قدر بدقسمتی کا موقع ہے۔ اپنی ذاتی حالت کے لحاظ سے تو میں علیل ہوں۔ میرے سر میں درد ہے اور سامعین کی جماعت پر جب نظر کرتا ہوں تو تعداد کم اور بہت کم معلوم ہوتی ہے۔

صاحبو!

ہر لکچرار کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میرے لکچر کی داد ملے۔ تقریر کے

وقت مجمع کافی ہو۔ پہلی تکلیف کا تو کچھ علاج نہیں۔ البتہ دوسرے امر کے متعلق مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آجانے سے تسکین ہوگئی۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب عالم گیر (۱۵) اور داراشکوہ (۱۶) کا مقابلہ تھا۔ فوجیں آمنے سامنے پڑی تھیں۔ داراشکوہ کے ساتھ قریب دو لاکھ آدمی تھے۔ راجہ جسونت سنگھ (۱۷) بھی اسی کا شریک حال تھا۔ عالم گیر کے پاس صرف پچاس ہزار کی جمیعت تھی۔ یا شاید اس سے بھی کم۔ رات کو عالم گیر فوج میں بھاگڑ پڑی۔ غل ہونا شروع ہوا کہ سپاہی بھاگے جاتے ہیں۔ اس واقعہ کی جب عالم گیر کو اطلاع ہوئی تو اٹھا اور جا کر دیکھا کہ واقعی لوگ چلے جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ عالم گیر مضطرب ہوتا اس نے نہایت استقلال سے کہا کہ جانے والوں کو جانے دو۔ ان کو مت روکو۔ کل کو ان شاء اللہ میری ہی فتح ہوگی۔ کیونکہ بھاگنے والے آج ہی لشکر سے علاحدہ ہو جائیں گے اور جو باقی رہیں گے وہ وفادار، جاں باز اور ثابت قدم ہوں گے۔ چنانچہ اگلے دن پیش گوئی پوری ہوئی۔ داراشکوہ کو شکستِ فاش ملی اور عالم گیر کو فتح نصیب ہوئی۔ اسی طرح میں امید کرتا ہوں کہ جو تعداد اب یہاں باقی رہ گئی ہے، گو دیکھنے میں تھوڑی سہی لیکن ثابت قدم ہوگی۔ جو میں کہوں گا دل سے اسے سنے گی اور یقیناً میری فتح ہوگی۔

حضرات! آج کا سبجیکٹ جس پر میں تقریر کرنا چاہتا ہوں ''تعصب اور اسلام'' ہے، آپ جانتے ہیں کہ ایک واقعہ کے دنیا میں مختلف اسباب ہوتے ہیں مسلمانوں کے تنزل پر مصلحانِ قوم عرصہ سے غور کر رہے ہیں جس کے بہت سے مختلف اسباب دریافت کیے گئے ہیں، میری رائے میں یہ دعویٰ کہ تنزل کے مختلف وجوہ ہیں، صحیح نہیں اور اگر ان چند در چند اسباب کو مان بھی لیا جائے جو تنزل کے باعث کہے جاتے ہیں تاہم جیسا کہ میں بیان کروں گا سب سے بڑا سبب اسلام کے تنزل کا مسلمانوں کا تعصب ہے اور اس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہوسکتا، تعصب ایک ایسا لفظ ہے جس کا ٹھیک اردو میں ترجمہ کرنا دشوار ہے، اس لفظ کے استعمال سے خود اس کے معنی پیدا ہوتے ہیں اور آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں، مسلمانوں کو جس امر کی ترغیب دی جاتی ہے وہ تحصیلِ علم ہے لیکن ہر ایک ایسی چیز سے آگے نہ بڑھنے کی وجہ ان کا تعصب ہے، علوم وفنون کی دنیا میں ترقی ہو رہی ہے، مگر مسلمان ان علوم وفنون کی طرف اس لیے مائل نہیں کہ یہ غیروں کے علوم اور غیروں کے فنون

ہیں، غرض اخلاق میں، تمدن میں، تعلیم میں ہر ایک بات میں آگے چلنے سے مسلمان اس وجہ سے رکتے ہیں کہ انھیں تعصب ہے۔

اب دیکھنے کی یہ بات ہے کہ آیا وہ مسلمان جو قرونِ اولیٰ میں تھے اور جو اسلام کے اصلی اور سچے نمونے تھے۔ ان میں بھی تعصب تھا اور یہ تعصب یا اسلام کی حقیقت میں داخل ہے یا ہمارا خود پیدا کیا ہوا ہے۔

حضرات! علی گڑھ کی تھوڑی سی جماعت کو دیکھ کر آپ خیال نہ فرمائیے کہ تعصب قوم سے مٹ گیا یا کم ہو گیا۔

اولاً تو علی گڑھ والوں کی بہت تھوڑی سی تعداد ہے اور ان میں جس قدر ہیں وہ سب نوکری پیشہ، اپنی اولاد کو مجبوراً انگریزی پڑھانے لگے ہیں، البتہ بڑے بڑے گھرانوں اور خاندانوں کو دیکھئے جن میں بڑے بڑے فقہا، علما اور صوفیا گذرے ہیں اور جن کی اولاد ہماری گذشتہ عظمت کی یادگار اور پچھلی بزرگیوں کی نمونہ ہے۔ کبھی آپ کو فرصت ملے اور آپ جا کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ اس وقت تک وہاں کیا حالت ہے اور ان کے کیا خیالات ہیں۔

مجھے ایک دفعہ خود یہ اتفاق ہوا ہے کہ میں ایک مرتبہ الہ آباد سے علی گڑھ آ رہا تھا، ریل میں مجھ سے ایک دوست نے کہا کہ میرے ایک عزیز کا لڑکا اس لیے بھاگا جا رہا ہے کہ اس کو انگریزی پڑھائی تجویز کی گئی ہے، اس کے اور عزیز قریب اچھے اچھے عہدوں پر ہیں۔ اگر یہ تعلیم سے رہ گیا تو کسی کام کا نہ رہے گا۔ انگریزی تعلیم کو وہ مذہباً درست نہیں سمجھتا۔ آپ مہربانی کر کے اس کو سمجھا دیجئے کہ انگریزی پڑھنا حرام نہیں ہے۔ میں نے کہا یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ آپ اس کو میرے پاس بلائیے۔ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ لڑکے کو انھوں نے آواز دی اور وہ میرے پاس آ بیٹھا۔ یہ لڑکا الہ آباد کے ایک مشہور اور معزز خاندان دائرۂ ساداتِ بارہہ میں سے تھا۔ میرے دوست نے لڑکے سے مخاطب ہو کر میری طرف اشارہ کر کے کہا یہ صاحب جن کے پاس تم بیٹھے ہو مولوی ہیں اور اچھے خاصے مولوی ہیں۔ انگریزی پڑھنے کے متعلق جو تمھیں شکوک اور شبہات ہوں وہ ان سے دریافت کر کے رفع کر لو۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ میاں انگریزی پڑھنا حرام نہیں ہے۔ اگر

حرام ہوگی تو انگریزی فلسفہ، انگریزی سائنس، اتنی بات سن کر اس نے تعجب سے پوچھا کیا حقیقت میں آپ مولوی ہیں؟ کیا آپ واقعی عربی جانتے ہیں؟، اگر آپ عربی جانتے ہیں تو کہاں تعلیم پائی ہے؟ اور کس سے پڑھا ہے؟ میں نے کہا ہاں میں نے عربی پڑھی ہے اور فلاں فلاں استادوں سے پڑھی ہے۔ یہ معلوم کر کے بھی اسے تشفی نہ ہوئی۔ لڑکے نے عربی میں شرح ملا پڑھی تھی۔ اس کا ایک مقام مجھ سے دریافت کیا۔ جواب پانے پر اور زیادہ حیرت ہوئی۔ حیرت کس بات کی ہوگی؟ اس بات کی کہ یہ کیسے مولوی ہیں کہ مولوی ہو کر انگریزی تعلیم کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح میں جس قصبہ میں رہتا ہوں، وہاں بھی یہی حال ہے۔ ہر چند اصلاح کی کوشش کرتا ہوں مگر اثر نہیں ہوتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج ہم میں کس قدر ایسے لوگ ہیں جو بغیر ضرورت کے انگریزی تعلیم پاتے ہیں۔ اگر گورنمنٹ ملازمت سے انگریزی دانی کی قید اٹھا دے تو اس وقت معلوم ہو۔ اس وقت بہت سے آدمیوں نے انگریزی سے واقفیت حاصل کی ہے اور حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن کیا یہ کوشش علم کو علم اور زبان کو زبان سمجھ کر حاصل کرنے کی ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ مجبوری کی وجہ سے ہے۔ تعصب اب تک گیا نہیں، جو کچھ ہو رہا ہے، وہ لاچاری اور بے بسی ہے۔ اب اس امر پر غور کرنا باقی ہے کہ آیا اسلام اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس موقع پر بہت سے ایسے اصحاب تشریف رکھتے ہیں جو انگریزی بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں سے زیادہ غیر متعصب ہو۔ اخلاق میں، پالیٹکس میں، معاشرت میں، تمدن میں، مذہب میں، جنھوں نے انگریزی زبان حاصل کی ہے اور قدیم قوموں کی تاریخ سے واقف ہیں وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

صاحبو!

تعصب کے جو عنوان قائم کئے جاتے ہیں اگر اس کی تفصیل کی جائے تو بہت سے اقسام بن جاتے ہیں۔ مذہبی تعصب، پولٹیکل تعصب، سوشل تعصب، قومی تعصب، یہ بالکل جداگانہ سرحدیں ہیں۔ جن پر میں تفصیل کے ساتھ بحث کروں گا۔ یہ امر لازمی نہیں ہے کہ جس کو ایک قسم کا تعصب ہو اس کو دوسرے اقسام کا بھی تعصب ضرور ہو۔ ہمارے ہندو بھائی موجود ہیں ان کو کبھی ملکی

یا پولیٹکل تعصب نہیں رہا۔ وہ گورنمنٹ کے وفادار ہیں۔ جب یہاں مغل امپر رتھے، اس وقت بھی انھوں نے اس تعصب کو نہیں برتا۔ البتہ قومی اور سوشل تعصب ان میں موجود ہے۔ اگر آپ ان کے ایک گلاس کو ہاتھ لگا دیں تو وہ اس کو قطعی ناپاک سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے تعصب کو پولٹیکل تعصب سے کچھ علاقہ نہیں، اور ایک لحاظ سے نہ اس کو اخلاقی تعصب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام میں نہ قومی تعصب ہے، نہ مذہبی، نہ اور کسی قسم کا۔ یہ معلوم کرنے کی بات ہے کہ مذہبی تعصب جو تمام تعصبوں کی جڑ ہے اس کا اثر اسلام میں کہاں تک پایا جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اسلام نے تمام مذاہب کے انبیاء اور پیغمبروں کو نبی تسلیم کیا اور ان کی عزت کی ہے۔ عزت بھی ایسی جو ان کے امتیوں اور پیروؤں سے بھی کبھی اور کسی وقت میں نہ بن پڑی۔ بنی اسرائیل میں حضرت نوحؑ (۱۸) اور حضرت شیثؑ (۱۹) کو دیکھو کہ ان کا ذکر کس عظمت اور احترام کے ساتھ قرآن شریف میں کیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا یہودیوں نے نبیوں کے درجہ کی دو طرح پر تقسیم کی ہے۔ ایک نبی دوسرے ملاخیم، جن کو بادشاہ کہنا چاہیے۔ چنانچہ یہود حضرت داؤد علیہ السلام (۲۰) کو نبی نہیں جانتے بلکہ ان کو ملاخیم کے درجہ میں شمار کرتے ہیں، مگر اسلام ان کو بھی پیغمبر مانتا ہے۔ یہ ہے مذہبی آزادی۔

قرآن مجید چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا، اس میں ایران اور ہندوستان کے نبیوں کا ذکر نہیں، تاہم بہت سی خصوصیات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور عام طور پر کہہ دیا گیا ہے۔ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ [رعد۔ ۷] ''ہر قوم کے لیے ایک ہادی اور رہنما ہوتا ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا: "وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَومِه [ابراہیم ۔۴] ''اور ہم جس قوم پر کوئی پیغمبر بھیجتے ہیں تو اس کا ہم زبان اور ہم قوم بھیجتے ہیں۔'' غرض کہ عام طور پر انبیائے سابقین کو اسلام نے مانا اور ان کی عزت کی۔ یہ تھی پہلی مذہبی فیاضی اور مذہبی آزادی۔

دوسرا طریقہ مذہبی بے تعصبی کا یہ ہے کہ اسلام نے بے شک یہ دعویٰ تو کیا کہ تمام دنیا کے سامنے اس کو پیش کرنا چاہیے، مگر اس طرح کہ مطلقاً اس میں تعصب کا شائبہ نہ ہو، صرف بحیثیت ایک سمجھانے والے واعظ کے اپنا فرض پورا کر دے، قرآن مجید میں خدا نے حکم دیا ہے۔ اُدْعُ اِلٰی

سَبِيۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَن.[نحل.۱۲۵] ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاوَ تمام دنیا کو اسلام کی طرف معقول طرح سے سمجھا سمجھا کر، اچھی طرح حکمت کے ساتھ، اگر مناظرہ کرو کسی سے تو بہ طرز احسن۔'' کٹ حجتی سے نہیں جو آج کل مروج ہے، (مذہب ایسی چیز نہیں جو اکراہ کا متحمل ہو) یہ بتایا تھا اسلام نے ہدایت کا طریقہ اور سکھا دیا تھا کہ اسلام میں جبر نہیں ہے، چنانچہ خدا فرماتا ہے، لَا اِکۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ قَد تَبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیّ. [بقرہ.۲۵۶] ''مذہب میں زبردستی نہیں ہے، مذہب نام ہے عقیدہ کا، ہماری فیلنگ کا، ممکن ہے کہ آپ اپنی طاقت کے زور سے زبردستی کسی سے نماز پڑھوالیں، روزہ رکھوالیں، زکوٰۃ دلوا لیں، مگر دل کا یقین لانا اور خدا کا حکم سمجھ کر احکام کی تعمیل کرنا زبردستی سے ممکن نہیں، جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ (ﷺ) کو اس معاملہ میں حریص پایا تو فرمایا:اَفَاَنۡتَ تُکۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوۡنُوۡا مُوۡمِنِیۡنَ .[یونس۔۹۹] ''کیا محمد (ﷺ) تم لوگوں کو مجبور کر سکتے ہو تا کہ وہ سب ایمان لے آویں، ایک اور مقام پر یہ ارشاد ہوا:فَذَکِّرۡ اِنَّمَا اَنۡتَ مُذَکِّر لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ۔ [غاشیہ۔۲۱،۲۲] یعنی اے محمد (ﷺ) لوگوں کو سمجھا دو، تمہارا کام صرف سمجھا دینے کا ہے، تم کسی کے داروغہ یا گماشتے نہیں ہو، اسی طرح بہت سے ایسے احکام ہیں جن کی تاکید کی گئی ہے، میں ان سب کا اقتباس نہ کروں گا۔

بس جو طریقہ اشاعت اسلام کا بتایا گیا ہے، اس میں کسی قسم کی سختی یا جبر کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ ہر شخص کی مرضی اور دلی خواہش پر اس کو چھوڑ دیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اسلام کے سوا کسی مذہب میں اس قسم کی سختی یا جبر پایا جائے تو اس کو پیش کیجئے، ورنہ میں تو دنیا میں اور قوموں کا یہ حال بتا سکتا ہوں کہ اپنی مذہبی کتابوں کے احکام کو ادنیٰ قوموں کے کانوں تک پہنچانا بھی مذہبی گناہ سمجھتے ہیں۔

یہ ایک مذہب کا مسئلہ ہے کہ غیر قوموں کے کان میں وید مقدس کی آواز نہیں جانی چاہیے۔ کیوں کہ ان کے کان اس قابل نہیں کہ ایسی مقدس کتاب کے احکام سنیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اگر ہمارے مذہب میں آنے کا ارادہ بھی کر لے تو بھی وہ شامل نہیں ہوسکتا۔ بہ جائے

اس کے اسلام یہ سمجھا تا ہے کہ مذہب جبراً قبول نہیں کرایا جا سکتا۔ اسلام تعصب سے بری ہے۔ البتہ اس کی خوبیاں بتاؤ۔ اس کی حقیقت سے دنیا کو واقف کر کے اسلام پھیلاؤ۔ یہ دوسرا طریقہ ہے اس امر کے دیکھنے کا کہ مذہب اسلام بالکل تعصب سے بری ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ دیگر اقوام جو اپنے ہم سایہ ہوں یا سلطنت اسلام کی رعایا ہوں، ان کو مذہبی آزادی دی جائے اور مذہبی ارکان کے ادا کرنے کے لیے کوئی روک ٹوک نہ کی جائے، بلکہ عام طور سے اجازت دی جائے اور ہر شخص بے خوف وخطر اس کے ادا کرنے میں دلیر ہو۔ یہ جتنی باتیں بیان کی گئیں مذہبی آزادی کے لیے بڑی باتیں ہیں۔ اس بارے میں ہماری برٹش گورنمنٹ کا بھی بڑا احسان ہے، جیسا کہ خود آپ دیکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو، ہندوؤں کو، پارسیوں کو، غرض کہ تمام مذاہب کے لوگوں کو مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے اس کے متعلق کیا کیا؟ جس سے اس کی بے تعصبی کا اندازہ کیا جائے۔ ۹ھ یا ۱۱ھ میں جب نجران کے عیسائی مدینہ منورہ میں آئے تو ان کو جناب رسالت پناہ (ﷺ) نے خود اپنی مسجد میں اتارا اور خاطر داری کی۔ حالانکہ وہ عیسائی تھے، رومن کیتھلک۔ جب ان کی نماز کا وقت آیا اور انھوں نے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو صحابہؓ کو تردد ہوا اور بعض کو خیال آیا کہ ہماری مسجد سے باہر نماز پڑھیں، لیکن ہمارے سرور کائنات (ﷺ) نے جن پر ہم کو فدا ہو جانا چاہیے، یہ حکم دے دیا کہ اسی مسجد میں نماز ادا کر لو۔ یہ پورا واقعہ ابن قیم (۲۱) نے زاد المعاد میں نقل کیا ہے۔

اسلام کی تاریخ اٹھا کر کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ وہ کیسی مذہبی آزادیاں دی تھیں جو اسلام نے عطا کی تھیں۔ دیکھو ایک یہ مذہبی آزادی تھی کہ جس وقت ایران، دمشق، مصر کے بڑے بڑے شہر فتح ہوئے اور اسلامی حکومت وہاں پہنچی تو جو عہد نامے لکھے جاتے تھے، ان میں ہمیشہ حضرت ابوبکرؓ (۲۲)، حضرت عمرؓ (۲۳)، حضرت عثمانؓ (۲۴)، حضرت علیؓ (۲۵) تصریح کے ساتھ یہ شرط لکھتے تھے کہ تمام گرجے، تمام معابد، تمام خانقاہیں، برقرار رکھی جائیں گی۔ ان میں تمام مراسم مذہبی جس طرح ہوتے آئے ہیں، ادا ہوتے رہیں گے۔ اور غیر مذہب والوں کا کوئی شخص اختلافِ مذہب کی وجہ سے سرکاری عہدوں سے برطرف نہیں کیا جائے گا۔ ایک یہی واقعہ نہیں بلکہ دو ایک

اور مثالیں آپ کو بتاتا ہوں تا کہ آپ اسلام کی بے تعصبی کا پورے طور سے اندازہ کر سکیں۔

ولید بن عبدالملک [۶۶۸-۷۱۵ء] (۲۶) کو جو بنی امیہ کا بڑا بادشاہ گذرا ہے، ایک مسجد بنوانے کا شوق ہوا اور ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے دمشق میں مسجد تیار ہوئی۔ مسلمانوں کو جب یہ حال معلوم ہوا کہ اس قدر روپیہ مسجد پر صرف ہوا ہے تو ان میں برہمی پھیلی۔ زمانہ تھا مذہبی آزادی کا، مسلمانوں کا خیال تھا کہ نماز پڑھنے کے لیے ایک سادہ مسجد کافی ہے۔ ولید گو بادشاہ سہی لیکن اس کو یہ حق نہیں کہ بے ضرورت کروڑوں روپیہ مسلمانوں کے بیت المال کا اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے ضایع کر دے۔ روپیہ پبلک کا ہے اور پبلک فنڈ اس لیے نہیں کہ یوں بے دریغ صرف کر دیا جائے اور کسی کی بات تک نہ پوچھی جائے۔ چونکہ عام طور پر برہمی پھیل گئی تھی، کھلم کھلا لوگ اعتراض کرتے تھے۔ ولید کے کانوں تک جب یہ خبر پہنچی تو ساری قوم کو بلایا اور بھرے دربار میں ایک اسپیچ دے کر اس بنا پر معافی چاہی کہ اب بھی پبلک فنڈ میں اس قدر روپیہ ہے کہ اگر میرے ملک میں متواتر دس برس تک قحط پڑے تو کافی ہو سکتا ہے اور کسی متنفس کو ذرہ برابر نقصان یا تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔

قصہ مختصر اسی مسجد کے پاس جس کو ولید نے اس شوق سے بنایا، ایک گرجا یوحنا کا تھا۔ مسجد میں زمین کی کمی تھی۔ ولید نے عیسائیوں سے گرجے کی زمین مانگی اور کہا کہ جس قدر قیمت چاہو لے لو۔ میں اس زمین کو مسجد میں شامل کروں گا۔ انھوں نے انکار کر دیا کہ رضامندی سے تو دیں گے نہیں اور اگر زبردستی سے لو گے تو ہمارے گرجے کو جو گرائے گا اسے کوڑھ ہو جائے گا۔ ولید کو پادریوں کی بات ناگوار ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں گراتا ہوں، دیکھیں ہم کو کیسے کوڑھ ہوتا ہے۔ چنانچہ فوراً گرجے کے گرائے جانے کا حکم ہو گیا اور وہ زمین مسجد میں شامل کر لی گئی۔ ایک بات یہاں اور کہنے کے قابل ہے کہ ولید ان بادشاہوں میں سے نہ تھا جس کا کوئی فعل قابل تقلید سمجھا جائے۔ اس کے بعد عمرؓ بن عبدالعزیز [۶۸۲-۷۲۰ء] (۲۷) خلیفہ منتخب ہوئے۔ حقیقت میں یہ شخص تھا ریپریزنٹیٹو مسلمانوں کا۔ اس کے بادشاہ ہونے پر عیسائی آئے اور انھوں نے دربار خلافت میں شکایت کی کہ ولید نے ہماری بغیر مرضی ہمارے گرجے کو گرا کر فلاں مسجد میں شامل

کرلیا۔جس کوسن کرعمرؓابن عبدالعزیز نے حکم دیا کہ گرجے کی زمین پر مسجد کا جوحصہ تعمیر ہوا ہے،اس کوفوراً منہدم کر کے سرکاری خرچ سے دوبارہ گرجا پھر بنادیا جائے اور مسجد اسی زمین میں محدود رہے۔ یہ تھی مذہبی بےتعصبی،جس کی اسلام نے تعلیم دی تھی۔

ہماری تاریخوں میں یہ سب باتیں موجود ہیں۔اس سے بڑھ کرایک دوسراواقعہ اورآپ کو سناتا ہوں۔مصر کے بشپ یوٹیکٹس (۲۸) نے جس کوعربی میں سعید بن البطریق کہتے ہیں،مصر کی تاریخ عربی زبان میں لکھی ہے جو یورپ میں چھپی ہےاور لیٹن میں بھی جس کا ترجمہ ہوا ہے۔ یہ شخص ۴۸ھ میں موجودتھا۔اس نے ایک یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے اسکندریہ (۲۹) فتح کیا، وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام (۳۰) کی تصویرتھی۔کسی صحابی یاکسی فوجی سپاہی نے ایک تیر ماراجس سے اس تصویر کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔عیسائی جمع ہوکرمسلمانوں کے گورنرعمرو بن العاصؓ (۳۱) کے پاس شکایت لائے کہ تمہارے آدمیوں نے حضرت عیسیٰ کی آنکھ کوخراب کردیا ہے۔ہم اس کا معاوضہ یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے پیغمبر محمد (ﷺ) کی تصویر بنا کر دوتو ہم بھی اس کی آنکھ پھوڑ دیں۔اس پرعمرو بن العاصؓ نے جواب دیا کہ یہ فعل عبث ہے۔ہم لوگ موجود ہیں تم جس کی چاہوآنکھ پھوڑ ڈالو۔ایک عیسائی راضی ہوگیا۔عمروبن العاصؓ نے اپناخنجراس کے ہاتھ میں دیااوراپنی آنکھیں سامنے کردیں۔ جب اس نے دیکھا کہ خود گورنرعمرو بن العاصؓ اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالنے کوتیار ہےتو تلوار ہاتھ سے گر پڑی اوراس نے ارادہ سے باز ہوکرکہا کہ ایسی قوم سے جو اس درجہ دلیر،فیاض اور بےتعصب ہو،انتقام لینا سخت بےرحمی اور بےقدری ہے، یہ تھی بےتعصبی۔

مذہب کے بعد دوسرادرجہ قومی تعصب کا ہےاورقومی تعصب بےڈھب چیز ہے۔تمام دنیا میں جس طرح قومی تعصب رہا ہے، وہ اس سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ کس نے کس کووحشی، کس نے کس کوشودر، کس نے کس کوباربرین اورکس نے کس کوارذل ترین بشر کا خطاب دیا۔دورکیوں جاؤ، دوسری اقوام پر کیوں نظر ڈالی جائے،خودعربوں کو دیکھو۔ باوجودیکہ زمانہ جاہلیت میں خود جاہل تھے،کھانے کوغذااور پہننے کو کپڑا نصیب نہ تھا،ادنیٰ درجہ کی غذا کھاتے پھرتے تھے،مگرقومی تعصب کی یہ کیفیت تھی کہ کل دنیا کے لوگوں کوعجم کہتے تھے۔عجم کے معنی ہیں گونگا،عجم کوئی لفظ موقرنہیں

ہے۔انتہا یہ ہے کہ جس زمانہ میں نعمان بادشاہِ عرب تھا(۳۲)،نوشیرواں (۳۳) نے نعمان سے کہلا بھیجا کہ میں تمہارے خاندان میں شادی کرنی چاہتا ہوں۔باوصف اس کے کہ نعمان نوشیرواں کا محکوم تھا، یہ پیغام سنتے ہی بہت برافروختہ ہوااور کہا کہ اب ایسا رتبہ عجم کا ہوگیا ہے کہ میرے یہاں قرابت اور وصلت کی خواہش کرنے لگا۔آخرکار اس وجہ سے لڑائی ہوئی اور نعمان مارا گیا،لیکن وصلت گوارا نہ کی۔ یہ دعویٰ تھا عرب کو اپنی قومیت کا۔خود عرب میں جو قبائل تھے وہ اپنے سے چھوٹوں کونہایت ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے۔مثال کے طور پر ایک حکایت بیان کرتا ہوں۔سب سے پہلے لڑائی جو جنگ بدر (۳۴) کے نام سے ہوئی،قریش کی طرف سے پہلے تین شخص عتبہ(۳۵) ولید(۳۶)اور شیبہ(۳۷)میدان میں آئے اور کہا اے محمد(ﷺ) تین آدمیوں کو ہمارے مقابلہ کے لیے بھیجو۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین انصاریوں کو بھیج دیا۔انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو،کہا ہم انصار ہیں تو عتبہ انصار کا نام سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوکر کہتا ہے۔

فرست اے محمد بہ پیکارِ ما
کسے را کہ باشد سزاوارِ ما

یعنی ہم ایسے ہیٹے اور ذلیل اشخاص سے لڑنا نہیں چاہتے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عذر کو منظور کر کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ،حضرت حمزہؓ (۳۸) اور حضرت عبیدہؓ (۳۹) کو بھیجا اور فرمایا کہ یہ تو برابر کے ہیں،اس وقت اس نے یہ کہا:

بگفتا کنوں رفت از رزم بیم
کہ ہستیم ہم رزم مرد کریم

غرض یہ تھے قومی تعصّبات۔

اب دیکھئے کہ اسلام نے اس قومی تعصب کے ساتھ کیا کیا۔یہ کیا کہ اس کی جڑ کھود کر پھینک دی اور ایک اخوت تمام عالم میں قائم کردی۔جن لوگوں کو قریش (۴۰) اپنے پاس کھڑا کرنا گوارا نہیں کرتے تھے،اسلام نے ان ہی کو ان کے سر کا سرتاج بنادیا۔سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے،حضرت بلالؓ (۴۱) اور سہیلؓ (۴۲) کون تھے؟ لیکن آج تک کس عزت اور احترام کے ساتھ

ان کا نام لیا جاتا ہے۔ جس دن حضرت بلالؓ کا انتقال ہوا ہے، اس روز صحابہؓ نے رو رو کر کہا کہ آج ہمارا سید مر گیا۔ آج ہمارا سردار مر گیا۔ وہ غلام رہے تھے۔ متعدد آدمیوں کے آخر میں حضرت ابوبکرؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے منھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی بات پر اچانک یہ جملہ نکل گیا، یا بلال انت اسود یعنی اے بلال تم تو حبشی سیاہ ہو۔ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عمرؓ تم میں اب تک جہالت کی بو باقی ہے۔ اتنا سننا تھی کہ زمین پر گر پڑے اور زمین پر سر پٹک دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھنے کے واسطے حکم دیا تو فرمایا کہ اب تو جب تک بلالؓ اپنی جوتی کی نوک کو ٹیک کر نہ اٹھائے گا میں نہ اٹھوں گا۔ بلالؓ کو ادب مانع تھا۔ وہ کہتے تھے کہ گو اب میرے آقا نہ سہی، لیکن اس وقت میں میں ان کا غلام بن کر رہ چکا ہوں، مجھ سے یہ گستاخی اور بے ادبی نہ ہوگی۔ آخر کار بہت دیر ہوگئی اور حضرت بلالؓ کو وہی کرنا پڑا جس کا عہد کر کے حضرت عمرؓ زمین پر گرے تھے۔

صاحبو! عربوں کی مشہور و مغرور قوم کے افسانے آج تک دنیا میں شہرت پذیر ہیں، جن کے بڑے بڑے دعوؤں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا اور سنا کہ کس طرح ان کے خیالات میں دفعتہً ایک تغیر عظیم پیدا ہوگیا اور ایک صدیوں کی جنگ جو تعصب اور جہالت میں ڈوبی ہوئی قوم دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ کی بہتر سے بہتر شایستہ اور مہذب قوم بن گئی۔

دیلمی (۴۳) اور سلجوقی (۴۴) وغیرہ وغیرہ خاندانوں میں بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ عرب دوسری قوم تھی اور یہ دوسری۔ بحیثیت ہم قومی کوئی آپس میں رابطۂ اتحاد نہ تھا۔ لیکن اسلام نے اور عرب نے ان کو بادشاہ مانا اور کسی قسم کی بحث و تکرار کی نوبت نہ آئی۔

آپ صاحبوں کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو کہ مصر میں ایک خاندان گذرا ہے جس کو عربی میں چراکسہ کے نام سے اور آج کل سرکیشین کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ لوگ شروع سے لے کر اخیر تک غلام رہے تھے۔ قاعدہ تھا کہ غلام کا لڑکا بادشاہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن نسلاً بعد نسلٍ دوسو برس ان ہی غلاموں کے بیٹے اور پوتوں نے مصر میں بادشاہ ہو کر حکومت کی اور عرب ان کی رعایا بن کر رہے۔

یورپ والوں کی طرف سے ہمارے مذہب پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں غلامی کا رواج تھا۔ اسلام غلامی کی تعلیم دیتا ہے تو اب میں کہوں گا اگر ہم چراکسہ، بلالؓ، محمود (۴۵) جیسے غلام بناتے تھے تو مبارک تھی ایسی غلامی۔

اب رہا تیسری قسم کا تعصب وہ ملکی تعصب ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام کا نظام اور طرز ایسا واقع ہوا ہے کہ اس کو گورنمنٹ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پبلک کے تعلقات گورنمنٹ سے بحیثیت گورنمنٹ کے تین قسم کے تعلقات ہیں۔ ایک وہ جو بالکل دشمن ہے، جیسے کہ ایک وقت میں برٹش اور بوئروں سے جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ان کو حربی کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر اسلام کے مقابلہ میں لڑائی ہو تو اصطلاح شریعت میں ایسے فریق کو حربی کہتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن سے اسلام کے مقابلہ میں صلح کا کوئی عہد و پیمان ہو جائے، ان کو معاہد کہتے ہیں۔ تیسرے عام رعایا وہ ذمی کے لقب سے پکاری جاتی ہے۔ چنانچہ حربی، معاہد، ذمی، یہ تین قسم کے لوگ بیان کیے گئے ہیں جو تعلقات ہیں وہ ان ہی سے ان کے سوا اور تعلقات کی کوئی صورت نہیں۔

اب دیکھنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اسلام نے کیسا تعلق اور کیسا برتاؤ رکھا ہے۔ سب سے بڑا سخت برتاؤ حربیوں سے ہونا چاہیے تھا کہ جن سے ہمارا مقابلہ ہو رہا ہے، مگر اسلام نے کس بے تعصبی کے ساتھ ان سے برتاؤ کیا۔

صاحبو! یہ کوئی پردے کی بات نہیں جو اسلام نے کہا کہ اگر وہ یعنی حربی تمہارا مقابلہ کریں اور تم پر چڑھ کر آئیں تو پہلے مدافعت کرو اور اپنے آپ کو بچاؤ۔ اگر وہ ابتدا کریں تو تم بھی لڑو۔ اس پر یہ شرط اور لگا دی۔ وَقَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. [بقرہ۔۱۹۰] یعنی ان سے ایسے لڑو جیسے وہ تم سے لڑتے ہوں۔ حد سے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔ حد سے بڑھنے والوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. [ممتحنہ۔۸] یعنی ''خدا تم کو منع نہیں کرتا احسان کرنے سے ان لوگوں کے ساتھ جو تم سے مذہبی لڑائی نہیں لڑتے، نہ یہ کہتا ہے کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہ کرو۔

خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" البتہ خدا ان لوگوں کی نسبت منع کرتا ہے، جن میں یہ تین باتیں پائی جائیں۔ اول وہ جو مذہبی لڑائی تم سے لڑیں۔ دوسرے وہ جو تم کو تمہارے گھروں سے اور وطنوں سے نکال دیں۔ تیسرے وہ جو تم کو نکالتے ہوں۔ ان کی تائید اور مدد کرنے والے ایسے لوگوں سے بے شک محبت نہ رکھو، کیونکہ یہ بے انصافی اور ظلم کی بات ہے۔ یہاں تک تو کہہ دیا گیا کہ خاص حربیوں میں جو نہ نکالیں تم کو تمہارے گھروں سے اور نہ ستائیں تم کو، ان کے ساتھ بھی محبت اور انصاف سے پیش آؤ۔

صاحبو! یہ صرف حکم ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ان احکام پر عمل درآمد رہا ہے۔ فقط اسلام ہی ایک ایسی شے ہے، جس نے حد فاصل مقرر کردی۔ اس سے کم وبیش نہ کوئی گھٹ سکتا ہے نہ بڑھ سکتا ہے۔

ماں باپ کی اطاعت اور فرماں برداری کا قرآن مجید میں حکم ہے۔ "وَاِنْ جَاهَدَاکَ عَلٰیٓ اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَالَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفاً." [لقمان ۱۵] لیکن اگر وہ کافر ہیں اور تم کو بھی کافر بنانا چاہتے ہیں اور مجبور کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ مشرک بن جاؤ تو ایسی اطاعت فرض نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی سوشل اور اخلاقی برتاؤ کی ممانعت نہیں، بلکہ تاکید کی۔ لیکن غور سے دیکھو تو کہاں وہ تعلیم جس میں مذہبی مخالفت پر بھی میل جول اور آپس کے سوشل مراسم رکھنے کی تاکید کی گئی، مگر اب موجودہ حالت کیا ہے؟ اگر ذرا سا بھی معمولی اختلاف ہو تو کہاں سے کہاں تک نوبت پہنچتی ہے۔ ذرا ذرا سی شکر رنجیوں اور اختلاف رائے پر ایک دوسرے کی عزت لینے اور بدنام کرنے پر ہم کس قدر دلیر ہیں۔ ایک عرفی (۴۶) کی اگر مبالغہ سے تعریف کرتا ہے تو دوسرا فیضی (۴۷) پر ہزار ہا نکتہ چینیاں کرکے اس کا عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ انیس (۴۸) اور دبیر (۴۹) کو خاک میں سوئے مدت گذری، لیکن آج تک یہ کیفیت ہے کہ اگر کوئی دبیر کو مانتا ہے تو انیس کا پیرو صرف دبیر ہی کی ہیچ مدانی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان کی مخالفت اور ضد میں ان کے اسلاف کی گڑی ہڈیاں بھی اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھتے۔ میں نے مثالاً یہ باتیں بیان کیں۔ ورنہ آئے دن جو اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں،

اس سے زیادہ اور بہت زیادہ ہیں۔اب رہی دوسری قوم اور رعایا وہ ذمی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔معاہد اور ذمیوں کے لیے ایک حکم ہے۔قبل اس کے کہ اور حالات بیان کیے جائیں، پہلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں اور خیال کرنے کے لائق ہے، وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس امر کو دیکھیں کہ ذمیوں کو کس خطاب سے یاد کیا گیا ہے۔چنانچہ لفظ ذمی مشتق ہے ذمہ سے،یعنی وہ لوگ جن کی جان و مال کے ہم ذمہ دار ہیں۔جناب امیر علیہ السلام(۵۰) سے مروی ہے کہ: **اموالهم اموالنا و دمائهم دماء نا**''(۵۱)ذمیوں کا مال ہمارا مال اور ان کا خون ہمارا خون ہے۔

حضرات!

یہ باتیں زبانی نہیں بلکہ ایسا ہی ہوتا بھی تھا۔اگر آپ اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مساوات اور برابری کی بیسیوں مثالیں اس قسم کی موجود ہیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت تین وصیتیں فرمائی تھیں۔دو وصیتوں کو تو قلت وقت کی وجہ سے اس وقت بیان نہیں کر سکتا۔تیسری بات یہ تھی کہ دیگر اقوام مثل یہود وغیرہ جو رعایا ہیں ان کی حفاظت کا بے حد خیال رکھنا۔کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے، کیونکہ یہ ہمارے ذمی ہیں اور ہم ان کے ذمہ دار ہیں۔

اس کے متعلق ایک چھوٹا سا واقعہ عرض کرنے کے قابل ہے۔جس زمانہ میں رومیوں کے ساتھ مقابلہ ہوا ہے اور مختلف مقامات، دمشق، حلب وغیرہ فتح ہو چکے تو بادشاہ روم نے مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہا۔بڑے ساز و سامان سے تیاری کی۔حضرت ابوعبیدہؓ مسلمانوں کی فوج کے حاکم تھے۔فوج نے اس وقت مشورہ دیا کہ ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہیے۔یہاں سے نکل جانا بہتر ہے یا رومیوں کا مقابلہ کرنا اچھا۔بعض کی رائے ہوئی کہ یہیں سے بیٹھے بیٹھے جواب دیا جائے۔یہ سن کر اور لوگ بولے کہ تمام رعایا وہی مذہب رکھتی ہے، جس کے روم والے پابند ہیں۔جب باہری حملہ ہوگا تو یہ بھی ان ہی میں مل جائیں گے۔پس بہتر یہی ہے کہ ان کو شہروں سے نکال دیا جائے۔اس وقت ہم اپنی پورے طور سے حفاظت کر سکیں گے اور کوئی کھٹکا باقی نہ رہے گا۔جس قدر صحابی وہاں اس وقت موجود تھے، یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور حضرت عبیدہؓ سے کہا کہ اے ابوعبیدہؓ کیا حق ہے تم کو کسی

کے نکالنے اور شہر بدر کرنے کا۔ اگر تم کو دوسرے لوگوں سے اندیشہ ہے تو بہ جائے اس کے کہ ہم ان کو نکالیں خود ہم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ کہہ کر یہودیوں اور عیسائیوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ ہم نے تم سے جزیہ لیا تھا، اس خدمت کے معاوضہ میں جزیہ لیا تھا کہ چوروں، اچکوں اور دشمنوں سے تمہاری حفاظت کریں گے۔ اب ہم یہاں سے جاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ جو خراج تم نے دیا تھا، وہ اپنے پاس رکھیں۔ لہٰذا اس کو ہم سے واپس لو۔ جس طرح حضرت ابوعبیدہؓ جزیہ کی رقم واپس دینے لگے تو ان کو سخت حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ آج اگر مسلمانوں کی جگہ دوسرے آدمی ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ بہت سی دعائیں دیں اور کہا کہ خدا تم کو پھر واپس لائے۔ یہ تھی اصلی بے تعصبی اور طبیعت کی فیاضی، جو اسلام نے برتی۔ اگر کوئی شخص حالات کی تحقیق کرے تاریخوں کے ورق الٹے تب معلوم ہو کہ اسلام نے غیر قوموں کے ساتھ، غیر مذہب کے ساتھ، کیا کیا رعایتیں کی ہیں۔ کس قدر ان کی آبرو کا لحاظ رکھا ہے۔ ایک اور مثال بیان کرتا ہوں۔ عمر بن سعدؓ (۵۲) ایک بڑے خدا پرست صحابی تھے۔ عمرؓ نے ان کو حمص (۵۳) کا عامل مقرر کر کے بھیجا تو انھوں نے یہ شرط کی کہ تنخواہ لے کر قوم کا کام نہ کروں گا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ اب میں نوکری کرنی نہیں چاہتا۔ یہ استعفا موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے وجہ دریافت کی تو بولے ایک دن ایک عیسائی سے کسی گفتگو میں میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ ''خدا تم کو رسوا کرے۔'' کہنے کو تو منھ سے یہ جملہ نکل گیا، لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ آخر اس لفظ کے کہنے کا مجھ کو کس قدر حق حاصل تھا۔ بہت سوچا لیکن کچھ بھی حق نہ پایا، بہ جز اس کے کہ ملازمت کی وجہ سے مجھ کو کہنا پڑا۔ نہ نوکر ہوتا نہ یہ لفظ منھ سے نکلتا اور اس کا دل دکھتا۔ آخر کار نوکری چھوڑ دی۔

یہاں تک تعصب کی تین قسمیں بیان ہوئیں۔ اب چوتھی چیز دنیا میں علمی تعصب کے نام سے مشہور ہے۔ علمی تعصب یہ ہے کہ دوسری قوموں کے علم و فضل کو ہم کیوں اختیار کریں۔ علوم و فنون سے ہمیشہ بیوقوف لوگ محروم رہتے ہیں، لیکن کیا مسلمانوں سے زیادہ کوئی قوم علمی بے تعصبی کی مثال پیش کر سکتی ہے۔

صاحبو! یہ بات محض کہنے کی نہیں ہے بلکہ واقعات موجود ہیں، اسلام کے پاس جس قدر

لٹریچر اس وقت موجود ہے، وہ تمام دنیا کے علوم وفنون کا مجموعہ ہے۔ اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے، جس کے علم کو مسلمانوں نے کمال بے تعصبی سے حاصل نہیں کیا۔ ابوریحان بیرونی نے چودہ برس اسی ہندوستان میں بیٹھ کر سنسکرت پڑھی اور ہندوستان کے حالات میں کتاب لکھی ہے (۵۴) اس نے خود لکھا ہے کہ جس فرش زمین پر بیٹھا کرتا تھا، اس کو ہندو دھلوا دیتے تھے۔ لیکن علمی شوق کے مقابلہ میں سب ذلتیں گوارا تھیں۔ اس کتاب کو جرمنی کے ایک عالم پروفیسر نے چھپوایا ہے۔ پروفیسر مذکور لکھتا ہے کہ یہ شخص سنسکرت کا ایسا ماہر تھا کہ اس سے پہلے سنسکرت کا اتنا بڑا عالم نہیں پیدا ہوا۔ ہمارے یہاں جو درسی کتابیں شامل ہیں، ان میں غیر مذہب کے عالموں اور حکیموں کا نام مثل ارسطو اور جالینوس (۵۵) کے مقابلہ میں اسی عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے، جیسے غزالی اور رازی کا، لیکن آج موجودہ حالت یہ ہے کہ چھ سو برس ہونے آئے شاعری کا سلسلہ یہاں موجود ہے۔ خسرو دہلوی (۵۶) اور فیضی نے ایرانیوں کے چھکے چھڑا دیے۔ مگر ایران والوں نے ہندوستان کو کبھی استاد نہ جانا، نہ مانا۔ لیکن ہاں کوئی نہیں دکھا سکتا کہ عربی تاریخوں میں جہاں مجوسی یا یہودی یا عیسائی فضلا کے نام آئے ہیں، وہ حقارت یا نفرت سے لیے گئے ہوں۔ یہ تھی ہماری علمی بے تعصبی۔

بغداد میں جس وقت عباسیوں کی سلطنت قائم ہوئی تو انھوں نے مجوسیوں کا لباس اختیار کیا۔ ٹوپی وہ پہنی جو مجوسی پہنتے تھے۔ غرض بادشاہ بن کر رعایا کی تقلید کرنا اس کا نام ہے بے تعصبی۔

صاحبو!

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کا وقت بہت لے لیا۔ میں نے اس تقریر کو مختصر کرنے کی کوشش کی۔ بلا اس تکلیف کے جو کہ مرثیہ خوان بیان کرتے ہیں کہ شب کو اوس میں سو گیا تھا، زکام ہو گیا۔ ریزش کی سخت تکلیف ہے۔ اس سے زیادہ سامعہ خراشی کرنی نہیں چاہتا۔ (۵۷)

اس لکچر کو بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

''مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر نے جلسہ میں کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ سے قلم بند کر لیا تھا اور بعد کو چھاپ کر شائع کیا لیکن چوں کہ تقریر ادھوری تھی اور مطالب بھی ناقص تھے، اس لئے مولانا نے اخباروں میں لکھا کہ یہ ان کی بعینہ

تقریر نہیں ہے۔''(۵۸)

علامہ شبلی نعمانی انجمن ترقی اردو کے تقریباً تین برس [جنوری۱۹۰۳ء سے غالباً دسمبر ۱۹۰۵ء] سکریٹری رہے۔ بعد ازاں مستعفی ہو گئے۔ لیکن تین برس میں انہوں نے جس دل جمعی سے انجمن ترقی کی خدمت کی وہ بے حد اہم ہے۔ ان کی گراں قدر خدمات کا اندازہ انجمن کی ان رودادوں سے لگایا جا سکتا ہے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ میں شائع ہوئی ہیں۔ نواب محسن الملک نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ۳۰؍دسمبر۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں انہوں نے کہا کہ

> ''ایک تو لٹریری سکشن ہے، جس کے سکریٹری ہمارے نامور عالم اور مشہور عالی دماغ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ہیں۔ جن کے استقلال اور توجہ اور علمی قابلیت سے انجمن ترقی اردو نہایت مستحکم بنیاد پر قائم ہوئی ہے اور جو اپنا کام نہایت عمدگی اور خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ اور جس کے عمدہ نتائج حاصل ہونے کی پوری امید ہے۔''(۵۹)

علامہ شبلی نعمانی نے انجمن ترقی اردو کے حوالہ سے جو گراں قدر علمی و ادبی خدمات انجام دیں، اب تک اس کا بھرپور جائزہ نہیں لیا جا سکا تھا۔ راقم نے علامہ شبلی کے اس کارنامے کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ عنقریب ناچیز کی کتاب ''علامہ شبلی بحیثیت مؤسس انجمن ترقی اردو'' شائع ہو گی۔ اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ علامہ شبلی نعمانی کے کارناموں میں انجمن ترقی اردو کی بنا و تاسیس بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔

تعلیقات و حواشی:

(۱) ہز ہائینس سر آغا سلطان محمد شاہ معروف بہ آغا خاں ثالث [۱۸۷۷-۱۹۵۷ء] اسماعیلی بوہرہ اور ان کے اڑتالیسویں امام تھے۔ یہ منصب انہیں اپنے والد کے انتقال کے بعد ۸؍سال کی عمر میں ملا تھا۔ ان کی والدہ ایرانی شہزادی تھیں۔ بوہرہ اسماعیلی ہونے کے باوجود مسلمانوں کے بڑے بہی خواہ تھے۔ ان کا

شمار ملک کے مدبر اور سنجیدہ اشخاص میں ہوتا تھا۔حکومت برطانیہ نے انہیں ہز ہائی نس کا خطاب دیا تھا۔ملکہ وکٹوریہ، قیصر جرمنی اورعثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔علی گڑھ آئے تو سرسید نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔۱۹۰۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس دہلی کی صدارت انہی نے کی ، جس میں علامہ شبلی کو انجمن ترقی اردو کا پہلا سکریٹری نامزد کیا گیا تھا۔

مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب،ایم اے،او،کالج علی گڑھ اوراردو زبان کے لئے جدوجہد ان کے لائق ذکر کارنامے ہیں۔علامہ شبلی سے بھی ان کے مراسم تھے۔علامہ شبلی کی خواہش پر وہ ۳رفروری ۱۹۱۰ء کوندوہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے۔مفید مشورے دئے اور ندوہ کے لئے پانچ سو روپے سالانہ کی امداد بھی منظور کی۔علامہ شبلی نعمانی نے ان کی آمد پر ندوہ میں ایک نہایت شاندار جلسہ منعقد کیا تھا، جس میں عمائدین شہر بھی شریک ہوئے تھے۔مگر ان کے ایک مضمون پر علامہ شبلی نعمانی نے اپنی شاعری میں سخت تنقید کی۔دراصل ہوا یہ کہ جنگ بلقان کے زمانہ میں سر آغا خان نے ایک مضمون لکھ کر ترکوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ یورپ چھوڑ کر ایشیا میں جا بسیں تا کہ یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں۔یہ بات مسلمانوں کو سخت ناگوار گذرنی تھی اور گذری۔چنانچہ مسلمانوں نے سخت ناگواری کا اظہار کیا۔علامہ شبلی کو بھی ان کا یہ خیال ناروا معلوم ہوا۔چنانچہ انہوں نے ایک نظم ''سر آغا خان کا خطاب ترکوں سے'' میں طنزیہ انداز میں ان کا جواب دیا۔

علامہ شبلی کی یہ نظم ان کے فارسی کلیات میں شامل ہے۔اس قطعہ کا عنوان ''خطاب سر آغا خان بترکان عثمانیہ'' ہے۔دراصل یہ علامہ شبلی کی ترکوں سے محبت اوران کی دینی حمیت کا ایک نمونہ ہے۔واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام یا مسلمانوں پر کسی قسم کی تنقید برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔

علامہ شبلی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے رکن تھے اوراس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔اس کا ایک اجلاس لاہور میں سر آغا خان کی سربراہی میں منعقد ہوا تھا،جس میں علامہ شبلی نے بھی شرکت کی تھی ۔بعد ازاں انہوں نے ''مسلم یونیورسٹی'' کے عنوان سے ایک نظم کہی۔اس میں اور باتوں کے ساتھ سر آغا خان کا بھی ذکر ہے۔لیکن محض ذکر ہی ہے، کسی مناسبت کا اظہار نہیں۔

(کلیات شبلی فارسی ص:۹۳،۹۴)

(۲) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال ص ۶۱

(۳) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال ص ۶۲

(۴) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال ص ۶۲

(۵) انجمن ترقی اردو کا قیام ۱۹۰۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں عمل میں آیا۔

(۶) حامد علی صدیقی: انجمن ترقی اردو کے جوائنٹ سکریٹری اور بڑے فعال شخص تھے۔ اس کی ترقی میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ باوجود اس کے ان کے سوانحی حالات نہیں ملے۔

(۷) علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال [۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء] جنہیں شاعر مشرق اور حکیم الامت کے خطابات سے نوازا گیا، ان کا شمار نادرہ عصر شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی عظمت، عبقریت، شاعرانہ کمالات اور مفکرانہ شاعری کا سارا زمانہ معترف ہے۔

علامہ اقبال ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ شمس العلماء مولوی میر حسن [م: ۱۹۲۹ء] سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ سیال کوٹ مشن کالج سے ۱۸۹۵ء میں ایف.اے. اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ، عربی اور انگریزی مضامین کے ساتھ بی.اے. اور پھر فلسفہ میں ایم.اے. کیا۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی کے دوست پروفیسر آرنلڈ [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے استاذ تھے۔ علامہ اقبال نے ان سے یہیں استفادہ کیا اور غالباً انہیں کے ذریعہ وہ علامہ شبلی نعمانی سے واقف ہوئے۔

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے اور کیمبرج میں داخل ہوئے۔ تین برس وہاں طالب علم رہے۔ بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ پھر جرمنی گئے۔ میونخ یونیورسٹی سے ایرانی الٰہیات پر مقالہ لکھ کر پی ایچ.ڈی. کی سند لی۔ تقریباً ۶ر ماہ لنڈن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ اس کے بعد وطن واپس آئے اور پھر پوری زندگی تدریس، وکالت اور شعر و شاعری میں گذاری۔ ان کے متعدد مجموعہ کلام شایع ہوئے۔ [۱] اسرار خودی، ۱۹۱۵ء [۲] رموز بے خودی، ۱۹۱۸ء [۳] پیام مشرق، ۱۹۲۲ء [۴] زبور عجم [۵] جاوید نامہ، ۱۹۳۳ء [۶] بال جبریل، ۱۹۳۵ء [۷] ارمغان حجاز، ۱۹۳۸ء [۸] بانگ درا ۱۹۲۴ء۔ انہیں بعد میں یکجا ''کلیات اقبال'' کے نام سے شایع کیا گیا۔

علامہ شبلی ان کے پیش رو بزرگ تھے۔اقبال نے ان کی تصنیفات سے استفادہ کیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ علامہ شبلی کے فضل وکمال کے بڑے معترف اوران کی تصنیفات بالخصوص شعرالعجم اور سیرۃ النبی وغیرہ کے بڑے قدرداں تھے۔۱۹۱۱ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جواجلاس دہلی میں منعقد ہوا تھا،اس میں علامہ شبلی نے اپنے شاگرد سید سجاد حیدر یلدرم[م:۱۹۴۳ء] کی خواہش پرشرکت کی۔اسی اجلاس میں علامہ اقبال کو'ترجمان حقیقت' کا خطاب دیا گیا۔اس موقع پرعلامہ شبلی نے اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا اور ان کے بڑے شاعر ہونے کی پیشین گوئی کی۔جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔(اقبال اور دبستان شبلی۔مطبوعہ ادبی دائرہ اعظم گڑھ)

(۸) امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد[۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] ایک جامع الصفات شخص تھے۔ایسے اشخاص مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔علم وادب،تعلیم وتربیت،علوم وفنون،تاریخ وتمدن،سیاسیات کون سا موضوع تھا جو مولانا آزاد کی دسترس سے باہر تھا۔وہ ۱۱رنومبر ۱۸۸۸ء کو مکہ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔۱۸۹۸ء میں ہندوستان آئے اورعلوم دینیہ کی تکمیل کی۔ایک صحافی کی حیثیت سے علمی زندگی کا آغاز کیا۔ان میں شروع سے حریت وآزادی کے جذبات موجزن تھے،چنانچہ سیاست میں اس قدر دلچسپی سے حصہ لیا کہ آل انڈیا کانگریس کے سب سے کم عمر صدر قرار پائے۔۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کر کے ملک میں انقلاب پیدا کیا۔وہ صاحب طرز ادیب وانشا پرداز اور شعلہ بیان خطیب تھے۔ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں سے مسلمانوں کی تعمیر وترقی اور ملک کی آزادی وسا لمیت کا کام لیا۔کئی بار قید وبند اور زنداں کی صعوبتیں اٹھائیں۔ملک آزاد ہوا تو وہ پہلے وزیر تعلیم بنائے گئے۔اس اہم عہدہ کو انہوں نے جس طرح نبھایا اور جس طرح تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی وہ ہمارے ملک کی تاریخ کا بڑا عظیم الشان باب ہے۔ثانوی اور اعلی تعلیم کے لئے کمیشن مقرر کیا۔آل انڈیا کونسل فار ٹیکنکل ایجوکیشن، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی اور ملک میں متعدد سائنسی تجربہ گاہوں کا قیام انہیں کا کارنامہ ہے۔ساہتیہ اکادمی،سنگیت ناٹک اکیڈمی اور کلا اکیڈمی وغیرہ ادبی ادارے انہیں کے قائم کئے ہوئے ہیں۔انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز انہی کی ایما پر قائم ہوئی۔غرض تعلیم وتہذیب اور ثقافت کے میدان میں انقلاب انہی کا برپا کیا ہوا ہے۔

وہ ایک بڑے مصنف تھے۔ تذکرہ، غبار خاطر، کاروان خیال اور تفسیر قرآن ان کے شاہکار ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ شبلی سے ان کے انتہائی گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے والد کے بعد سب سے زیادہ جسے عزیز رکھا اور جس کی تکریم کی وہ علامہ شبلی کی ذات گرامی ہے۔ ہندوستان کی سیاسیات میں علامہ شبلی پہلے شخص ہیں جنہوں نے تعصب اور تنگ نظری کے خلاف آواز بلند کی۔ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کانگریس کی حمایت کی۔ یہی کام مدۃ العمر مولانا آزاد نے بھی کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کو سب سے بلند آہنگ طریقہ سے علامہ شبلی نے اپنے مضمون مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ میں پیش کیا تھا۔ مولانا آزاد ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی کی خواہش پر ندوہ لکھنو آئے اور علامہ شبلی کے ساتھ قیام کیا۔ اصلاً یہیں خود مولانا آزاد کی زندگی میں انقلاب آیا، اور علامہ شبلی کے اثرات قائم ہوئے اور جوان پر آخر تک باقی رہے۔ ۲۲ رفروری ۱۹۵۸ء کو ہندوستان کا یہ درخشاں ستارہ غروب ہوا۔

(۹) مولانا ظفر علی خاں: [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] مولانا ظفر علی خاں جنوری ۱۸۷۳ء میں سیال کوٹ کے ایک گاؤں مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک پٹیالہ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۲ء میں ایف اے پاس کر کے سری نگر محکمہ ڈاک میں ملازم ہوئے لیکن افسر سے نہیں بنی۔ چنانچہ ملازمت ترک کر کے بی اے کرنے علی گڑھ کالج آ گئے۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے۔ یہاں خاص طور پر ان کا درس قرآن بہت مشہور تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ان کے درس قرآن میں شرکت کی۔ علی گڑھ میں وہ علامہ شبلی کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ (مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۳۲۸) علی گڑھ میں طلبہ کی تنظیم لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کے وہ سرگرم رکن رہے۔ تحصیل علم کے بعد وہ ریاست حیدرآباد کے دارالترجمہ میں ملازم ہوئے مگر ان کے باغیانہ خیالات کی وجہ سے انگریزوں نے نظام حیدرآباد سے کہہ کر وہاں سے نکلوا دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے والد کے اخبار زمیندار سے وابستہ ہوئے اور اسے آزادی وحریت کا نقیب بنا دیا۔ ۲۷ رنومبر ۱۹۵۶ء میں گجرانوالہ میں انتقال کیا۔

انہیں ابتدا ہی سے شعر گوئی سے بڑی دلچسپی تھی۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اپنے استاذ علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملنے پر بڑا زبردست فارسی قصیدہ

پیش کیا تھا جو حیاتِ شبلی میں درج ہے۔ وہ آخر تک اپنے استاذ کا بڑے احترام سے ذکر کرتے رہے۔

(۱۰) آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۱۹۱

(۱۱) اخبار ہندوستانی لکھنو میں یہ اعتراض شائع ہوا تھا، مگر یہ کس نے لکھا اور اس میں کون کون ہندو ادیب و شاعر شامل تھے جنہوں نے آواز بلند کی تھی، معلوم نہ ہو سکا۔

(۱۲) مشتاق حسین: مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اسسٹنٹ لائبریرین تھے۔ لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق تھا۔ چنانچہ کئی کتابیں انہوں نے سپردِ قلم کیں۔ ان میں ایک اہم کتاب باقیاتِ شبلی ہے۔

(۱۳) باقیاتِ شبلی ص ۹۵-۹۶

(۱۴) مجموعہ لکچرز و اسپیچز حصہ اول، ص ۴۸۳

(۱۵) اورنگزیب عالم گیر [۱۶۱۸-۱۷۰۷ء] مغل حکمراں شاہ جہاں [۱۵۹۲-۱۶۶۶ء] کا دوسرا بیٹا جس نے نصف صدی تک ہندوستان پر شہنشاہی کی۔ ہندوستان میں ظالم انگریز حکمرانوں نے اپنے استحکام کے لئے ہندؤں اور مسلمانوں میں منافرت پیدا کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو کوششیں کیں، اس میں ایک کوشش یہ بھی شامل تھی کہ عالمگیر نے ہندؤں پر مظالم ڈھائے اور ان کے مندر توڑے۔ چنانچہ انہوں نے تاریخ میں اس طرح کے متعدد واقعات لکھ کر عالم گیر کو نہایت ظالم و جابر ثابت کیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس کے نتیجے میں دونوں قوموں یعنی ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان شدید منافرت پیدا ہو گئی۔ علامہ شبلی کے ایک شاگرد رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] نے ان کی توجہ اس منافرت کی جانب مبذول کرائی اور خواہش ظاہر کی کہ آپ اس کا تدارک فرمائیں۔ چونکہ علامہ شبلی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی و داعی تھے۔ چنانچہ انہوں نے انگریز مورخین کی کذب بیانی اور اس کے مضمرات کو محسوس کرتے ہوئے بدلائل عالم گیر پر عائد الزامات کا رد لکھا اور نہایت اہم کتاب ''اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر'' کے نام سے لکھی۔ جسے اردو میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔

(۱۶) شہزادہ داراشکوہ [۱۶۱۵-۱۶۵۹ء] شاہ جہاں کا بڑا بیٹا جو مضافات اجمیر میں پیدا ہوا۔ ۱۶۳۳ء میں ولی عہد مقرر ہوا۔ ۱۶۵۷ء کے اواخر میں شاہ جہاں بیمار ہوا تو دارا اور عالم گیر کے درمیان تاج و تخت کی

معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔لیکن تخت سلطنت کی جنگ میں وہ عالم گیر سے شکست کھا گیااور پھر ۳۰راگست ۱۶۵۹ء کو قتل کرادیا گیا۔اس کا مزار مقبرہ ہمایوں میں ہے۔اس نے متعدد جنگوں میں حصہ لیااور متعدد کتابیں بھی لکھیں اور ترجمہ کیں۔اسے مفکر قرار دیا جاتا ہے مگر وہ ہندوؤں سادھوسنتوں سے متاثر تھا۔

(۱۷) راجہ جسونت سنگھ: جودھ پور کا راجہ تھا۔شاہ جہاں سے جنگ کی۔عالم گیر جب تخت نشیں ہوا تو دربار میں حاضر ہوکر معافی کا خواستگار ہوا۔چنانچہ عالم گیر نے معاف کر دیا۔اوراپنا سپہ سالار مقرر کیا مگر اس نے مخالف سے ساز باز کر لی۔اس طرح اس نے کئی بار دھوکہ دیااور بار بار پالا بدلہ۔آخری باردارا سے جنگ میں بھی یہ عالم گیر کا ساتھ چھوڑ کر داراشکوہ کے ساتھ جاملا تھا۔عالم گیر نے اسے کئی بار معاف کیا۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علامہ شبلی کی کتاب اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر ص ۴۸-۵۰)

(۱۸) حضرت لوط علیہ السلام: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔''اور'' عراق میں پیدا ہوئے۔ان کے والد حاران کے انتقال کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی پرورش کی۔سفر مصر سے واپسی پر انہیں نبوت ملی۔انہیں جس قوم کا نبی بنایا گیا تھا وہ غیر فطری افعال اور ڈاکہ زنی میں مبتلا تھی۔انہوں نے اپنی قوم کو بہت سمجھایا کہ ان افعال سے باز آجاؤ،مگر وہ نہ مانی۔ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔انہیں شہر سے نکلنے کو کہا گیا۔زمین اونچی کر دی گئی اور آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی۔اور یہ برباد ہوگئے۔ان کی بستی مشہور تجارتی شاہراہ جو حجاز سے شام کو جاتی ہے اس پر واقع ہے۔

(۱۹) حضرت شیث علیہ السلام،حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ہابیل کے قتل کے بعد پیدا ہوئے۔اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۱۳۰ربرس تھی۔انہوں نے ۹رسو بارہ سال کی عمر پائی۔پہلا صحیفہ انہیں پر نازل ہوا۔تمام انبیاء کا سلسلہ نسب انہیں سے ملتا ہے۔

(۲۰) حضرت داؤد علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھے۔یہ اپنے بھائی اور بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔حضرت شموئیل کو ان کی ضعیف العمری میں ان کی نبوت کی بشارت دی گئی اور ان سے ملنے کو کہا گیا۔آپ طالوت کے دربار سے وابستہ تھے۔جالوت جو بنو اسرائیل کو للکارتا تھا اس سے مقابلہ ہوااور آپ نے اسے ڈھیر کر دیا۔اس واقعہ کے بعد طالوت نے اپنی بیٹی سے عقد کر دیااور بنی اسرائیل نے ۱۰۰۴ق م میں آپ کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔اس وقت آپ کی عمر ۳۰رسال

تھی۔قرآن نے آپ کوخلیفہ فی الارض کے لقب سے نوازا ہے۔آپ کی حکومت انسان کے ساتھ جنات اور پرندوں پر بھی تھی۔آپ چیونٹیوں کی زبان بھی سمجھتے تھے۔اور جنات آپ کے کام کیا کرتے تھے۔آپ نے ساڑھے سات سال کی شب وروز کی محنت سے ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی تعمیر کرائی۔اس کی دیواروں پر سونے اور چاندی کی پرت چڑھی ہوئی تھی۔تورات کے مطابق تقریباً سات سومن سونا اس پر صرف ہوا۔اس کی تعمیر کا زمانہ ۸۶۰ ق م سے ۹۵۳ ق م ہے۔۴۱ رسال حکومت کے بعد آپ نے ۹۲۴ ق م میں وفات پائی۔

(۲۱) حافظ ابن قیم [۱۲۹۳-۱۳۵۰ء] دمشق میں پیدا ہوئے حافظ ابن قیمؒ دمشق کے مدرسہ الجوزیہ کے قیم تھے اسی بنا پر انہیں ابن قیم الجوزیہ کہا جانے لگا۔متعدد علوم میں معاصر شیوخ سے تحصیل علم کیا۔علامہ ابن تیمیہؒ جب مصر سے واپس آئے تو یہ ان کی خدمت میں اخیر تک رہے۔یہی سبب ہے کہ ان پر ابن تیمیہ کا رنگ غالب آ گیا اور وہ ان کے جانشین قرار پائے۔ابن تیمیہ کی وفات کے بعد ان کی کتابوں کی ترتیب وتہذیب کے ساتھ اشاعت انہی بدولت انجام پائی۔جن مسائل میں امام ابن تیمیہ کی رائے جمہور سے مختلف تھی اس میں یہ بھی ان کے ہم نوا تھے۔اس بنا پر کئی بار تنازعہ ہوا۔اور انہیں محبوس ہونا پڑا۔علامہ ابن تیمیہ کی آخری قید جس میں انہوں نے وفات پائی یہ بھی ان کے ساتھ قید تھے۔علامہ ابن تیمیہ کا تعارف اولاً علامہ شبلی نے اردوداں حلقہ میں کرایا۔ابن تیمیہ کی وفات کے بعد بھی انہیں اپنے نظریات کی وجہ سے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ان کی بھی طویل داستان حیات ہے۔ ۱۶ راگست ۱۳۵۰ء کو دمشق میں وفات پائی۔انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ دائرۃ المعارف میں ان کا مفصل تذکرہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲۲) تاریخ اسلام کی انتہائی اہم اور برگزیدہ شخصیت، خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ [۵۷۳-۶۳۴ء]، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی اور سچے جاں نثاروں میں تھے۔ام المومنین حضرت عائشہؓ آپ ہی کی صاحبزادی تھیں۔یہ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ہجرت مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سفر حضرت ابوبکرؓ ہی رہے۔غار کے ساتھی بھی یہی تھے۔متعدد جنگوں میں حصہ لیا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ ان کے جانشین اور مسلمانوں کے خلیفہ اول منتخب ہوئے۔

دوسال تین ماہ اور نو دن اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ محض دو سال کی مدت میں مسیلمہ کذاب سے جہاد کیا اور یہی نہیں سب سے پہلے انہیں نے اسلام کے چراغ کو دائرہ عرب سے باہر روشن کیا۔

علامہ شبلی کی ایک نظم "ہجرت نبویؐ" ہے۔ ظاہر ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ ہجرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ چونکہ غار ثور میں ایک ساتھ تھے، اس لئے یار غار کہلائے۔ یار غار کی مثال بھی غالباً اسی واقعہ سے شروع ہوئی۔ اس نظم یعنی ہجرت نبوی میں ان کا ذکر آنا لازم تھا۔ ورنہ نظم ادھوری رہتی۔

اک فقط حضرت بوبکرؓ تھے ہمراہ رکاب
ان کی اخلاص شعاری تھی جو منظور نظر

رات بھر چلتے تھے دن کو کہیں چھپ رہتے تھے
کہ کہیں دیکھ نہ پائے کوئی آمادۂ شر

(۲۳) خلیفہ سوم، ذوالنورین حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ [۵۷۶-۶۵۶ء] خلفائے راشدین میں سے ہیں۔ ان کی شخصیت تاریخ اسلام کی نہایت روشن جبیں ہے۔ یہی وہ جاں نثار رسولؐ ہیں جو ہر سرد و گرم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سائے کی طرح موجود رہے۔ اور ہر موقع پر بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں جن کی بدولت آج ہم اسلام کی دولت سے سرفراز ہیں۔

علامہ شبلی کی شاعری میں جہاں خلفائے راشدین کا ذکر آیا ہے، وہاں بالعموم ذوالنورین یعنی حضرت عثمانؓ کا بھی نام آیا ہے۔ حضرت عثمانؓ کو ذوالنورین اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دولخت جگر حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم یکے بعد دیگرے زوجیت میں آئیں۔

(۲۴) خلیفہ دوم حضرت عمرؓ فاروق اعظم [۵۸۴-۶۴۴ء] کا ذکر مبارک علامہ شبلی کی شاعری میں بہ کثرت آیا ہے، بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کے بعد سب سے زیادہ انہیں کا ذکر و اذکار خیر ان کی شاعری کا حصہ ہے۔ کہیں فاروق، کہیں فاروق اعظم، کہیں عمرؓ اور کہیں عمر ابن خطاب وغیرہ نام علامہ شبلی نے اپنے اشعار میں باندھے ہیں۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے ذہن، دل و دماغ اور وجدان پر فاروق اعظمؓ کے کوکبہ جلال کے اثرات ہمیشہ اور ہمہ وقت نقش رہے۔ یہاں یہ بات

بھی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ شاعری میں فاروق اعظمؓ کا ذکر لاکھ عمدہ سہی اور بار بار سہی، مگر ''الفاروق'' کی خوب صورت، پاکیزہ اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی نثر کا آج بھی کوئی جواب نہیں۔

حضرت عمرؓ بن خطاب ہجرت سے چالیس برس پہلے پیدا ہوئے۔ بعثت نبویؐ کے چھٹے سال مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مختلف النوع کمالات کے جامع تھے۔ عہد نبویؐ میں کئی بار اسلامی فوج کے سپہ سالار رہے۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ انہیں کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ فاروق اعظمؓ کی کشور کشائی سارے عالم میں مشہور ہے۔ تمام بڑے اہل قلم اور سیاسیات پر گہری نظر رکھنے والوں نے ان کے طرز حکومت کو سراہا ہے۔ فلسفہ عدم تشدد کے خالق گاندھی جی [۱۸۶۹-۱۹۴۸ء] نے بھی حضرت عمر فاروقؓ کی حکمرانی کو نمونہ قرار دیا ہے۔

علامہ شبلی کی ایک بہت مشہور نظم ہے ''خلافت فاروقی کا ایک واقعہ''۔ اس میں ان کے عہد خلافت میں پیش آنے والے ایک واقعہ کو نظم کیا گیا ہے۔ ایک شب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گشت پر نکلے۔ تو انہیں ایک گھر سے رونے کی آواز سنائی دی۔ جا کر دیکھا تو ایک خاتون دیگچی چولہے پر چڑھا کر بیٹھی ہیں اور ان کے بچے رو رہے ہیں۔ خاتون سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بچے بھوکے ہیں اور گھر میں کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ انہیں بہلانے کے لئے چولہے پر پانی چڑھا رکھا ہے۔ پھر کیا ہوا:

بے اختیار رونے لگے حضرت عمرؓ
بولے کہ یہ میرے ہی کئے کا وبال تھا

پھر خلیفہ وقت کھانے کا سامان لایا۔ خود چولہا پھونک کر کھانا تیار کیا اور جب بھوکے بچوں نے کھانا کھا لیا تب اطمینان کا سانس لیا۔ اس خاتون نے جس کو یہ معلوم نہ تھا کہ خلیفہ وقت اس کے پاس موجود ہے اور اسی نے کھانا تیار کر کے بچوں کو کھلایا ہے، فرمایا:

عہدہ عمرؓ کو یہ جو ملا تجھ سے چھین کر
جو کچھ گذر رہا ہے یہ اسی کا وبال تھا

پھر بھی فاروق اعظمؓ نے یہ نہیں بتایا کہ میں ہی خلیفہ ہوں۔ یہی سبب ہے کہ فاروق اعظمؓ کے کوکبہ جلال سے کسی کو سیری نہیں ہوتی۔

(۲۵) خلیفہ چہارم حضرت علیؓ[۶۰۱-۶۶۱ء] کرم اللہ وجہہ تاریخ اسلام کے ان برگزیدہ لوگوں میں سے ہیں، جن سے اسلام کی عظمت وتوقیر قائم ہے۔اوران کی ذات آج بھی نہ صرف شجاعت و بہادری کا اعلیٰ نمونہ ہے، بلکہ زہدوورع اورتقوی وطہارت و پاکیزگی میں بھی عدیم النظیر ہے۔متعدد جنگوں میں شریک رہےاور بڑی بہادری اوراولوالعزمی سے دادشجاعت دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔کم سنوں میں سب سے پہلے ایمان یہی لائے۔شجاعت، دلیری اور بہادری اوراعلی حوصلگی کاایک نمونہ تھے۔شیر خدااورحیدر کرار کے لقب سے بھی پکارے جاتے ہیں۔علم وفہم،سنجیدگی،متانت اورتدبر وتفکر میں بھی اعلیٰ اور بےنظیر تھے۔تاریخ اسلام کے مشہورمعرکوں میں شریک رہے اور مثالی دادشجاعت دی۔جس سے تاریخ اسلام کے صفحات روشن ہیں۔ایک نالائق اور بدبخت ابن ملجم نے مسجد میں نماز فجر کے وقت آپ پرحملہ کر کے شدید زخمی کر دیا۔یہی زخم شہادت کا باعث ہوا۔علامہ شبلی کی زندگی کی آخری نظم ''اہل بیت رسولؐ کی زندگی'' ہے،جس کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

ان حالات میں اطلاع ملی کہ رسول پاکؐ کے پاس کچھ غلام آئے ہیں۔ایک غلام کے لئے حضرت فاطمہ زہراؓ دربار رسالت میں حاضر ہوئیں،مگر وہاں بہت سے لوگ تھے اس لئے اپنی بات نبی پاکؐ سے نہ کہہ سکیں اورلوٹ آئیں۔دوسرے دن گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل آنے کا سبب پوچھا تو کچھ کہہ نہ سکیں۔حضرت علیؓ نے بات مکمل کی:

غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں
حیدر نے ان کے منہ سے کہا جو پیام تھا

(۲۶) ولید بن عبدالملک[۶۶۸-۷۱۵ء]اموی حکمراں جس نے ۹/اکتوبر۷۰۵ء سے ۲۳/فروری

۱۵ ۷ء تک حکومت کی۔ اس نے اسلامی حکومت کی سرحد بہت وسیع کی۔ حجاج بن یوسف، طارق بن زیاد اور قتیبہ بن مسلم اس کے نامور سپہ سالار تھے۔ اندلس، سندھ اور وسط ایشیا کے علاقے اسی کے عہد حکمرانی میں فتح ہوئے۔ چین پر بھی ان کے عہد میں حملہ آور ہوا اور خراج پر صلح ہوئی۔ ۲۳ رفروی ۱۵ ۷ء کو دمشق میں وفات پائی۔

(۲۷) حضرت عمر بن عبدالعزیز: خلیفہ راشد و عادل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ [۶۸۲-۷۲۰ء] ۷۱۷ء سے ۷۲۰ء تک مسند خلافت پر متمکن رہے اور اپنے عدل وانصاف، رعایا پروری اور عدل گستری سے دور خلافت راشدہ کی دلوں میں اس طرح یاد تازہ کر دی تھی کہ گویا پچھلا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر تاریخ اسلام میں نہایت تقدس اور ادب و احترام سے کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نے ان کے عدل و انصاف پر ایک مستقل نظم ''خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا انصاف'' کہی ہے۔ پوری نظم تاثیر و تاثر میں ڈوبی ہوئی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا آخری شعر سن کر آپ سمجھ جائیں گے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عدل وانصاف کیسا تھا اور علامہ شبلی نے کیوں کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

بے کسوں کو میں ستاؤں کیوں کر
مجھ کو دینا ہے قیامت میں جواب

جس شخص کے پیش نظر یہ حسن خیال ہو وہی عدل وانصاف کا دربار سجا سکتا ہے۔

نامور ادیب وانشاپرداز اور مصنف ومحقق مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳-۱۹۵۸ء] نے ان کی بڑی معرکہ آرا سوانح عمری ''سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ'' کے نام سے لکھی ہے۔ جو دارالمصنّفین اعظم گڑھ اور ہندو پاک کے دوسرے مکتبات سے شائع ہوتی رہتی ہے۔

(۲۸) بشپ پونیکٹس: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۲۹) اسکندریہ: مصر کا ایک قدیم شہر جو بطلیموسیوں سے بھی پہلے کا آباد ہے۔ کتب خانہ اسکندریہ یہیں قائم تھا جسے عیسائیوں نے جلا کر خاک کر دیا۔

(۳۰) مشہور پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو حضرت مریم کے بیٹے تھے اور جنہیں عیسائی اپنا نبی مانتے ہیں، لیکن ان کی زندگی میں ان کی ایک نہ مانی۔ حتیٰ کہ ان کی لائی ہوئی کتاب میں تحریف بھی کر ڈالی

اور صلیب بھی دی۔

مسلمان انہیں اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں میں ایک نبی تسلیم کرتے ہیں۔ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا میں ابھی ایک بار پھر ان کا ظہور ہوگا۔اس کے بعد ہی دنیا کا خاتمہ ہوگا اور قیامت آئے گی۔علامہ شبلی کے کئی اشعار میں ان کا ذکر آیا ہے۔کہیں عیسیٰ اور کہیں مسیح کے نام سے۔ان کا معجزہ مسیحائی تھا۔چنانچہ ان کی مسیحائی کا ذکر بھی ہماری شاعری کا ایک بڑا اہم حصہ ہے۔بہت سے شعرا نے ان کی مسیحائی کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔علامہ شبلی نے بھی ایک جگہ اسی حیثیت کو اجاگر کیا ہے:

بسکہ رنجوری ایں خستہ زتیمار گذشت
عیسیٰ آخر ز علاج دل بیمار گذشت

قرآن مجید میں ان کا کثرت سے ذکر ہے۔مذکورہ بالا باتیں دراصل قرآن مجید ہی سے ماخوذ ہیں۔

(۳۱) حضرت عمرو بن عاصؓ [۵۷۵م:۴۲ھ] پورا نام یہ ہے: ابوعبداللہ عمر بن عاص بن وائل بن ہاشم۔انہوں نے اسلام کو مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، مگر اللہ نے توفیق دی اور انہوں نے نجاشی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔اور وہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر کلمہ پڑھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سریہ ذات السلاسل پر معمور کیا اور سفید علم بھی دیا۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی معرکوں میں حصہ لیا۔اور فتح یاب ہوئے۔ان کی سب سے بڑی فتح مصر کی فتح ہے۔سنہ ۴۲ ہجری میں وفات پائی۔

(۳۲) نعمان: بادشاہِ عرب

(۳۳) نوشیرواں [۴۹۶-۵۷۹ء] خاندان ساسان کا سب سے نامور بادشاہ گذرا ہے جو عدل و انصاف میں بے نظیر تھا اس کے لئے اس کی عالم گیر شہرت تھی۔یہاں تک کہ عادل اس کے نام کا جزو لاینفک ہوگیا، فارس کے بادشاہ قیقباد کا بیٹا تھا۔۵۳۱ء میں تخت نشیں ہوا۔مدائن اس کا دارالحکومت تھا۔روم کے بادشاہ کو اسی نے شکست دی تھی۔اس کا دور ایک سنہرا دور خیال کیا جاتا ہے۔طویل دور حکومت کے بعد ۵۷۹ء میں فوت ہوا۔

(۳۴) بدر ایک گاؤں کا نام ہے۔تاریخ اسلام کا پہلا غزوہ یہیں ہوا تھا۔جس میں ۳۱۳ صحابہ کرامؓ جس میں بچے اور ضعیف بھی شامل تھے، انہوں نے ایک ہزار کفار جو اسلحوں سے لیس تھے، ان کو شکست فاش دی۔اس غزوہ میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریک تھے۔(دیکھیں سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۲۲۵ تا ۲۵۸)

(۳۵) ابوالولید عتبہ ابن ربیعہ [۵۶۷-۶۲۴ء] کفار مکہ کا ایک سردار تھا جو جنگ بدر میں حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔علامہ شبلی نے نظم ''مساوات اسلام'' میں اس کا ذکر یوں کیا ہے کہ جب یہ جنگ کے لئے میدان میں آیا اور مسلمانوں کی طرف سے تین جاں باز میدان میں آئے تو اس نے سب سے پہلے نام ونسب دریافت کیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ ان کا تعلق انصار سے ہے لڑنے سے منع کر دیا۔پھر حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ میدان میں نکلے، جو حسب نسب میں اس کے مساوی تھے۔تب وہ معرکہ آرائی کے لئے تیار ہوا۔اسی طرح حضرت بلال حبشیؓ نے جب تزویج کا ارادہ کیا تو مدینہ منورہ میں کسی ایک شخص نے بھی انکار نہیں کیا۔یہ واقعات نظم کر کے علامہ شبلی مسلمانوں کو مساوات اسلامی کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا چاہتے ہیں۔

ان دونوں واقعات کو منظوم کرنے کے بعد ایک شعر میں مساوات اسلامی کے بارہ میں فرماتے ہیں:

یا یہ حالت تھی کہ تلوار بھی تھی طالب کفو
یا مساوات کا اسلام کے پھیلایہ اثر

(۳۶) ولید: کفار مکہ کا ایک سردار جو جنگ بدر میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔

(۳۷) شیبہ: یہ بھی کفار مکہ کا ایک سردار تھا اور جنگ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کا شکار ہوا۔

(۳۸) سیدالشہداء حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب [۵۷۰-۶۲۵ء] حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور جلیل القدر صحابیؓ تھے۔جنگ احد میں شہادت پائی۔انہیں درندہ وحشی بن حرب نے شہید کیا۔ہند ابوسفیانؓ کی بیوی نے وحشی کو ان کے قتل پر مامور کیا تھا۔اور جب کفار کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے حضرت حمزہؓ شہید ہو گئے تو ہند سخت جان نے ان کا کلیجہ نکال کر کچا چبایا اور ان کی لاش کا مثلہ کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو بے حد رنجیدہ ہوئے۔اور رنجیدہ کیوں نہ ہوتے۔حضرت حمزہؓ صرف آپؐ کے چچا ہی نہ تھے بلکہ جاں نثاران اسلام کی صف اول میں شامل تھے۔انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اس وقت دیا جب کسی چچا نے نہیں دیا تھا اور حضرت حمزہؓ نے تو آپ پر اپنی جان ہی نچھاور

کر دی۔ ہائے اسلام اور مسلمانوں نے کیسے کیسے دن دیکھے۔ اور اسلاف نے کیسی کیسی اذیتیں اور تکلیفیں اٹھائیں اور صبر واستقلال کا کیسا مظاہرہ کیا۔

علامہ شبلی نے اپنی ایک نظم ''مساوات اسلام'' میں حضرت حمزہؓ کا ذکر کیا ہے۔ عتبہ بن ربیعہ جب میدان میں آتا ہے اور اس کے مقابلہ کے لئے حضرت حمزہؓ میدان میں آتے ہیں اور پھر جنگ ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نے اس کی بڑی عمدہ منظر کشی کی ہے۔ (کلیات شبلی اردو ص:۹۱)

(۳۹) حضرت عبیدہؓ بن الجراحؓ [۵۸۱ء-۱۸ھ] جلیل القدر صحابی رسول ہیں جو عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو امین الامت کا لقب عطا کیا تھا۔ یہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ خندق بنی قریظہ کی جنگ اور حنین میں آپ صلی اللہ علیہ کے ساتھ رہے۔ سپہ سالار بھی رہے اور متعدد شہروں اور قلعوں کو فتح کیا۔ سنہ ۱۸ھ میں طاعون کی وبا پھیلی، جس میں تقریباً پچیس ہزار آدمی مر گئے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح بھی اسی وبا کی نذر ہوئے۔ موضع بیسان میں سپرد خاک ہوئے۔

(۴۰) قریش: عرب کا مشہور قبیلہ جسے آپ صلی اللہ وسلم کی ذات گرامی سے نسبت ہے۔ بنو ہاشم اسی قبیلہ کی ایک شاخ تھے۔

(۴۱) حضرت بلالؓ بن ابی رباح [م:۲۰ھ] کا تاریخ اسلام میں بہت اعلیٰ وارفع اور بلند مقام ومرتبہ ہے۔ وہ صحابی رسولؐ اور مسجد نبویؐ کے موذن تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی مثالی محبت حب رسولؐ کا ایک استعارہ بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ ان کا بہت ادب، احترام اور اکرام کرتے تھے۔ وہ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بڑی سخت اذیتیں دیا کرتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے انہیں آزاد کرایا۔

(۴۲) سہیلؓ: صحابی رسولؐ۔

(۴۳) دیلمی: ایک مشہور خاندان کی طرف نسبت ہے۔ جن کی حکمرانی مثالی تھی۔

(۴۴) سلجوقی: سلجوق سلطنت کی طرف اشارہ ہے جو ۱۰۳۷ء سے لے کر ۱۱۹۴ء تک قائم رہی۔ اس کا دائرہ مشرق وسطی اور وسط ایشیا تک پھیلا ہوا تھا۔ اور جو مسلمانوں کی بہت مضبوط حکومت تھی۔ سلجوق حکمراں اوغوز ترک تھے۔ دولت عباسیہ کے خاتمے کے بعد قائم ہونے والی سلاجقہ کی یہ سلطنت عالم اسلام

کو یکجا کرنے کی شاید آخری کوشش تھی۔ اس کی سرحد چین سے لے کر بحیرۂ متوسط اور عدن سے لے کر خوارزم و بخارا تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی تاریخ اسلام کا ایک عہد زریں تھا۔ سلاجقہ کے زوال اور مسلمانوں کے انتشار کے بعد عیسائیوں نے بیت المقدس پر پھر سے قبضہ کرلیا۔

(۴۵) یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی [۹۷۱-۱۰۳۰ء] سلطنت غزنویہ کے بانی ابو منصور سبکتگین [م: ۵ راگست ۹۹۷ء] کا دوسرا بیٹا تھا۔ ۹۹۷ء میں ابومنصور سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا اسمعیل غزنوی ستمبر ۹۹۷ء میں تخت نشیں ہوا، لیکن محض سات ماہ بعد فروری ۹۹۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے اسے شکست دے کر عنان حکومت سنبھالی اور پے بہ پے معرکے سر کرتا ہوا غزنی سلطنت کے حدود بڑھاتا چلا گیا بلکہ اس قدر وسعت دی کہ بغداد کی سلطنت سے بھی زیادہ وسیع کر دیا۔

وہ بہادر، شجاع اور اولوالعزم ہونے کے ساتھ صاحب علم وفضل بھی تھا۔ شعر وسخن سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ صرف صاحب سیف ہی نہ تھا علم دوست اور ادب نواز اور ارباب کمال کا قدرداں بھی تھا۔ البیرونی اور سعدی جیسے ارباب کمال اسی کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس نے اپنے دائرہ حکومت میں وسعت کے لئے ہندوستان پر سترہ بار حملہ کیا۔ ایاز اسی کا غلام تھا، جس کو بڑی شہرت ملی۔ علامہ اقبال کے اس شعر نے تو محمود وایاز کو شہرت عام دیدی۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

(۴۶) عرفی [۹۶۴-۹۹۹ء] مشہور فارسی شاعر جس کا نام خواجہ صیدی جمال الدین ہے اور تخلص عرفی۔ شیراز میں پیدا ہوا۔ وہیں تحصیل علم کیا۔ صفوی دربار میں عدم قدردانی کی بنا پر ۹۹۴ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ اکبر کا دور حکومت تھا۔ کچھ دن ملاقتی وظہوری کی صحبت میں رہ کر دربار اکبری میں حاضر ہوا۔ ہندوستانی اور درباری شعرا نے اگرچہ قدر کی تاہم اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور ۳۵ رسال کی عمر میں لاہور میں اس نے وفات پائی۔ مقبرہ میر حبیب اللہ میں تدفین ہوئی۔ لیکن تیس سال بعد میر صابر اصفہانی نے اس کی لاش نجف اشرف بھیج دی۔ اس کی میت کے ساتھ جو بھی ہوا ہو مگر اس کی شاعری کی قدردانی میں کمی نہیں ہوئی۔ غزل، قصیدہ مثنوی اور دیگر اصناف میں عرفی نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی شیریں وخسرو اور مثنوی مخزن

اسرار کے اس نے جواب لکھے ہیں۔علامہ اقبال عرفی کی خودداری، ہنگامہ خیزی اور تلخ نوائی کے مداح ہیں۔عرفی نے نثر میں ایک رسالہ نفسیہ بھی لکھا ہے۔شعرالعجم میں علامہ شبلی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(۴۷) فیضی:[م:۱۵۹۵ء]ابوالفیض فیضی بن شیخ مبارک ناگوری ۹۵۴ھ میں آگرہ میں پیدا ہوا۔شیخ ابوالفضل جو عہد اکبری کا مورخ ہے، اس کا چھوٹا بھائی تھا۔فیضی کو شعروادب میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ چنانچہ جلد ہی اکبر کے دربار میں ملک الشعراء ہوگیا۔غزل اور قصیدہ دونوں میں زبردست مہارت حاصل تھی۔۱۰۰۴ھ میں وفات پائی۔علامہ شبلی نے شعرالعجم میں اس کا تذکرہ اور اس کی شاعری پر مفصل ریویو کیا ہے جو علاحدہ بھی رسالہ کی صورت میں بار بار شائع ہوا ہے۔

(۴۸) میرانیس[۱۸۰۳-۱۸۷۴ء] بے نظیر مرثیہ گو شاعر تھے۔گلاب باڑی فیض آباد میں پیدا ہوئے، مولوی حیدر علی اور مفتی حیدر عباس سے عربی و فارسی پڑھی۔شعر میں اپنے والد میر مستحسن سے اصلاح لی۔ ان کے دادا بھی میر غلام حسین حسن بھی شاعر تھے۔گویا شاعری ان کے گھر میں تین نسلوں سے تھی۔ان کے مراثی پانچ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں بعد میں جو مراثی دریافت ہوئے انہیں علاحدہ مرتب کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری فطری شاعری کا ایک نمونہ ہے مگر اسے کسی نے پہچانا نہیں۔سب سے اول ان کی شاعری کی داد علامہ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر دی۔۱۸۷۴ء میں لکھنو میں انتقال ہوا۔محلّہ سبزی منڈی میں دفن ہوئے۔(تفصیل کے لئے دیکھیں موازنہ انیس و دبیر مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ)

(۴۹) مرزا سلامت علی دبیر:[۱۸۰۳-۱۸۷۵ء] بھی ایک بڑے مرثیہ گو تھے۔۲۹/اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔بچپن میں والد کے ساتھ لکھنو آئے۔رواج کے مطابق عربی و فارسی میں دستگاہ حاصل کی۔مظفر حسین ضمیر سے شرف تلمذ حاصل کیا۔میرانیس فیض آباد سے لکھنو آئے تو دونوں میں دوستی ہوگئی۔ اور عرصہ تک دونوں لکھنو سے باہر نہ گئے۔ان کے مراثی کی بھی کئی جلدیں نول کشور لکھنو نے شائع کی ہیں۔ انیس و دبیر میں معرکہ آرائی بھی رہی۔دونوں ہم عصر بھی ہیں۔اور دونوں کمال کے مرثیہ گو ہیں۔اردو شاعری میں ان کا جواب نہیں۔۶/مارچ ۱۸۷۵ء کو لکھنو میں انتقال ہوا۔

(۵۰) جناب امیر علیہ السلام سے مراد نواسہ رسولؐ، سیدالشہداء حضرت حسینؓ[۶۲۶-۶۸۰ء] ہیں۔ جن کی شہادت تاریخ اسلام کا سب سے بڑا غم انگیز اور دلدوز حادثہ ہے۔علامہ شبلی نعمانی نے سانحہ مسجد کان

پور پر جونظمیں یا قطعات کہے ہیں اور جن سے ملک میں رجز اور ماتم کی ایک فضا چھا گئی تھی۔ان میں ایک قطعہ کا عنوان ''علمائے زندانی'' ہے۔اس کا ایک شعر یہ بھی ہے کہ

پنہائی جارہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے

(۵۱) ایک حدیث

(۵۲) حضرت عمر بن سعدؓ [۶۲۰-۶۸۰ء] ایک مشہور صحابی ہیں۔حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے صاحبزادے ہیں۔مختار ثقفی نے انہیں شہید کیا۔

(۵۳) حمص: شام کا ایک مشہور شہر اور اس کا دارالحکومت ہے۔اسے حضرت عمرؓ نے فتح کیا تھا۔

(۵۴) کتاب الہند: ابوریحان بیرونی کی مشہور کتاب جس میں قدیم ہندوستان کی تاریخ، رسم ورواج، مذہبی روایات قلم بند کی گئی ہیں۔قدیم ہندوستان کی تاریخ کا یہ واحد ماخذ قرار دی جاتی ہے۔

(۵۵) حکیم جالینوس [۱۳۰-۱۹۹ء] دنیا کے بڑے حکیموں میں سے ایک جالینوس بھی ہے۔بلکہ واقعہ ہے کہ اپنے میدان یعنی طب میں اس کا کوئی جواب نہیں۔یہ ایشیائے کوچک کے صوبہ روفی کے دارالخلافت گامون میں پیدا ہوا۔اس کے والد نے ریاضی، فلسفہ اور طبعی علوم کے ماہرین سے تعلیم دلوائی۔چنانچہ ان علوم میں اس نے بڑی مہارت وصلاحیت حاصل کی۔بعد میں اس نے علم الحیات، طب اور علم الابدان پڑھا۔اور اس میں اس قدر مہارت وحذاقت پیدا کی کہ اس کے عہد میں اس کا کوئی ثانی نہ رہا۔اپنے وطن میں تو وہ سرکاری طبیب رہا ہی روما گیا تو وہاں بھی سرکاری طبیب مقرر ہوا۔بادشاہ کی لاعلاج بیوی کا علاج کیا تو اس نے ایک تجربہ گاہ کے قیام کی منظوری دی، جس میں جالینوس نے بہت سے تجربے کئے جو انسان کے علاج کے لئے بے حد مفید اور بہتر ثابت ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ اس نے چارسو کتابیں اپنے طبی تجربات ومشاہدات پر مبنی قلم بند کی تھیں۔آتش زنی کے واقعہ میں وہ تباہ ہوگئیں۔تاہم بہت سی کتابیں جو بچ گئی تھیں اس سے بھی طب کی دنیا میں انقلاب پیدا ہوا۔۱۹۹ء میں اپنے وطن گاموں میں انتقال کیا۔

(۵۶) امیر خسرو دہلوی [۱۲۵۳-۱۳۲۵ء] ہندوی کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔وہ کئی زبانوں پر

دسترس رکھتے تھے۔کئی سلاطین کے دربار سے وابستہ رہے۔متعدد کتابیں سپرد قلم کیں۔ان کے کئی دیوان شائع ہوئے۔ان کی تصنیفات میں غرۃ الکمال،نہایۃ الکمال،قران السعدین،خزائن الفتوح،تغلق نامہ، پنج گنج وغیرہ بہت مشہور ہیں۔حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید خاص تھے۔سلطان غیاث الدین تغلق انہیں اپنے بہت قریب رکھتا تھا۔۱۳۲۵ء میں وفات پائی۔ان کا مزار حضرت نظام الدین میں نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب ہے۔علامہ شبلی نے شعرالعجم حصہ دوم میں ان کے کلام پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔

(۵۷) بحوالہ خطبات شبلی ص۶۲-۸۲

(۵۸) حیات شبلی ص۲۱۱-۲۱۲

(۵۹) مجموعہ لکچرز واسپیچز ،حصہ اول ص۵۰۰

○○○

سترہواں اجلاس ۔ بمبئی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سترہواں اجلاس ۱۹۰۳ء میں بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت جسٹس بدرالدین طیب جی [۱۸۴۴-۱۹۳۹ء] (۱) جج ہائی کورٹ بمبئی نے کی ۔ جو بڑے ذی علم، ماہر قانون داں اور بڑے بااثر شخص تھے۔ علاوہ ازیں قاضی کبیرالدین بیرسٹرایٹ لا [م: جولائی ۱۹۴۰ء] (۲) دوسری بڑی اہم شخصیت نے اس اجلاس کا اعلان ۱۹۰۲ء کے اجلاس دہلی ہی میں کر دیا تھا۔ اس لئے بمبئی کے تمام لوگوں کو اطلاع ہو چکی تھی ۔ یہی سبب تھا کہ اس اجلاس میں عوام کے سوا کثرت سے اہل علم اور بااثر شخصیات شریک ہوئیں۔ گورنر بمبئی لارڈ ہیرس نے بھی شرکت کی اور خطاب کیا۔

سرآغا خان، نواب محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی (۳) نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اپنے لکچر، خطبات اور مواعظ سے ایک الگ ہی فضا قائم کر دی۔ حسب معمول شرکاء کی طرف سے متعدد اہم تعلیمی قراردادیں پیش ہوئیں اور منظور کی گئیں ۔ انجمن اسلام کے بڑے ہال میں ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں نقشے، تصویریں، گلوب اور آلات نقشہ وغیرہ کو نہایت سلیقہ سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس کی طرف شرکاء کی خاص توجہ رہی۔ گورنر لارڈ ہیرس نے بھی اپنی تقریر میں اس کا ذکر کیا۔ (۴)

لکچر: اسلام میں علم اور دولت

علامہ شبلی نعمانی اس اجلاس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ایک اجلاس میں ''اسلام میں

علم اور دولت''موضوع پر خطاب بھی کیا۔مگر ان کا یہ خطبہ اس سال کی کانفرنس کی رپورٹ میں شائع نہیں ہوا ہے۔مرتب نے لکھا ہے کہ

''جب رزولیوشن نمبر۱۲پاس ہو چکا تو شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی اسٹیج پر تشریف لائے۔آپ کے ہاتھ میں حسب معمول جیسا کہ پہلے اجلاسوں میں آپ کا قاعدہ رہا ہے کہ ایک سادہ کارڈ ایک پیسہ والا ہوتا ہے اور اس پر نوٹ لکھے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح بمبئی کے اجلاس کانفرنس میں آپ کے ہاتھ میں ایک سادہ کارڈ تھا،جس کو آپ کبھی کبھی ملاحظہ فرما لیتے تھے۔

بمبئی کے اجلاس کانفرنس میں آپ کے لکچر کا موضوع''اسلام میں علم اور دولت''تھا۔شمس العلماء مولانا شبلی صاحب کی سلاست بیان،عمدہ الفاظ اور اعلی معلومات کسی تعریف کے محتاج نہیں ہے۔جس شخص نے آپ کا بیان سنا ہے وہ ہی اس لطف سے واقف ہے جو آپ کا لکچر سننے سے سامعین کو ہوتا ہے۔افسوس ہے تو اس کا کہ مولانا شبلی نہ لکچر لکھ کر لاتے ہیں اور نہ بعد اجلاس کے اسے لکھ کر بھیجتے ہیں۔رپورٹروں کے نوٹوں سے تو معمولی اسپیچیں تیار ہو سکتی ہیں،لیکن کسی علمی لکچر کا تمام وکمال لکھا جانا ناممکن ہے۔لہذا لکچر میں وہ خوبی تو پیدا نہیں ہو سکتی تاہم متفرق لوگوں اور یادداشتوں سے اس قسم کی تمام تقریریں قلم بند کی جاتی ہیں مگر نوٹوں کے ذریعہ سے لکچر مرتب کرنے کے چونکہ مولانا موصوف سختی کے ساتھ مخالف ہیں اور وہ ہم کو لکھ چکے ہیں کہ ان کا لکچر نہ تیار کیا جائے۔لہذا مجبوراً قلم انداز کیا جاتا ہے۔''(۵)

لکچر کے اختتام پر قاضی کبیر الدین صاحب نے اہل بمبئی کی طرف علامہ شبلی کا شکریہ ادا کیا اور یہ اطلاع بھی دی کہ حاجی اسماعیل صاحب (۶) نے اس لکچر سے خوش ہو کر ۱۰۰/روپے کے اپنے چندہ میں ایک سو پچیس روپے دینا منظور کیا ہے۔(۷)

گذشتہ یعنی ۱۹۰۲ء کے اجلاس دہلی میں علامہ شبلی کو ایجوکیشنل کانفرنس نے انجمن ترقی

اردو کا سکریٹری نامزد کیا تھا، جس کی رپورٹ وہ ماہ بہ ماہ کانفرنس کے سکریٹری نواب محسن الملک کو بھیجتے رہے۔ اب اجلاس میں انہیں گذشتہ ایک سال کی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ چنانچہ وہ اس کی روداد لکھ کر لائے تھے اور اراکین کانفرنس کے سامنے پیش کیا۔ انجمن ترقی اردو کی یہ رپورٹ کئی لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ اس کا مطالعہ قدر دانان شبلی اور متعلقین علم و ادب بالخصوص موجودہ انجمن ترقی اردو کے عہدہ داروں کے لئے بھی اہمیت کی حامل ہے:

رپورٹ سالانہ انجمن ترقی اردو بابت ۱۹۰۳ء

جناب صدر انجمن!

میں انجمن اردو کی سالانہ رپورٹ جناب والا کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوگا کہ انجمن نے اس مدت میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔

لیکن چونکہ انجمن کی کارروائی کے سلسلے میں ملک کے اکثر اہل الرائے کے خیالات معلوم ہو چکے ہیں اور اس مدت تک ملک کے تمام اہل قلم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں رپورٹ پیش کرنے سے پہلے یہ ظاہر کروں کہ انجمن اردو کی کیوں ضرورت ہے؟ اور اس میں کامیابی کی امید ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور ہوسکتی ہے تو کن وسائل اور اسباب سے؟ اول وہلہ میں آپ کو خیال ہوگا کہ انجمن اردو کی ضرورت ایک مسئلہ مسلمہ ہے، اور کم از کم یہ کہ اس مسئلہ پر اگر گفتگو کی ضرورت تھی تو سال بھر پہلے تھی نہ اب، جب کہ تمام ملک میں انجمن کی عملی کارروائی کا سلسلہ پھیل گیا ہے، لیکن مجھے انجمن کی ضرورت کے متعلق عام خیال سے کچھ الگ کہنا ہے، اس لئے آپ معاف فرمائیں اگر میں اس داستان کو ایک دفعہ آپ کے سامنے دہراؤں۔

میں اس پہلو پر بحث نہیں کرتا کہ چونکہ ہر قوم کی ترقی اس پر موقوف ہے کہ علوم و فنون اس کی زبان میں آجائیں، اس لئے اردو میں علوم و فنونِ جدیدہ کے ترجمہ کی ضرورت ہے بلکہ میں ایک دوسرے پہلو سے انجمن کی ضرورت پر بحث کرتا ہوں۔

یہ بات علانیہ نظر آتی ہے کہ قوم کا ممتاز حصہ جدید تعلیم میں مصروف ہے اور ہوتا جاتا ہے۔

یہ بدیہی ہے کہ جدید تعلیم خود اس قدر مشکل، دیر طلب اور طویل الذیل ہے کہ اس کے ساتھ کوئی دوسری تعلیم جمع نہیں ہوسکتی۔ اس صورت میں ہماری قومی، مذہبی اور تاریخی معلومات کے بقا کا کیا ذریعہ ہے۔؟ کیا یہ پسندیدہ ہے کہ ہم صرف انگریزی تعلیم حاصل کریں اور اپنی قوم کی تعلیم سے، مذہب سے، علوم سے بالکل بے پروا ہو جائیں؟۔ اچھا پھر ان کے بقا کی کیا تدبیر ہے؟ صرف یہ کہ ان چیزوں کو ترجمہ کے ذریعہ سے اردو زبان میں منتقل کیا جائے یا ان مضامین پر اردو میں مستقل تصنیفات لکھی جائیں۔

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ جدید تعلیم یافتہ فرقہ کے لئے اپنے قومی علوم وفنون اور مذہب سے واقف ہونے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ یہ علوم اصلی زبانوں سے ملکی زبان میں لائے جائیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں کام یعنی ایشیائی اور مغربی علوم وفنون کا ترجمہ اور تالیف خود ہورہے ہیں اور اس کے لئے کسی انجمن کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ عربی، سنسکرت اور فارسی کی سیکڑوں کتابیں ترجمہ ہوچکیں اور ہوتی جاتی ہیں۔ انگریزی تصنیفات کا بھی ایک معتدبہ حصہ ملکی زبان میں آ گیا ہے اور آتا جاتا ہے۔ ملک میں سیکڑوں ہزاروں مترجم پیدا ہو گئے ہیں، جن کا مشغلہ زندگی یہی ہے۔ یہ سوال واقعی لحاظ کے قابل ہے اور اس سوال کا جواب دینا ایک بہت بڑے عقدہ کو حل کرنا ہے۔

بے شبہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سی ایشیائی اور مغربی تصنیفات ملکی زبان میں منتقل ہوگئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کتابیں کس درجہ کی ہیں۔؟

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس مسئلہ کی طرف لوگوں کو علم نے نہیں بلکہ ضرورت معاش نے متوجہ کیا ہے۔ اس لئے کام کرنے والے اسی اصلی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کن چیزوں کے ترجمے یا کس قسم کی تصنیفات مذاق عام کے موافق ہیں اور جلب زر کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس علمی پیداوار کا بڑا حصہ (جو کل کے قریب قریب ہے) ناول، ادنیٰ درجہ کی تاریخیں اور سوانح عمریاں ہیں۔ کسی اشتہاری کتب فروش کی فہرست کو پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی آدمی سوانح عمری کے انعام سے محروم نہیں رہا، لیکن یہ سوانح عمریاں کس

درجہ کی ہیں؟ اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔علوم وفنون کی بعض کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں۔ وہ کتابیں فی نفسہٖ اچھی بھی تھیں،لیکن قابل لحاظ یہ ہے کہ ترجمہ کیسا ہوا؟۔کیا مترجمین واقعی کامل استعداد رکھتے تھے؟۔کیا ترجمہ کی دنیا میں ان لوگوں کی کچھ شہرت تھی؟۔کیا ان ترجموں کو شائع ہونے سے پہلے کسی مبصر جماعت نے تنقید کی نظر سے دیکھ لیا تھا؟۔ بے شبہ ان خزف ریزوں میں ایک آدھ جواہر بھی نکل آتے ہیں،لیکن وہ کالعدم ہیں۔

ان حالات کے معلوم ہونے کے بعد کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ ایک ایسی مستقل انجمن کی ضرورت ہے جس کو اس کی پروانہ ہو کہ ملک کا اورعوام کا مذاق کیا ہے؟ بلکہ اس کا صرف یہ مطمحِ نظر ہو کہ ملک میں کس قسم کا مذاق پیدا کرنا چاہئے اور ملک کی علمی زندگی کی ترقی کے لئے کس قسم کی تصنیفات اور تراجم کی ضرورت ہے۔اس کے ساتھ یہ انجمن ایسے افراد سے مرکب ہو جو ایشیائی اور مغربی علوم کے ماہر ہوں اور تصنیفات وتراجم پر ناقدانہ اور آزادانہ رائے دے سکتے ہوں۔

ملک کے اور حصوں میں اس قسم کی انجمنیں قائم ہوگئی ہیں اور علمی زبانوں سے علوم وفنون کا ذخیرہ ملکی زبانوں میں آ گیا ہے۔ بنگالی زبان اب ایک کامل علمی زبان بن گئی ہے،جس میں ہر قسم کی علوم وفنون جدیدہ کی کتابیں مہیا ہوگئی ہیں۔ ہندی زبان میں ابھی حال ہی میں سائنٹفک ڈکشنری سات جلدوں میں تیار ہوئی ہے،جس کی تفصیلی کیفیت پانیر (Poniar) میں شائع ہوچکی ہے۔مرہٹی زبان کی ترقیاں محتاج بیان نہیں۔صرف ایک اردو زبان ہے جو باوجود عام زبان ہونے کے علمی تصنیفات اور خصوصاً علوم وفنونِ جدیدہ سے بالکل محروم ہے۔

اکثر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ علم وفنون جدیدہ کی تصنیفات اس کثرت سے ہیں کہ ان کے ترجمے کا قصد کرنا گویا آب دریا بہ گز پیمودن ہے،لیکن یہ شبہ ایک وہم باطل ہے۔ ہر فن میں گو بہت سے تصنیفات ہوتی ہیں،لیکن امہات الکتب دو چار سے زیادہ نہیں ہوتیں۔اس لئے ان کتابوں کا ترجمہ ہونا کافی ہوسکتا ہے۔

اس موقع پر اس امر کا اظہار بھی ضرور ہے کہ گو ملک میں علوم وفنون کے مترجم یا مصنف

بہت کم نظر آتے ہیں اوراس سے یہ بددلی پیدا ہوتی ہے کہ انجمن اگر قائم بھی ہوئی تو قابل مصنف اور مترجم کہاں سے ہاتھ آئیں گے؟ لیکن اس مدت کے تجربے نے یہ ثابت کردیا کہ ملک ایسے قابل اشخاص سے خالی نہیں، لیکن چونکہ ملک کا عام مذاق ان کی قابلیت کی قیمت نہیں ادا کرسکتا، اس لئے وہ گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کے پاس تصنیف وتالیف کا سرمایہ نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو سرمایہ رکھتے ہیں لیکن ملک کے مذاق کے لحاظ سے ان کو یہ توقع نہیں کہ ان کی تصنیف یا تالیف رواج حاصل کرسکے گی۔

انجمن کا بڑا کام ان ہی قابل جوہروں کا پتہ لگانا اوران کی قابلیت سے کام لینا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میں انجمن کی رپورٹ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

یہ انجمن ۴؍جنوری ۱۹۰۳ء کو بمقام دہلی ایجوکیشنل کانفرنس کے غیر معمولی اجلاس میں قائم ہوئی اور بزرگان ذیل اس کے عہدہ دار اور کارکن قرار پائے:

صدر انجمن	:	ٹی ڈبلیو آرنلڈ، اسکویر پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور
نائب صدر	:	شمس العلماڈاکٹر مولوی نذیر احمد خان صاحب ایل ایل ڈی
ایضاً	:	مولانا الطاف حسین صاحب حالؔی
ایضاً	:	شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب
سکریٹری	:	(شمس العلماء مولانا) شبلی نعمانی
اسسٹنٹ سکریٹری	:	مولوی حامد علی صاحب صدیقی سہارن پوری

۵؍جنوری ۱۹۰۳ء کو کانفرنس ہی کے ایک پرائیویٹ اجلاس میں انجمن کے لئے ایک مختصر دستور العمل کا مسودہ طیار کیا گیا، لیکن چونکہ یہ مسودہ محض سرسری طور پر طیار ہوا تھا۔ اور اجلاس کانفرنس کے ختم ہونے کے ساتھ تمام ارکان دور دراز مقامات پر چلے گئے تھے۔ مسودہ کی درستی اور اصلاح میں خط وکتابت کے ذریعہ سے ایک مدت صرف ہوگئی۔ یہاں تک کہ ۸؍اپریل ۱۹۰۳ء کو دستور العمل مذکور چھپ کر شائع ہوا اور دراصل انجمن کے قیام کی تاریخ اسی دن سے شمار کرنی چاہئے۔ اس لحاظ سے یہ رپورٹ سالانہ نہیں بلکہ ہشت ماہہ رپورٹ ہے۔

ا۔انجمن کا سب سے پہلا کام ملک کو اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کرنا اور یہ دریافت کرنا تھا کہ جو مقاصد انجمن کو پیش نظر ہیں ملک اس کے لئے طیار ہے یا نہیں۔ چنانچہ نہایت کثرت سے خطوط چھپوا کر شائع کئے گئے۔ اخبارات وغیرہ سے مدد لی گئی۔ ممتاز بزرگوں کی خدمت میں خاص طرح پر تحریک کی گئی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں۔ ملک کے ہر فرقہ نے بلاتخصیص مقاصد انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔

ابتدا میں ہندو صاحبوں کو بطور خود یہ غلط خیال پیدا ہوا کہ ان کو انجمن کی شرکت سے علاحدہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ایک ہندو اخبار (۸) نے اس کا اظہار بھی کیا، لیکن جب اس کے جواب میں سکریٹری کی ایک تحریر (۹) اسی اخبار میں شائع ہوئی تو ہندو صاحبوں کے دل سے یہ شبہ جاتا رہا اور سب سے پہلے جناب آنریبل رائے نہال چند صاحب رئیس مظفر نگر (۱۰) نے انجمن کی ممبری قبول کرنے کی اطلاع دی۔

ملک میں جس قدر ممتاز اور نام آور بزرگ ہیں، مثلاً آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی۔ نواب محسن الملک۔ بدر الدین طیب جی صاحب جج ہائی کورٹ بمبئی۔ مشیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسین صاحب (۱۱)۔ سید کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا (۱۲)۔ خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج عدالت خفیہ۔ خان بہادر مولوی عبد الغفور صاحب وزیر ریاست رامپور۔ (۱۳)

ان تمام بزرگوں نے خوشی کے ساتھ ممبری قبول کی۔ انگلش جنٹل مینوں نے بھی انجمن کی طرف توجہ ظاہر کی۔ چنانچہ ڈبلیو بیل صاحب (۱۴) ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے انجمن کا رکن اعزازی ہونا منظور کیا۔ (۱۵)

(شمس العلماء)

شبلی نعمانی

تعلیقات وحواشی

(۱) جسٹس بدرالدین طیب جی [۱۸۴۴-۱۹۳۹ء] جج بمبئی ہائی کورٹ، بمبئی کی بہت مشہور، تعلیم یافتہ، مہذب اور بڑی بااثر اور فعال شخص تھے۔عربی وفارسی تعلیم کے بعد الفنسٹن کالج میں داخل ہوئے۔ بعدازاں لندن چلے گئے اور لندن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور بیرسٹر ہوکر واپس آئے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے تعلیم کے لئے انگلستان کا سفر کیا اور بیرسٹری پاس کی۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو بیرسٹری پاس کے بمبئی ہائی کورٹ کے جج منتخب ہوئے۔ وہ کانگریس کے ابتدائی ارکان میں سے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں جب اس کا پہلا اجلاس ہوا تو وہ اس میں شریک تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جو کانگریس کے تیسرے صدر منتخب ہوئے۔بمبئی کے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے انہوں نے اسکول قائم کیا۔ انجمن اسلام کے بھی وہ بانیوں میں ہیں۔۱۹۰۳ء کے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بمبئی کی بھی انہوں نے صدارت کی۔اور خطبہ دیا۔

(۲) قاضی کبیرالدین بیرسٹر [م: جولائی ۱۹۴۰] بمبئی کے ممتاز بیرسٹر اور قانون داں تھے۔مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔انجمن اسلام بمبئی کے صدر اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم اور فعال رکن رہے۔کوکن کے مسلمانوں کی تعلیمی بیداری میں ان کا بھی حصہ ہے۔

(۳) مولانا شاہ سلیمان پھلواروی [م: ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء] مشہور عالم وواعظ اور دارالعلوم ندوہ کے رکن تھے۔ پھلواری شریف بہار میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ میں درسیات کی تکمیل کی، یہیں طب بھی پڑھی۔ندوہ قائم ہوا تو اس سے بڑی دلچسپی لی اور بڑا اثر قائم کیا۔علامہ اقبال کی مثنوی اسرار خودی پر خواجہ حسن نظامی سے جو اختلاف ہوا تھا، شاہ صاحب نے اس کے حل کرانے میں تعاون کیا۔

(۴) مرقع کانفرنس ص ۹۴

(۵) رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی ۱۹۰۳ء، مطبوعہ ۱۹۰۵ء ص ۲۶۰-۲۶۱

(۶) حاجی اسماعیل: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۷) رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی ۱۹۰۳ء، مطبوعہ ۱۹۰۵ء ص ۲۶۰-۲۶۱

(۸) اخبار ہندوستانی لکھنو

(۹) علامہ شبلی نے اس کے جواب میں لکھا کہ

''یہ واقعہ کے خلاف ہے۔انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو تصنیف پر دیا ہے وہ ایک ہندو مترجم کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی یعنی کتاب ''پیغمبران ہند''، جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول وعقائد ہیں۔''

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اکتوبر ۱۹۰۳ء ص ۸)

(۱۰) آنریبل رائے نہال چند صاحب رئیس مظفر نگر: تفصیل دستیاب نہ ہوسکی۔

(۱۱) وزیرالدولہ خلیفہ سید محمد حسین ریاست پٹیالہ پنجاب کے وزیر ومشیر تھے۔ایم.اے.او، کالج علی گڑھ کے بڑے ہمدرد تھے۔ایک بار اس کے معائنہ کے لئے تشریف لائے۔علامہ شبلی نے اس موقع پر سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء] کی فرمائش پر فارسی کے چند بند پڑھے۔اس مجلس کا سماں علامہ شبلی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''جلسہ دعوت میں سید محمود کی فرمائش سے میں نے چند بند فارسی میں لکھے اور کھانے کے بعد پڑھے۔عجیب سماں بندھ گیا تھا۔تمام حضار مجلس حقیقت میں بیتاب ہو گئے۔سید محمود اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی کئی بار پڑھواتے۔وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا کہ افسوس ہے کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے، ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا۔'' (مکاتیب شبلی ج ا ص ۸۳)

(۱۲) مولوی سید کرامت حسین [م: ۱۲/اپریل ۱۹۱۷ء] لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔وہیں عربی کی تعلیم حاصل کی۔پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن گئے اور بیرسٹری پاس کی۔واپس آ کر علی گڑھ میں قانون کے استاذ ہوئے۔یہیں علامہ شبلی سے ربط وتعلق قائم ہوا۔

وہ قانون اور فلسفہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔آخر میں ہائی کورٹ الہ آباد کے جج مقرر ہوئے۔اس سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ میں قیام کیا اور وہاں مسلم گرلز اسکول قائم کیا جو اب کرامت حسین ڈگری کالج کے

نام سے مشہور ہے۔ وہ اہل قلم بھی تھے۔ کئی کتابیں لکھیں۔ بقول سید صاحب ''افراد کا سیہ کے نام سے ان کا بڑا اچھا رسالہ ہے۔'' علامہ شبلی کے بعد انہوں نے دارالمصنّفین سے بھی تعلق رکھا وہ اس کی انتظامیہ کے نائب صدر بھی رہے۔

(۱۳) خان بہادر مولوی عبدالغفور صاحب وزیر ریاست رام پور۔

(۱۴) ڈبلیو بیل: ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب

(۱۵) ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ، فروری ۱۹۰۴ء ص ۴-۸

ooo

انیسواں اجلاس۔علی گڑھ

ایجوکیشنل کانفرنس کا انیسواں اجلاس ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔اس کی صدارت خان بہادر مشیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسین [۱۸۳۹-۱۹۰۸ء] وزیر ریاست پٹیالہ(۱) نے کی۔کانفرنس کا یہی وہ اجلاس ہے جس میں نواب محسن الملک نے اپنی کثیر الاشغال مصروفیت کی وجہ سے کانفرنس کے بار کو کلیتاً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے حوالہ کر کے اپنی دست برداری کا اعلان بھی کر دیا۔(۲) اس کے بعد صاحبزادہ صاحب کانفرنس کے سیاہ و سپید کے ۱۹۱۷ء تک مالک رہے۔اور جب لندن گئے تو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو اپنا جانشین مقرر کر کے گئے۔

علامہ شبلی کے تئیں ان کا معاملہ کبھی اچھا نہیں رہا۔اصولاً علامہ شبلی کو اس اجلاس میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے تھا۔مگر وہ شریک نہیں ہوئے اور استعفیٰ بھیج دیا۔اسی اجلاس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے خبر دی کہ

> ''اس سیکشن کا تعلق شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی سے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ مولانا موصوف ندوۃ العلما کے اہم کام میں مصروف ہیں،اس لئے ان کو اس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہے۔مولانا نے سکریٹری شپ سے اس سال استعفیٰ بھیج دیا ہے۔اس لئے جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کے یہ کام سپرد کیا گیا۔اس میں شک نہیں کہ مولانا مولوی شبلی صاحب نعمانی کے قطع تعلق کا افسوس ہے،لیکن جو دلچسپی اور خاص توجہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کو ان امور میں ہے اس سے امید ہوتی ہے کہ اس سال اس صیغہ میں نئی

جان پڑ جائے گی۔(۳)

خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ

''کانفرنس کے صیغۂ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہماری قوم کے روشن چراغ شمس العلما مولانا شبلی تھے۔.......... مگر افسوس ہے کہ بوجہ کمزوری اور علالت اور نیز اس وجہ سے کہ انہوں نے ندوۃ العلماء کا کام اپنے ذمہ لیا ہے، انہوں نے اس خط کے ذریعہ سے استعفیٰ پیش کیا ہے۔ اب خیال تھا کہ ایسا شخص ان کے جانشین ہو جو علی گڑھ کے قرب میں رہتا ہو اور لٹریری خدمات کا ثبوت بھی دے چکا ہو اور پوری توجہ کے ساتھ کام بھی کرے، اس لئے مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کا نام تجویز کیا گیا ہے۔''(۴)

علامہ شبلی کے استعفے پر نہ کوئی ردوقدح ہوئی اور نہ اس کے اسباب کا جائزہ لیا گیا۔ اس سے پہلے شروانی صاحب انجمن کے رکن ضرور تھے، مگر انہوں نے کوئی قابل ذکر کام انجام نہیں دیا تھا، تاہم یکا یک انہیں علامہ شبلی کا جانشین بنا دیا گیا۔ دراصل علامہ شبلی نواب محسن الملک کے خاص معتمد تھے تو صاحبزادہ صاحب نے اپنا معتمد خاص منتخب کیا۔ یہی سبب ہے کہ شروانی صاحب کے انجمن سے مستعفی ہو جانے کے بعد بھی ۱۹۱۷ء میں انہیں اپنا جانشین بنایا۔

انجمن کے مالی حالات تو خراب تھے ہی، ایک امکان یہ بھی ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد سے دور رہنے اور بچنے کی غرض سے علامہ شبلی نے انجمن سے کنارہ کشی اختیار کی ہوگی۔

تعلیقات و حواشی

(۱) خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین کے آبا و اجداد کا تعلق بخارا سے تھا۔ ان کے والد ریاست پٹیالہ میں شاہی طبیب تھے۔ راجہ ان سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ ان کی اولاد کو بھی دربار سے وابستہ رکھا۔ انگریزوں نے بھی انہیں عزت دی اور خطابات سے نوازا۔ خلیفہ محمد حسین بھی تا حیات ریاست پٹیالہ کے وزیر رہے۔ پنجاب کی پہلی لیجس لیٹیو کونسل کا رکن بھی انہیں نامزد کیا گیا تھا۔

پنجاب میں جب اردو ہندی کا تنازعہ ہوا تو انہوں نے بڑی خوبی سے اس مسئلہ کو حل کیا۔ علی گڑھ تحریک سے یہ اور ان کے بڑے بھائی خلیفہ سید محمد حسن دونوں وابستہ رہے۔ اور اس کی ترقی میں حصہ لیا۔ علامہ شبلی سے بھی ان کے مراسم تھے۔

(۲) مرقع کانفرنس ص ۱۰۸

(۳) رپورٹ اجلاس نوزدہم محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ص ۲۱-۲۲، ۱۹۰۶ء

(۴) ایضاً ص ۳۰۲-۳۰۳

ooo

بیسواں اجلاس۔ڈھاکہ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بیسواں اجلاس ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ علامہ شبلی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔اس کی صدارت آنر یبل جسٹس سید شرف الدین (۱) جج ہائی کورٹ کلکتہ نے کی۔اجلاس کے تمام اخراجات تن تنہا نواب سر سلیم اللہ خاں ڈھاکہ (۲) نے اٹھائے۔اور وہ نہ صرف دھن سے شریک رہے بلکہ تن اور من سے بھی شب و روز لگے رہے۔امان اللہ خاں شروانی نے اپنی کتاب ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال'' میں اس اجلاس کا جائے وقوع کلکتہ لکھا ہے (۳)،مگر یہ درست نہیں ہے۔یہ اجلاس ڈھاکہ ہی میں ہوا تھا۔ اس اجلاس میں کانفرنس نے متعدد اہم تجاویز منظور کیں۔مثلاً:

۱۔مسلم طلبہ کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں ہاسٹل قائم کئے جائیں۔
۲۔حکومت سے نصاب میں اصلاح کے لئے درخواست کی جائے۔
۳۔مدارس اور مکاتب کو بھی میونسپل بورڈ اور ضلع بورڈ سے امداد دی جائے۔
۴۔مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے جدوجہد مزید تیز کی جائے۔
۵۔علی گڑھ میں ایک مرکزی اسکول میوزیم قائم کیا جائے۔
۶۔دوران تعطیل لکچرس کا انتظام کیا جائے۔
۷۔ابتدائی اور پرائمری تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔
۸۔تحریک ندوہ کی حمایت میں تجویز پاس ہوئی۔(۴)

سر سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ اور نواب محسن الملک کے اصرار پر علامہ شبلی نعمانی نے اس

سالانہ اجلاس میں شرکت کی تھی (۵) اور ایجوکیشنل کانفرنس کا درج ذیل رزولیشن نمبر ۱۳ رپیش کیا۔

''یہ کانفرنس ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (۶) پی ایچ ڈی کو ان کی کامیابیوں پہ جو ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے پانچ سالہ قیام میں حاصل کی ہیں اور جن کے سبب سے مسلمانوں کی قوم میں اپنی آپ مثال ہیں دلی مبارکباد دیتی ہے۔'' (۷)

مشیر الدولہ ممتاز الملک خلیفہ سید محمد حسین وزیر ریاست پٹیالہ نے علامہ شبلی کی اس قرارداد کی تائید کی۔

لکچر: تاریخ اسلام

کانفرنس کے ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء کے اجلاس میں جس کی صدارت خان بہادر مرزا شجاعت علی صاحب (۸) نے کی تھی، علامہ شبلی نے ''تاریخ اور اسلام'' کے موضوع پر خطبہ دیا۔ (۹) مگر کانفرنس کی رپورٹ میں اس کا ذکر تک نہیں آیا ہے اور نہ ان کا خطبہ ہی نقل ہوا ہے۔ علامہ شبلی نے اس کی تفصیل ایک مکتوب میں لکھی ہے۔ (۱۰)

۱۹۰۶ء کے کانفرنس کے اسی اجلاس کے موقع پر شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن ڈھاکہ [۱۸۸۰-۱۹۴۷ء] سے علامہ شبلی کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

''سن ۱۹۰۶ء میں یہاں ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے متکلم اسلام علامہ شبلی مغفور تشریف لائے تو میں نے ان کی خدمت میں یہ خیال پیش کیا کہ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون کی طرح صوبہ وار کتابوں کے حالات مع مصنّفین مختصر ترجمہ کوئی لکھ دے تو ہندوستان کی ایک بڑی علمی خدمت ہو۔ علامہ نے تحسین فرمانے کے ساتھ حکم دیا کہ بنگال کا حصہ تم پورا کرو۔'' (۱۱)

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن (۱۲) نے اس کام کا آغاز کیا اور اس کا ایک بڑا حصہ لکھ بھی لیا تھا، مگر کتاب پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ یہ کتاب ''ثلاثہ غسّالہ'' کے نام سے مشہور محقق و مصنف جناب عارف نوشاہی نے تعلیقات و حواشی کے ساتھ مرتب کر دیا ہے۔ جسے پہلے مجلس ترقی ادب

لاہور نے شائع کیا تھا۔ اب مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا نے بھی شائع کر دیا ہے۔ ہمارے کرم فرما جناب ڈاکٹر دبیر احمد صاحب استاذ شعبہ اردو مولانا آزاد کالج کولکاتا نے ہمیں یہ کتاب تحفتاً بھیجی ہے۔ اس علمی تحفے کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔ اس کی تفصیل حکیم حبیب الرحمٰن نے اپنی مشہور کتاب آسودگان ڈھاکہ کے دیباچہ میں لکھی ہے۔

تعلیقات وحواشی

(۱) جسٹس سید شرف الدین نیورہ پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں انگلستان سے بیرسٹری کی سند حاصل کر کے واپس آئے اور وکالت شروع کی۔ وکالت کے ساتھ سیاست سے بھی دلچسپی لینی شروع کی اور کانگریس کی رکنیت اختیار کی۔ ۱۹۰۶ء میں حکومت ہند نے ان کو کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا۔ اسی سال وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ڈھاکہ کے بھی صدر منتخب ہوئے۔

ان کے یہ آدھے ادھورے حالات خطبات عالیہ کے مرتب مولوی انوار احمد زبیری مارہروی نے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے حالات شاید لکھے ہی نہیں گئے اور نہ دستیاب ہوئے۔

(۲) نواب خواجہ سر سلیم اللہ خاں [۱۸۸۴-۱۹۱۶ء] ڈھاکہ کے نواب تھے۔ آبائی وطن کشمیر تھا۔ انگریزوں نے سر کا خطاب دیا تھا۔ بڑے باثر شخص تھے۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۱۶ء کو کلکتہ میں وفات پائی۔ تدفین خاندانی قبرستان ڈھاکہ میں ہوئی۔

(۳) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال ص ۶۷

(۴) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال ص ۶۸-۶۹

(۵) حیات شبلی، طبع جدید ۲۰۱۵ء، ص ۲۱۲

(۶) ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد [۱۸۷۸-۱۹۴۷ء] ہندوستان کے نامور ریاضی داں، فلسفی ماہر تعلیم اور سیاست داں تھے۔ ۱۳ر فروری ۱۸۷۸ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکاتب و مدارس میں حاصل کر کے علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ آئے تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پہلے تعلیم حاصل کی۔ پھر صلاحیت کی بنیاد پر جونیئر لکچر رہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد مزید تعلیم کے لئے وہ انگلینڈ گئے اور وہاں ریاضی وفلسفہ کی تعلیم حاصل

کی۔کچھ دنوں تک لندن میں تدریس کا بھی سلسلہ رہا۔پھر واپس آکر مادرعلمی کی خدمت میں مصروف ہوئے۔۱۹۲۰ءایم اے او کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا تو یہ پروائس چانسلر نامزد ہوئے۔کچھ عرصہ بعد وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ڈاکٹر سر ضیاء الدین علی گڑھ تحریک کے بڑے حامی و مددگار رہے۔ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے اور اس کے تعلیمی مباحثوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔۱۴/اگست ۱۹۴۷ءکولندن میں انتقال کیا۔علامہ شبلی نعمانی سے بھی مراسم تھے۔وہ جب لندن میں زیر تعلیم تھے وہاں سے خط لکھ کر کچھ کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔وہ خط ''مکتوبات شبلی''میں نقل کیا گیا ہے۔

(۷) رپورٹ آل انڈیا محڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ ۱۹۰۶ءص ۱۵۴

(۸) خان بہادر مرزا شجاعت علی:تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۹) مکاتیب شبلی ج ۱ص ۱۵۹

(۱۰) مکاتیب شبلی ج ۲ص ۱۵۹

(۱۱) آسودگان ڈھاکہ ص ۲

(۱۲) رئیس الاطباء شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن [۱۸۸۰-۱۹۴۷ء] کا شمار ہندوستان کے ممتاز اہل علم اور نامور اطبا میں ہوتا ہے۔ان کے والد اخوند محمد شاہ عرف بادشاہ میاں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ [م:۱۹۴۳ء] کے ہم سبق تھے۔تحصیل علم کے بعد معاش کے لئے ڈھاکہ پہنچے۔یہیں ۱۹۰۴ء میں حکیم حبیب الرحمٰن پیدا ہوئے۔تکمیل کے بعد مطب شروع کیا۔انہیں علم وادب سے بڑا لگاؤ تھا۔شاعر تھے۔اہل قلم تھے۔مضامین لکھا کرتے تھے۔ایک اخبار اور ایک رسالہ ماہنامہ جادو بھی جاری کیا،جسے وہ برسوں بڑی محنت ولگن سے ایڈٹ کرتے رہے۔کئی کتابیں ڈھاکہ پچاس سال پہلے،آسودگان ڈھاکہ اور ثلاثہ غسالہ ان کی نہایت قیمتی یادگاریں ہیں۔ثلاثہ غسالہ ابھی جلد ہی اردو اکادمی کولکاتا سے شائع ہوئی ہے۔۲۳/فروری ۱۹۴۷ءکووفات پائی۔علامہ شبلی سے اپنے تعلق کا ذکر انہوں نے آسودگان ڈھاکہ کے دیباچہ میں کیا ہے۔وہ اقتباس اس کتاب میں بھی نقل ہوا ہے۔

○○○

بائیسواں اجلاس۔امرت سر

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بائیسواں اجلاس ۱۹۰۸ء میں امرت سر میں منعقد ہوا۔اس کی صدارت نواب سر سلیم اللہ خاں [۱۸۶۵-۱۹۱۰ء] نواب ڈھاکہ نے کی۔اجلاس میں اور زعمائے ملت کے ساتھ علامہ شبلی بھی شریک ہوئے۔اور تینوں اجلاسوں میں شریک رہے۔ حالانکہ اس سے پہلے ۱۹۰۷ء میں ان کے پاؤں کا سانحہ پیش آچکا تھا۔(۱) اور گولی لگنے کے بعد ایک پاؤں کاٹ دیا گیا تھا۔ چند ماہ بعد مصنوعی پاؤں لگایا گیا تھا۔اب علامہ شبلی اسی مصنوعی پاؤں کے سہارے چلتے پھرتے اور سفر کرتے تھے۔اسی بنا پر ایک موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ

لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

پہلا مصنوعی پاؤں بمبئی میں غالباً ڈاکٹر رجب علی (۲) کے یہاں بنا تھا۔اس کے بعد ہی انہوں نے امرتسر کا طویل سفر طے کیا۔ملت کے لئے مرنے جینے والے علامہ شبلی ہی یہ سفر کر سکتے تھے۔مصنوعی پاؤں کے ساتھ غالباً علامہ شبلی کا یہ پہلا طویل سفر تھا۔

اس اجلاس کی وہ مجلس استقبالیہ میں شامل تھے۔اور جب نواب سر سلیم اللہ خاں صاحب اجلاس میں تشریف لائے تو ان کے استقبال کرنے والوں میں علامہ شبلی بھی شامل تھے۔(۳) بعد

ازاں وہ دیگر اجلاسوں میں بھی شریک رہے۔

فارسی نصاب میں عربی قواعد

علامہ شبلی نے ایک اجلاس میں یہ قرارداد [نمبر ۱۰] پیش کی کہ

''الہ آباد یونیورسٹی کا نصاب تعلیم فارسی جس میں عربی زبان کے قواعد لازمی کردئے گئے ہیں فارسی زبان کی تعلیم کے لئے مفید نہیں ہے۔ اوراس کانفرنس کی رائے میں فارسی زبان کا ایسا نصاب مقرر ہوسکتا ہے کہ جو عربی کے نصاب کے برابر مشکل ہو۔'' (۴)

نوراحمد صاحب نور (۵) نے اس قرارداد کی تائید کی۔(۶)

نوراحمد صاحب نور کی تائید کے سوا اس پر کسی قسم کا بحث ومباحثہ یا غور وفکر شاید نہیں ہوا۔ اس سے پہلے جب فارسی نصاب تعلیم کو یونیورسٹی سے خارج کیا گیا تھا تو علامہ شبلی ہی میدان میں آئے اور فارسی کی حمایت میں ایسی پرزور اور مدلل تقریر کی جس سے فارسی زبان نصاب سے خارج ہونے سے بچ گئی۔ اوراب پھر جب فارسی میں عربی قواعد شامل کئے گئے تو انہوں نے اس کے خلاف رزولیشن پیش کیا۔ اورمشورہ دیا کہ فارسی کا نصاب بھی عربی کے برابر ہوسکتا ہے۔ مگر کانفرنس میں اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اور جب کسی نے توجہ نہیں دی تو وہ خود نصاب تعلیم کے لئے کمر بستہ ہوئے۔ اور فارسی کا نہایت اعلی معیار کا نصاب تیار کیا۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علامہ شبلی نعمانی نے الہ آباد یونیورسٹی کا فارسی نصاب تیار کیا تھا۔ اوراس اجلاس اور قرارداد کے بعد علامہ شبلی نے تین نصابی کتابیں انٹرنس کورس فارسی ،ایف اے کورس فارسی اور بی اے کورس فارسی مرتب کیں اور جو بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں۔ ان کی ان تینوں نصابی کتابوں کا تعارف راقم کی کتاب ''آثار شبلی'' میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔(۷)

۱۹۰۸ء کے اس اجلاس میں علامہ سرمحمد اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] بھی شریک ہوئے اور غالباً ایجوکیشنل کانفرنس میں پہلی بار شریک ہوئے تھے۔ کانفرنس نے اس موقع پر ان کے لئے یہ

قرارداد پیش کی تھی کہ

''یہ کانفرنس ڈاکٹر محمد اقبال صاحب پی ایچ ڈی کو ان کامیابیوں پر جو ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے قیام میں حاصل کی ہیں اور جن سے وہ مسلمانوں میں اپنی آپ مثال ہیں، دلی مبارک باد دیتے ہیں۔'' (۸)

کانفرنس کے اجلاس میں حسب معمول پہلے انجمن ترقی اردو اور پھر شعبہ تعلیم نسواں کی سالانہ کارگذاریاں پیش کی گئیں۔ تعلیم نسواں کے ذمہ دار علامہ شبلی کے ایک شاگرد شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں [۱۸۷۴-۱۹۶۵ء] (۹) تھے۔ اپنی رپورٹ پیش کرنے کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ اب علامہ شبلی نعمانی کا ''حقوق نسواں'' پر لکچر ہوگا۔ اس اعلان کے بعد بقول شیخ عبداللہ:

''سارے جلسہ نے نہایت عقیدت وگرم جوشی سے آپ کا خیر مقدم کیا۔ قبل اس کے کہ جناب مولانا موصوف کچھ فرمائیں جناب ملک محمد دین صاحب مہتمم صیغہ انہار وآبپاشی ریاست بہاول پور نے کلام مجید کے ایک رکوع کی نہایت خوشگوار ودل نشیں قرات میں تلاوت فرمائی۔'' (۱۰)

بعد ازاں علامہ شبلی نے خطاب فرمایا۔ ان کی یہ تقریر ۱۹۰۸ء کی کانفرنس کی روداد میں شائع ہوئی ہے۔ اور ہم اپنے کتاب کے قارئین کے لئے اسے یہاں نقل کرتے ہیں:

حقوق نسواں

وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۱)

حضرات! جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے، اس کے معنی اور اپنے مفہوم کا اس سے تعلق میں بعد میں بیان کروں گا، پہلے بہ طور تمہید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس تیرہ سو سال ہجری کے زمانہ میں مسلمانوں کو بڑے بڑے خطرناک واقعات وحوادثات پیش آئے۔ ایک چنگیز خاں [ہلاکو خان] (۱۲) ہی کی ٹکر ایسی زبردست تھی کہ مسلمان اس کے صدمہ سے کئی سو برس تک نہیں سنبھل

سکے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آج تک نہیں سنبھلے، اسی طرح اور اسی قسم کے بیسیوں صدمات ایسے تھے جو مسلمانوں پر ہو گذرے ہیں، مگر آج کل جو ٹکر لگی ہے، وہ ان تمام مشکلات سے بڑھ کر ہے، کسی سلطنت کا جنگی حملہ کوئی بڑی چیز نہیں لیکن آج کل ایک ایسی قوم کی شائستگی، تمدن وتہذیب سے ہمارا مقابلہ آپڑا ہے، جو دنیا میں سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی قوم اس کے مقابلہ میں اس وقت تک ترقی کرے، جب تک کہ وہ ان امور میں اس سے بالاتر نہ ہو، ڈاکوؤں کی طرح کسی ملک کو فتح کر لینا، لوگوں کا مال چھین لینا ممکن ہے مگر اس کا اثر مستقل نہیں ہوتا اور قبضہ دیرپا نہیں رہتا، مستقل اسی وقت ہوتا ہے، جب کہ فاتح قوم کی ہر بات مفتوح قوم سے بڑھی ہوئی ہو اور وہ تہذیب اور تمدن سے مفتوح قوم کو دبا سکے، اس کلیہ کا ہم پر یہ اثر ہوا ہے کہ یورپ کی تہذیب اور شائستگی کے مقابلہ میں ہم دبے جاتے ہیں اور سر نہیں اٹھاتے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خدانخواستہ ہمارا مذہب یا ہماری قومی تہذیب یورپ کی مذہبی یا قومی تہذیب سے کمزور ہے، بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے مذہب وتہذیب قومی کو چھوڑ دیا ہے، ہم اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے ناواقف ہیں، سات آٹھ برس کی عمر سے ہمارے لڑکے انگریزی تعلیم شروع کرتے ہیں اور دس بارہ برس اس میں مشغول رہتے ہیں، پھر کوئی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کسی کاروبار میں پڑ جاتے ہیں، ایسی حالت میں نہ ان کو مذہب اور قوم کی تاریخ کے مطالعہ کا وقت ملتا ہے، نہ اس پر غور وخوض کرنے کی فرصت اور اگر کسی کو شوق بھی پیدا ہوا تو اسے اس کے متعلق کافی لٹریچر نہیں ملتا اور بالآخر وہ انگریزی مصنّفین کی طرف رجوع کرتا ہے اور دوسروں کی زبان وقلم سے اپنی حقیقت سنتا ہے۔

و لیکن قلم در کفِ دشمن است

پس ایسے مطالعہ اور تحقیقات سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، حالت موجودہ کے مطابق ہم اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے آگاہ نہیں ہیں اور آگاہ ہونے کی کوشش بھی نہیں کرتے، پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یورپ کی تہذیب وشائستگی ہم پر غالب آتی جاتی ہے اور اپنی تہذیب و شائستگی کو ہم چھوڑتے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ چھوڑنے کے قابل نہیں رہے۔ اس میں بڑی بڑی

خوبیاں ہیں بڑے بڑے خزانے ہیں، معلومات ہونی چاہئیں، بغیر معلومات کے کوئی شخص صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا، خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان معلومات کے متعلق کئی بار واقعات پیش آئے، جب آپ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ کھجوروں کے درختوں میں باہم شادیاں کرتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع فرمایا، لوگوں نے آپؐ کے ارشاد پر کھجوروں کی شادیاں موقوف رکھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوروں کے درخت بارآور نہ ہوئے، لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی، آپؐ نے تمام واقعات سن کر فرمایا کہ تم اپنے امور مجھ سے زیادہ جانتے ہو، مجھے جو کچھ شرف اور بزرگی تم پر ہے وہ یہ ہے: "یُوحٰی اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ" [انبیاء۔۱۰۸] ممکن ہے دنیاوی باتوں میں مجھ سے زیادہ سمجھ رکھتے ہو۔ (۱۳)

پس واقفیت حاصل کرنی ضروری چیز ہے، میں دیکھتا ہوں کہ مذہبی تعلیم سے، مذہبی تاریخ سے ہم واقف نہ ہوئے، تو تہذیب قومی و تہذیب مغربی میں کون تفریق کرے گا اور کیوں کر ہم ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکیں گے، آج کل ہم یورپ کی اندھادھند تقلید کر رہے ہیں، یورپ پر کیا بھروسہ ہوسکتا ہے، ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ سے جس مذہب کو اپنا مذہب سمجھیں، وہ دراصل ہمارا مذہب نہ ہو اور جسے ہم اپنی تاریخ قرار دیتے ہیں، وہ ہماری تاریخ نہ ہو۔ اب میں ان حقوق کو بیان کرتا ہوں جو اسلام نے عورتوں کو بخشے ہیں۔

حضرات! شاید آپ میں سے بعض اصحاب کو یاد ہو کہ اسی امرتسر میں اور اسی احاطہ میں میں نے جلسۂ ندوۃ العلماء کے موقع پر تقریر کی تھی کہ شریعت اسلام کو خاتم شریعت کیوں کہتے ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الرسل کیوں مانتے ہیں، ہر چیز کا قاعدہ ہے کہ جب ترقی کرتے کرتے وہ درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے اور کوئی درجہ ترقی کا باقی نہیں رہتا تو وہ ختم ہوجاتی ہے۔ دنیا عالم ہے دو متناقص چیزوں کا، یعنی زوال و ترقی، حسن و قبح، شریعت اسلام کے خاتم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جتنی شریعتیں جتنے قانون، جتنے تمدن پہلے موجود تھے، وہ نامکمل و ناتمام تھے، اسلام نے ان کو کامل کردیا، اس لیے وہ ختم ہوگئے، یہی دعویٰ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی ہوا ہے، اس آیت شریفہ میں:

اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ .(مائدہ: ۵/۳)	''یعنی آج میں نے کامل کر دیا تمہارے لیے تمہارے دین کو اور پوری کر دی تمہارے اوپر اپنی نعمت۔''

اسلام سے پہلے موسوی اور عیسوی شریعتیں تھیں۔ان دونوں کے بعد شریعت اسلام قائم ہوئی،جس نے ان کی تاریکیاں اور کسریں پوری کر دیں، یہی صراط مستقیم ہے اور اسی کے متعلق ہر نماز میں دعا مانگتے ہیں:اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم.

اس امر کو مدنظر رکھ کر اب دیکھیے کہ عورتوں کے کیا حقوق تھے، جو پہلے ناقص تھے،جن کو اسلام نے کامل کر دیا اور وہ کیا افراط تھی،جس کو اعتدال حقیقی پر پہنچا دیا،آج یورپ کی تہذیب کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ گیا ہے،اس کے حقوق نسواں سے اسلامی حقوق نسواں کا مقابلہ کر کے دیکھیے تو معلوم ہو کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ کیسی فیاضی کا برتاؤ کیا ہے،اسلام کے لیے موجب ننگ ہے کہ اس کا مقابلہ اس قسم کی تہذیبوں سے کیا جائے۔

خطۂ یونان کی علمی وفلسفیانہ ترقیوں کا حال آپ کو معلوم ہے،ارسطو وغیرہ نے حکمت وفلسفہ میں کس قدر کمال پیدا کیا تھا۔سلطنت رومۃ الکبری لاء(قانون) بنانے میں بے مثل مانی گئی ہے۔ قانون داں حضرات جانتے ہیں کہ یورپ کے قانون کی بنیاد اسی رومن لاء پر قائم ہے،زمانہ قدیم میں ہندوؤں کی فلاسفی بھی بے انتہا ترقی کر گئی تھی،تمدن کے بہت سے نازک مسائل یہاں حل ہو گئے تھے،باوجود اس کے یونانیوں،رومیوں اور ہندوؤں کو عورتوں کے حقوق اور ان کی ترقی کے متعلق جو درجات حاصل ہوئے تھے،ان کو دیکھیے کہ کیسے ادنی ہیں،تاریخ موجود ہے اور ان اقوام کے دوستوں کی لکھی ہوئی ہے،مخالفوں کی نہیں مگر وہ تاریخ عورتوں کو ہر معاملہ میں مردوں کا پابند، دست نگر اور غلام دکھاتی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لفظ''رومن'' کے تحت عورتوں کی بابت بہت کچھ لکھا ہے۔اسے دیکھئے،آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپ میں پہلے بھی عورتوں کو بہت ہی کم حقوق دیے گئے تھے اور اب بھی کچھ ایسے زیادہ نہیں دیے گئے ہیں۔(۱۴)

آج کل فرانس کے ایک نامور پروفیسر نے دنیا کی سویلائزیشن پر ایک کتاب لکھی ہے، اس کا جو حصہ عورتوں کے حقوق کے متعلق ہے، وہ میں نے پڑھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں، رومیوں وغیرہ کے زمانہ میں یہ حالت تھی کہ عورتیں مردوں کی جائیداد منقولہ خیال کی جاتی تھیں، جیسے اسباب لکڑی یا ایسی ہی کوئی اور چیز۔

ہمارے نکتہ چیں ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ پردۂ نسواں اسلام نے رائج کیا اور یہ ایک بری رسم ہے، مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یونان میں عورتیں بالکل پردہ میں رکھی جاتی تھیں اور سواری وغیرہ میں بھی ان کا نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا، اس فرانسیسی مصنف نے لکھا ہے کہ عورتوں کی قبر پر کندہ کیا جاتا تھا، کہ ''یہ عورت تمام عمر گھر سے باہر نہیں نکلی......'' خیال کیجیے پردۂ اسلامی کی اس قید و بند کے سامنے کیا حقیقت ہے۔ رومن لا (قانون) میں عورتیں مثل دوسری جائیداد کے منتقل ہوسکتی تھیں اور خریدی جاسکتی تھیں۔

یہ ان کی پوزیشن تھی، افلاطون کا قول ہے کہ شادی بیاہ ایک مجبوری کی وجہ سے کیا جاتا ہے، کوئی خوشی کا مقام نہیں، ورنہ عورت ایسی چیز نہیں کہ مرد اس سے شادی کرے۔

انگلستان میں صدیوں تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ عورتوں میں روح نہیں ہے، ۱۵۸۵ء میں ایک کمیٹی اس امر کی تحقیقات کے لیے بیٹھی تھی کہ عورتوں میں روح ہے یا نہیں، اس کمیٹی نے بعد غور وخوض یہ فیصلہ صادر کیا کہ عورتوں میں روح تو ہے مگر اس لیے ہے کہ وہ مردوں کی تابعداری کریں۔

ہندوستان میں باوجود اس قدر ترقی کے عورتوں کی جو وقعت تھی، اس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ بڑی بڑی عورتیں جوئے میں ہار دی گئیں، دختر کشی کا رواج اس ملک کے بعض حصوں میں تھوڑے عرصہ پہلے تک موجود تھا اور اب بھی مقدمات ہوتے رہتے ہیں، عرب میں بھی دختر کشی کی رسم عام تھی، جس کے لیے اللہ پاک کو خاص طور پر ممانعت کرنی پڑی۔

عورتوں کو عرب کے لوگ اس قدر حقیر و ذلیل جانتے تھے کہ اگر کسی عرب سے یہ کہا جاتا تھا کہ تمہارے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ شرم کے مارے چھپتا پھرتا تھا۔ (۱۵)

غرض ساری دنیا میں عورتوں کی ایسی ہی حالت تھی، خود انگلستان میں کچھ عرصہ پہلے تک یہ

رسم تھی کہ شادی کے وقت بغیر عورت کی خواہش کے، اس کی جائداد شوہر کے نام منتقل ہو جاتی تھی، بروئے قانون وہ کوئی معاہدہ نہیں کر سکتی تھی، پارلیمنٹ انگلستان میں ایک ممبر نے تقریر کرتے ہوئے کہا گویا عورت شادی نہیں کرتی بلکہ جرم کرتی ہے، دیگر معاملات میں بھی عورت کی پابندی، ماتحتی کا یہی حال تھا، اب کچھ حقوق عورتوں کو عطا ہوئے ہیں، مگر غور کیا جائے تو وہ بھی ان حقوق کے برابر نہیں، جو دین اسلام نے عورتوں کو بخشے ہیں۔

اسلام ایک ریفارمیشن اور ایک تکمیل ہے، جس کا ثبوت اس کے احکام سے ملتا ہے۔ اب دیکھیے اسلام نے عورتوں کے لیے کیا کیا مسلمانوں نے کیا کیا......... میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں اور نہ اس کا ذمہ دار ہوں کہ مسلمان شعرا مسلمان مصنفوں سے اس کی پوزیشن دریافت کریں، وہ تو عورتوں کو اور ہی رنگ میں دیکھتے ہیں، مولانا جامی فرماتے ہیں:

اگر نیک بودے سر انجام زن
زنان را مزن نام بودے نہ زن

غنی کشمیری کہتا ہے:

زن از پہلوے چپ شد آفریدہ
کس از چپ راستی ہرگز نہ دیدہ

غرض اس قسم کے بہتیرے اقوال ہیں، مگر میں ان اشعار وخیالات کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اسلام میں بھی عورتوں کے کچھ حقوق ہیں، میں نے کہا بہت سے اور تمام مذاہب واقوام سے زیادہ، اس نے تعجب سے کہا پھر یہ انقلاب اور یہ بری کیفیت کیوں ہے؟ میں نے جواب دیا یہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ تیسری صدی ہجری میں ایک نامور محدث کہتے تھے کہ اگر حضرت رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں تشریف لائیں، تو مسلمانوں کو دیکھ کر دریافت فرمائیں گے یہ کون سی قوم اور کس کی امت ہے، ان محدث نے جب یہ لکھا تھا، اسے ساڑھے گیارہ سو برس گذر چکے ہیں، پھر اس وقت جو نہ ہو تھوڑا ہے، مسلمانوں کی حالت بالکل بدل گئی ہے، وہ دین کی راہ سے بہت دور جا پڑے ہیں، دیکھیے شرک وبت پرستی کو مٹانا

اسلام کا خاص مقصد تھا، مگر کون سی قوم ہے جو اب مسلمانوں سے زیادہ شرک میں مبتلا ہو، اس سے بڑھ کر شرک کیا ہوگا کہ ایک ایک ٹھیکری سے یہ بیٹا مانگتے ہیں۔ معاذ اللہ۔

پس مجھے مسلمانوں کے افعال و خیالات سے بحث نہیں، میں صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین کے افعال، حدیث نبوی وقرآن شریف سے عورتوں کے حقوق پیش کروں گا، میرا دعویٰ ہے کہ اگر دنیا کے تمام فلسفہ و مسائل حکمیہ کو لیا جائے اور عورتوں کی تعریف میں جو لٹریچر دنیا بھر کی زبانوں میں ہے، وہ اس حکمت وفلسفہ کے ساتھ جمع کیا جائے اور قرآن مجید کی اس آیت سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو وہ سب کچھ اس آیت سے دب جائے گا، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: **خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجاً** ......شاعرانہ پیرانہ میں کہا گیا کہ حضرت حوأ کو حضرت آدمؑ کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا، **لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا**......اس غرض سے کہ ''تم تسلی حاصل کرو اس سے......**وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً**......اور ڈالی گئی تم میں مودت ورحمت......یعنی آپس میں محبت و ہمدردی پیدا کی گئی، انسان کو اپنی اولاد یا کسی عزیز کے ساتھ جو تعلق ہے وہ رحمت کا تعلق ہے، اپنے گہرے دوست کے ساتھ جو تعلق ہے، وہ محبت کا تعلق ہے، مگر یہاں دیکھیے کہ دونوں قسم کے تعلقات کا مجموعہ ہے، جب مودت ورحم ہے تو اس کے بعد تمام نتائج پیدا ہو سکتے ہیں، مقدم ان کی موجودگی ہے۔(۱۶)

حدیث شریف میں عورتوں کو قواریر سے تشبیہ دی گئی، ساربان زنانہ سواری کا اونٹ تیز چلا رہا تھا، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ''شیشے ہیں ان کو ٹھیس نہ لگ جائے۔(۱۷) محبت کا تعلق جذبات سے ہے، اس کو قانون نہیں کہہ سکتے، اب دیکھنا یہ ہے کہ قانون حقوق نسواں کی بابت کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ**......صرف یہی آیت عورتوں کے حقوق تمام باتوں میں مردوں کے برابر قرار دینے کو کافی ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا، مگر قرآن پاک نے مزید تشریح کی ہے، دوسرے مذاہب میں عورتوں کے کوئی حقوق نہ تھے، وہ مردوں کی پابند و دست نگر تھیں، کہا گیا ہے کہ مردوں کو وہ ملے گا جو وہ کمائیں، عورتوں کو وہ ملے گا جو ان کی مائیں چھوڑ جائیں، اسی طرح عورتوں کو اس سے ثابت ہوا کہ عورت کسی مال ومتاع کی مستقل وراثت ہو سکتی ہے اور اسے اپنی اولاد کے لیے چھوڑ سکتی ہے۔

اب لیجئے عورتوں کی پوزیشن، اس کی بابت فرمایا: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۱۸) وہ لباس ہیں تمہارے لیے تم لباس ہو ان کے لیے...... یہاں بھی مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہیں، کسی کو کسی پر وجہ ترجیح نہیں، ایک اور آیت اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ (۱۹) سے عورتوں کی پستی کا استدلال کیا جاتا ہے کہ اسلام نے مردوں کو غالب کیا ہے عورتوں پر، مگر یہ ایک بدیہی بات ہے کہ عورتوں کی جسمانی قوت مردوں کی جسمانی قوت سے کم ہے، یہ بات سب کو نظر آرہی ہے اگر یورپ اس کا انکار کرتا ہے تو اندھا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ طاقت جسمانی میں دونوں برابر تھے، مگر پردے کی وجہ سے عورتوں میں ضعف آتا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کو چھوڑ کر اور جانوروں کو دیکھیے، ان میں بھی یہی فرق موجود ہے، مثلاً مرغ اور مرغی، گائے اور بیل، غرض کہ حیوانات میں ہر جگہ نر مادہ سے طاقتور ہے، پھر کلام مجید میں اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ...... کیوں کر غلط ہو سکتا ہے (اس موقع پر کسی صاحب نے ایک پرچہ مولانا شبلی صاحب کو دیا، جسے پڑھ کر مولانا نے فرمایا) کہا جاتا ہے:

[۱] وراثت مردوں کو عورتوں سے دوگنی ملتی ہے۔[۲] شہادت کے معاملہ میں ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کے برابر مانی جاتی ہے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردوں کے حقوق اسلام میں عورتوں سے زائد ہیں لیکن درحقیقت عورت کی اس میں ذرہ برابر بھی حق تلفی نہیں ہوتی۔ اگر غور و انصاف سے دیکھا جائے تو عورت کو مرد کے برابر درجہ ملتا ہے، بلکہ وہ فائدے میں رہتی ہے، کیونکہ نصف تو شرعی قاعدے سے ملتا ہے اور باقی اس کی زندگی بھر کا نان نفقہ مرد پر فرض کیا گیا ہے، پھر نصف حصہ علاحدہ رہا اور مہر علاحدہ، جس کی عورت مستحق ہوتی ہے، بہ مقابلہ اس کے مرد جو بہ ظاہر دوگنا حصہ پاتا ہے، وہ اپنے اور اپنے ساتھ ایک یا زدہ عورتوں کے گذارہ کی فکر کرتا ہے، سوچئے کون فائدہ میں رہا۔

رہا شہادت کا معاملہ اس کے متعلق فقہ میں وارد ہوا ہے کہ جو معاملات ایسے ہیں جن کا تعلق عورتوں سے ہے، ان میں عورتوں کی شہادت کم معتبر و کم وزن رکھی گئی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں اکثر گھروں میں رہتی ہیں، ان کو باہر کے معاملات کو دیکھنے اور سمجھنے کا وہ موقع نہیں ملتا جو

مردوں کوملتا ہے، اس لیے ان کی گواہی بہ مقابلہ مردوں کے یقیناً کم وزن مانی جائے گی۔

دیکھئے مجلسی امور میں مردوں کے درمیان امتیاز ہوتا ہے، بڑے بھائی کو چھوٹے بھائیوں پر ترجیح ہوتی ہے، مگر قانونی حقوق میں ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں، یہ اسلامی قانون ہی کا شرف کہ اس نے تمام نقصوں کو مٹا دیا ہے اور عورتوں کے پورے حقوق قائم کر دیے ہیں، دوسری اقوام اپنے ہاں یہ بات نہیں دکھا سکتیں، عموماً چھوٹی باتوں سے بڑی باتوں کا پتہ لگتا ہے، دیکھئے یورپ میں عورت کو مس و مسز (Miss or Mrs) کہتے اور باپ یا شوہر کا نام اس کے بعد لگاتے ہیں، گویا عورتوں کا کوئی خاص نام اور جداگانہ حیثیت ہی نہیں، یہ بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے، جب کہ عورت مردوں کی جائداد سمجھی جاتی تھی۔

اسلام نے عورتوں کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ مذہبی فرائض و مذہبی ارکان میں بعض فرائض و ارکان صرف عورتوں کی وجہ سے داخل ہیں، مثلاً طواف اور حج میں صفا و مروہ (۲۰) کے درمیان سعی کرنا یہ یادگار ہے حضرت ہاجرہ علیہ السلام (۲۱) کی دوڑ دھوپ کی، جب وہ پانی کی تلاش میں دوڑتی پھرتی تھیں اور جب تک حضرت اسماعیل علیہ السلام (۲۲) پر آپ کی نگاہ پڑتی رہتی تھی، تو ذرہ آہستہ چلتی تھیں اور جب آپ کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتے تھے تو بے تابانہ دوڑتی تھیں، اب یہ مسلمانوں کا ایک مذہبی شعار قرار پا گیا ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ نسا موجود ہے، مگر سورہ رجال کوئی نہیں، ہاں انبیا کے نام پر متعدد سورتیں موجود ہیں، مگر ان کے بالمقابل ایک سورہ حضرت مریم علیہ السلام (۲۳) کے نام پر بھی ہے، قرآن شریف میں دو قسم کی آیات ہیں۔ محکمات اور متشابہات۔ ان میں محکمات زیادہ ضروری مانی جاتی ہیں اور ان کو ''ام الکتاب'' کہا جاتا ہے، ابوالکتاب نہیں، اسی طرح مکہ معظّمہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے، ابوالقریٰ نہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام تعظیم وتکریم کو عورتوں سے کتنا منسوب کرتا ہے۔

اسلام کے قریب زمانہ میں جو عورتیں پیدا ہوئیں ان کو ہر قسم کے حقوق عطا ہوئے، وہ معاشرت و تمدن میں برابر کی شریک رہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں انھوں نے کمال حاصل کیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، تو ام المومنین حضرت عائشہ

رضی اللہ عنہا (۲۴) نے فرمایا، پہلے قاتلان عثمان کو پکڑنا اور ان سے قصاص لینا چاہیے۔اس امر پر حضرت امیرؓ سے ان کی خط و کتابت ہوتی رہی اور جب مقصد حاصل نہ ہوا تو ہزاروں آدمیوں کے ساتھ انھوں نے لڑائی کی، جس کو ''جنگ جمل'' کہتے ہیں، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کہ کون برسرحق تھا، بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ عورتیں لڑائیوں میں شریک ہوئیں اور افسر بنیں، اس قت سیکڑوں صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین ان کے ساتھ تھے، مگر کسی نے ان کو نہیں روکا، اس وقت جو جماعت آپ کی محافظ تھی، اس کو آج تک عرب میں عزت سے یاد کیا جاتا ہے، وہ لوگ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بیچ میں لیے ہوئے تھے اور یہ رجز پڑھتے تھے۔ ''ہم ہیں اونٹ والے، موت ہمارے لیے شہد ہے، واپس دو ہمارے شیخ عثمانؓ مظلوم کو، پھر کوئی جھگڑا نہیں......(۲۵)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنینؓ کے میدان جنگ میں تشریف لانے میں کوئی نرالی بات نہ معلوم ہوتی تھی، بلکہ وہ ان کے محافظ ہونے کی عزت پر فخر کرتے تھے، اگر آغاز اسلام کی تاریخ کو غور سے پڑھا جائے اور تحقیق کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین کی قابلیت ثمرہ تھی ان حقوق کا جو اسلام نے دیے تھے اور جن سے عورتوں نے بھی پورا حصہ پایا تھا، حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنینؓ نے حدیث کے متعلق نہایت باریک بحثیں کی ہیں اور نازک معاملات میں معقول توجیہات پیدا کر دکھائی ہیں۔

تحقیق احادیث کے دو طریقے ہیں: [۱] سلسلہ روایات جس میں راویان حدیث کے کذب و صدق کا ان کے حالات زندگی سے امتحان کیا جاتا ہے اور اس کے مطابق حدیث کو معتبر یا غیر معتبر گردانا جاتا ہے۔[۲] درایت جس میں عام حالات و امکان عقلی کے لحاظ سے حدیث پر غور کیا جاتا ہے، علامہ ابوالفرج ابن جوزی نے فن درایت پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جس میں حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین کو سب سے بڑا محقق تسلیم کیا گیا ہے اور درحقیقت درایت کا ثبوت جیسا کہ ام المومنین کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے، ایسا کسی سے نہیں ملتا، اگر صحابہ آنحضرت (ﷺ) سے روایت کیا کرتے تھے، مگر حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنینؓ انکار کر دیتی تھیں اور اپنے انکار کی وجہ ایسی معقول بتاتی تھیں کہ ان کو قائل ہو جانا پڑتا تھا۔

جب حدیث "**ان المیت یعذب ببکاء اھلہ**......(میت پر عذاب ہوتا ہے، اس کے رشتہ داروں کے رونے سے) بیان کی گئی تو ام المومنینؓ نے فرمایا کہ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا، قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ......(۲۶) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے خلاف کس طرح کہہ سکتے تھے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ کا گذر یہودیوں کے محلّہ کی طرف ہوا تو آپؐ نے ملاحظہ فرمایا کہ کسی کے یہاں میت ہوگئی تھی اور یہودی رو رہے تھے، اس پر آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو رو رہے ہیں اور مردہ پر عذاب ہو رہا ہے۔ (اسی طرح ایک اور واقعہ مولانا نے بیان فرمایا جس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیث "**ھل اخذتم ما فعلتم** ......کی تصحیح فرمائی تھی اور کہا تھا کہ صحیح ہے...... **ھل علمتم ما فعلتم**......)

اس زمانہ میں عورتوں نے مختلف علوم وفنون میں جو ترقی کی تھی اس کا ایک ادنی اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ ''بلاغات النساء'' نام کی ایک کتاب احمد بن طاہر بغدادی (۲۷) نے [جو ۲۰۲ ہجری میں پیدا ہوا تھا] لکھی ہے، جس میں صرف مسلمان عورتوں کے لکچرز درج ہیں، اہل اسلام میں عورتیں ایسی اسپیکر تھیں کہ لوگوں کو تقریروں کے فراہم کرنے کا بھی خیال پیدا ہوا، مگر یورپ میں صرف عورتوں کی اسپیچوں پر کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

اس موقع پر سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ امام غزالی، امام رازی کا نام سنتے ہیں، مگر کسی عورت کا نام ان کاموں کے متعلق سننے میں نہیں آیا لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام دراصل عورتوں کے دائرہ اثر سے باہر تھے اور یورپ میں بھی آج تک ہیں۔

ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ عورتوں میں عقل کم ہوتی ہے، میں نے جواب دیا کہ اگر دس برس تک تمہیں بھی پردہ میں بٹھایا جائے تو تمہاری عقل بھی گھٹ جائے گی، عورتوں کی مارل فورس (اخلاقی قوت) جیسی بڑھی ہوئی تھی اور جس طرح وہ سچ بات کے کہنے میں دلیر ہوتی تھیں، اس کا ایک یہ واقعہ شاہد ہے کہ ہندہ (۲۸) جب قبول اسلام کے بعد رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آئیں اور عرض کی کہ ''کیا اقرار مجھے کرنا چاہیے تو آپؐ نے انھیں احکام دین تعلیم فرمائے کہ بدچلنی نہ کرو، خیانت نہ کرو، اسی کے ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ ''اپنی اولاد کو قتل نہ کردیا کرو''

اس پر فوراً انھوں نے کہا ''ہم نے تو ان بچوں کو پالا تھا، آپؑ نے ان کو قتل کیا'' اب وہ اور آپ سمجھ لیں''، دیکھئے کس بے باکی سے اس نے اپنے قبیلہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سابق معرکہ آرائی کا حوالہ دیا اور آپؑ نے کیسے ٹھنڈے دل سے سنا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (۲۹) جنھیں خلیفہ پنجم مانا جاتا ہے اور جو نہایت زاہد و متقی اور احکامِ خدا و رسولؐ کے پابند تھے، جب امیر حجاج بن یوسف (۳۰) نے مکہ کا محاصرہ کیا اور آپ کے رفقاء کچھ لڑائی میں کام آئے اور بہت سے دشمن سے جا ملے، بہت ہی تھوڑی تعداد آپ کے پاس رہ گئی اور صورت دگرگوں ہوئی تو اپنی والدہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ عبدالملک کی بیعت قبول کرلوں، یا لڑ کر جان دوں؟۔ ان کی والدہ ماجدہ نے محبت فرزندی سے بالکل قطع نظر کر کے جواب دیا کہ اگر تو حق پر تھا تو اب بھی حق کی پیروی کر اور اگر باطل پر تھا تو جس قدر جلد ممکن ہو اسے چھوڑ دے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا کہ جان دینے سے مجھے خوف نہیں، مگر اس کا ڈر ہے کہ حجاج میرا مثلہ کرائے گا (یعنی کان ناک وغیرہ کٹوا کر ہیئت بگاڑ دے گا۔) ان کی والدہ نے کہا کہ جب بھیڑ ذبح ہو جاتی ہے تو اسے کان وغیرہ کٹنے کی کیا پروا رہتی ہے؟ پس مرنے کے بعد مثلہ کا تجھ پر کیا اثر پڑے گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی ماں کی نصیحت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے قبول اطاعت کا خیال اپنے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ چلتے وقت جب والدہ نے ان کو گلے لگایا تو ان کے جسم پر کپڑوں کے نیچے کوئی سخت چیز معلوم ہوئی۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا زرہ ہے۔ ان کی والدہ نے کہا جو مرنے کے لیے جاتا ہے وہ زرہ نہیں پہنتا۔ آپ نے فوراً زرہ اتار ڈالی اور آخر تک اپنے دعویٰ پر ثابت قدم رہے، پھانسی کے بعد لاش ورثا کو دیدی جاتی ہے، مگر حجاج بن یوسف نے حکم دیا تھا کہ جب تک حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ خود لاش نہ مانگیں، وہ اسی طرح لٹکی رہے، جناب سیدہ اسماءؓ بنت ابی بکر والدۂ حضرت عبداللہؓ نے لاش نہ مانگی، کئی روز کے بعد آپ کا ادھر سے گذر ہوا، جہاں سولی پر حضرت عبداللہؓ کی لاش لٹکی تھی، آپ نے اسے دیکھ کر ایک موثر جملہ کہا جس کے معنی یہ ہیں ''کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ یہ شہسوار اپنے گھوڑے سے اتر آئے۔'' (۳۱)

حضرات! یہ تھا اسلام کا تمدن اور یہ تھا ان حقوق کا اثر جو اسلام نے عورتوں کو دیے تھے، مسلمانوں کی حالت میں فرق اس لیے پڑا کہ خلفائے امویہ نے دمشق وشام کو اپنا صدر مقام بنالیا، جہاں ایرانی تمدن کا اسلام پر گہرا اثر پڑا، ورنہ ہمارا تمدن وہ ہے جو عربی تمدن تھا اور جس میں عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر ہیں۔

عورتوں کو اسی حد تک تعلیم دی جاسکتی ہے جس حد تک مردوں کو، اس لیے مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ لڑکیوں کے لیے الگ کورس ہو اور لڑکوں کے لیے الگ، میرے خیال میں دونوں کا نصاب تعلیم یکساں ہونا چاہیے، جہاں میں اس کا زبردست حامی ہوں کہ عورتوں کو وسیع حقوق دیے جائیں اور آج کل جو گھروں میں عورتیں مثل لونڈیوں کے ہوتی ہیں، اس کی اصلاح کی جائے اور عورتوں سے بہ طریق مساوات سلوک کیا جائے وہاں میں اس کا سخت مخالف ہوں کہ عورتوں کی پردہ شکنی ہو، یہ ہرگز ہرگز قرین مصلحت نہیں۔

اسلام کی تہذیب، اسلام کا تمدن، اس بات کو موید ہے کہ عورتیں پردہ کریں، عورتوں کی فطرت میں یہ مادہ ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ مردوں سے محجوب ہوں، ان کو حجاب سے نکالنا گویا ان کی فطرت کو بدلنے کی کوشش کرنا ہے پردے عورتوں کے مختلف قسم کے ہیں اور وہ خاوندوں اور باپوں سے بھی پردہ کرتی ہیں، پردہ شکن لوگ عورتوں کی خلقت وفطرت پر غور نہیں کرتے، ورنہ وہ ہرگز اس بات پر مصر نہ ہوں، خصوصاً جو لوگ مسلمانوں میں عورتوں کے چہرہ دکھانے کی تائید کرتے ہیں وہ تاریخ اسلام کے اور شرع کی منشا سے ناواقف ہیں، ہاں چار دیواری کے اندر ہر وقت محصور رکھنا بھی اچھا نہیں اس بارے میں ترکوں کی مثال قابل پیروی ہے، میں نے بڑے غور وخوض کے بعد یہ بات محسوس کی ہے کہ اگر دنیا کی کسی قوم نے عورتوں کے متعلق اعتدال قائم کیا ہے تو وہ ترک ہیں، اگر شیخ عبداللہ بھی پردہ کے معاملہ میں مجھ سے متفق ہوں تو میں ان کی تائید کرتا ہوں۔ ورنہ نہیں۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ پردۂ نسواں کو توڑ کر وہ ہرگز کسی فلاح کو نہیں پہنچ سکتے۔'' (۳۲)

یہ تقریر بشیر مہدی حسن نے تعلیقات وحواشی کے ساتھ سہ ماہی فکر ونظر اسلام آباد جولائی۔

ستمبر ۱۹۸۶ء میں شائع کرائی تو دارالمصنّفین نے اسے ''خطبات شبلی'' میں شامل کیا۔ جناب بشیر مہدی حسن نے اس پر جو حواشی لکھے ہیں انہیں بھی ہو بہو شامل کیا گیا، مگر ان کے نام کی صراحت نہیں کی گئی۔ اور نہ دیباچے میں اس کا ذکر کیا گیا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اضافہ کس نے کیا۔ بلاشبہ حقوق نسواں پر یہ بے حد اہم تقریر ہے۔

تعلیقات و حواشی:

(۱) حادثہ پا: علامہ شبلی ندوہ سے وطن اعظم گڑھ آئے ہوئے تھے۔ اور شبلی منزل میں اپنے اکلوتے بیٹے حامد حسن نعمانی کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ اس وقت شبلی منزل باغ کے درمیان واقع تھی، جس میں جھنڈ کے جھنڈ کوے آتے تھے اور باغ کو نقصان پہنچاتے۔ ان کو بھگانے کے حامد حسن نعمانی فائر کرتے تھے۔ بھری ہوئی بندوق مردانہ میں رکھی ہوئی تھی اور حامد حسن شہر میں کہیں گئے ہوئے تھے۔ علامہ نے اپنی بہو سے بندوق اندر رکھنے کو کہا۔ انہوں نے اٹھایا تو بھری ہوئی بندوق بے خیالی میں چل گئی اور گولی علامہ کی پنڈلی میں لگی۔ زخم اتنا کاری تھا کہ ہڈی چور چور ہوگئی اور اسے کاٹنا پڑا۔ یہ ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کا واقعہ ہے۔ اس کی تفصیل انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو ایک خط میں لکھی ہے، جسے شروانی صاحب نے اپنے مضمون میں جو علامہ شبلی کی وفات پر لکھا تھا اور جواب مقالات شروانی میں شامل ہے، نقل کیا ہے۔

پاؤں کٹ جانے کے بعد مصنوعی پاؤں لگایا گیا۔ اسی کے سہارے انہوں نے بقیہ زندگی گذاری بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی سے عذر لنگ نہیں کیا اور ملت کے لئے متعدد شہروں اور تمام صوبوں کا سفر کیا۔ حتیٰ کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ تک گئے۔

(۲) ڈاکٹر رجب علی بمبئی کے ایک بڑے مشہور سرجن تھے۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ممبئی میں ان کے نام سے ایک کالج اور ایک روڈ منسوب ہیں۔ مولانا حالی کے اس خط سے معلوم ہوا کہ حادثہ پا کے بعد علاج اور پاؤں بنوانے کے لئے ڈاکٹر رجب علی نے علامہ شبلی نعمانی کو ممبئی بلایا تھا۔ اور پہلا پاؤں غالباً انہیں کے مطب میں بنایا گیا۔ وہ جب تکلیف دینے لگا تو دوسرا پاؤں حیدر آباد میں نواب افسرالملک بہادر نے بنوایا۔ اسی دن اتفاقاً نواب صاحب کو ''سر'' کا خطاب ملا تو علامہ شبلی نے ان سے مزاحاً تھا کہا کہ

''نواب صاحب آپ نے مجھ کو پاؤں دیا تو خدا نے آپ کو سر دیا۔ (حیات شبلی ص ۳۷۳-۳۷۴)

(۳) روداد محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشن کانفرنس ۱۹۰۸ء ص ۲

(۴) روداد محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشن کانفرنس ۱۹۰۸ء ص ۲۲۴-۲۲۵

(۵) نور احمد نور: یہ کانفرنس کے شرکاء میں تھے۔ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

(۶) روداد محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشن کانفرنس ۱۹۰۸ء ص ۲۲۴-۲۲۵

(۷) آثار شبلی ص ۳۶۲-۳۷۰

(۸) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، امرتسر ۲۷ تا ۲۹ ردسمبر ۱۹۰۸ء، ص ۷

(۹) شیخ محمد عبداللہ پاپا میاں [۱۸۷۴-۱۹۶۵ء] کا شمار سرسید تحریک کے ممتاز اشخاص میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۹۱ء میں ۱۷ سال کی عمر میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور بی اے، ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ ان کا بڑا کارنامہ تعلیم نسواں کے لئے جدوجہد ہے۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم نسواں کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی مقصد کی حصولیابی کے لئے ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ سے رسالہ خاتون جاری کیا۔ انہوں نے خواتین کی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں اسکول قائم کیا۔ وہی اسکول ہے جو آج مسلم یونیورسٹی کا ویمنس کالج کہلاتا ہے جس سے ہزاروں تشنگان علم خواتین سیراب ہو رہی ہیں۔ شیخ عبداللہ نے ۹۱ سال کی عمر میں ۱۹۶۵ء میں وفات پائی۔ علامہ شبلی کے شاگرد تھے۔ [شبلی خود نوشتوں میں ص ۷۹ تا ۸۹]

(۱۰) روداد محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشن کانفرنس ۱۹۰۸ء ص ۲۲۴-۲۲۵

(۱۱) روم: ۳۰/۲۱ آیت کا آخری حصہ ان فی ذالک......الخ تقریر میں درج نہیں (بشیر مہدی حسن)

(۱۲) چنگیز خاں [۱۱۶۲-۱۲۲۷ء] ایک منگول حکمراں اور بڑا جنگ جو تھا۔ اس نے ۱۳ ربرس کی عمر میں منگولوں کو منظم اور متحد کیا اور تمام منگول سرداروں نے اسے اپنا حکمراں تسلیم کیا۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی فوج تشکیل کی اور منگول سرحدوں کو وسیع کرنے کے لئے نکل پڑا۔ دو برس تک مسلسل معرکہ آرا رہا۔ چین کی چن سلطنت پر حملہ کیا اور اسے تباہ و برباد کر دیا پھر بیکنگ پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد بخارا، مرو اور ہرات کو لوٹا اور تباہ و برباد کیا۔ خوارزم شاہی حکومت کو شکست فاش دی۔ اور بڑی بربریت اور سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے تقریباً مٹا ڈالا۔ آخر میں چین کی سرحدی ریاست ہسیا پر حملہ آور ہوا۔ اسی جنگ کے دوران

۱۸؍اگست ۱۲۲۷ءکو وہ مرگیا۔عرصہ تک اس کی تباہی و بربادی اور سفا کی کے قصے زبانوں پر رہے۔

(۱۳) صحیح مسلم کتاب الفضائل صفحہ نمبر۸۰۰(طبع دہلی جلد دوم،م۱۹۳۷ء اڈیشن)بشیر مہدی

(۱۴) *Encyclopaedia Britanica, vol. 23, pp. 702-712*

(۱۵) نحل: آیت:۸۵-۵۹(بشیر مہدی حسن)

(۱۶) روم آیت نمبر۲۱ قرآن کا لفظ سکون ، اپنے اندر جہان معنی پوشیدہ رکھتا ہے،امام راغب اصفہانی نے"المفردات فی غریب القرآن" میں اس کے معنی سے بحث کرتے ہوئے اس کے دو مفہوم متعین کئے ہیں،ایک ثبوت الشی بعد تحرک،یعنی ہیجان اور حرکت کے بعد کسی چیز کا قرار وثبات حاصل کر لینا، دوسرے استیطان یعنی گھر بسانا،سکونت اختیار کرنا۔ لِتَسۡکُنُوۡا اِلَیۡهَا میں لفظ سکون کے یہ تمام مفہوم مضمر ہیں،عورت ہی کے دم سے گھروں کی آبادی ہے، اسی کے دامن میں قرار وثبات ہے، اسی کا وجود وجہ طمانت وسکون ہے۔

لفظ مودۃ کے مادہ ، ودد کی تشریح کرتے ہوئے امام اصفہانی فرماتے ہیں کہ مودت محض محبت نہیں، بلکہ آرزو بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں محبت نہیں مودت کو شامل کیا ہے جو جذبۂ محبت کا مکمل ترین مظہر ہے، چنانچہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:انَّ رِبّـی رَحِیۡمٌ وَّدُوۡد. (سورہ ہود: آیت۹)سید قدرت اللہ فاطمی خاندانی منصوبہ بندی کا قرآنی تصور مقالہ فکر ونظر دسمبر ۱۹۶۸ ص۴۲۶-۴۲۷ (بشیر مہدی)

(۱۷) صحیح مسلم ج۲ کتاب الفضائل ص۲۹۷، مطبوعہ مصر۔(بشیر مہدی حسن)

(۱۸) بقرہ: آیت ۱۸۷(بشیر مہدی حسن)

(۱۹) سورہ نساء آیت نمبر۲۴(بشیر مہدی حسن)

(۲۰) صفاومروہ: دو پہاڑیوں کے نام ہیں جن پر حضرت ہاجرہ علیہا السلام پانی کے لئے بار بار گئیں۔ بالآخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پیروں کی رگڑ سے زمزم کا چشمہ ابلا جو آج تک سیراب کر رہا ہے۔

(۲۱) حضرت ہاجرہ علیہا السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ تھیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے خاندان سے ہیں۔

(۲۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔

ذبیح اللہ ان کا لقب ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر میں یہ بھی شریک تھے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آزمائش کے لئے خدا کی راہ میں اپنی سب سے قیمتی متاع قربان کرنے کا حکم دیا اورانہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بتایا کہ ایسا میرے رب کا حکم ہے تو وہ قربان ہونے کے لئے فوراً راضی ہوگئے ۔یہ تاریخ انسانی کا انتہائی اہم واقعہ ہے۔اوراسی سے اسلام میں قربانی کا آغاز ہوا۔

(۲۳) حضرت مریم علیہا السلام: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ۔

(۲۴) ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریک حیات جوخلیفہ اول حضرت ابوبکرصدیقؓ کی صاحبزادی تھیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے برسوں بعد وفات پائی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ایک خاتون میں جتنی حیثیتیں ہوتی ہیں وہ سب حضرت عائشہ کی زندگی میں موجود ہیں۔اسی لئے ان کی سیرت خواتین کے لئے نمونہ قرار دی جاتی ہے۔

(۲۵) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے یہ اصل اشعار یوں نقل کئے ہیں:

نحن بنو ضبة اصحاب الجمل　　الموت اعلا عندنا من العسل

نحن بنو الموت اذا الموت نزل　　ننعی ابن عفان باطراف الاسل

ردوا علینا شیخنا ثم بجل

ہم ضبہ کے بیٹے اور اس کے اونٹ کے پاسبان ہیں،موت ہمارے نزدیک شہد سے زیادہ شیریں ہے،ہم موت کی آغوش میں پلے ہیں،جب موت اترتی ہے،ہم ابن عفانؓ (سیدنا عثمانؓ) کی موت کی خبر کا اعلان نیزوں کی نوک سے کرتے ہیں،ہمارے سردار کو واپس کردو،پھر کوئی بات نہیں۔

(سید سلیمان ندویؒ،سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا،کراچی ۱۹۶۷ء ص ۱۴۱(بشیر مہدی حسن)

(۲۶) مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس استدلال کو سنا تو کچھ جواب نہ دے سکے،سیرت عائشہ کراچی ۱۹۶۷ء ص ۱۹۴۔یہ واقعہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الجنائز ص ۳۱۷ پر درج کیا ہے۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْریٰ. النجم /۳۸.

(بشیر مہدی حسن)

(۲۷)　احمد بن طاہر بغدادی:

(۲۸)......ان کا نام ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس ہے، حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں، علم و دانش کے لحاظ سے قریش کی ممتاز ترین خاتون تھیں، فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا اور ثابت قدم رہیں۔ اسلمت فی الفتح بعد اسلام زوجھا ابی سفیان بلیلۃ وحسن اسلامھا۔ پھر گھر میں تشریف لائیں اور اس بت کے ٹکڑے کر دئے، جس کی زمانۂ جاہلیت میں پوجا کرتی تھیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ: **یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَاَرْجُلِھِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَکَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْھُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَھُنَّ اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ** (الممتحنہ/۱۲) یعنی اے نبی جب تمہارے حضور مسلمان عورتیں حاضر ہوں، اس پر بیعت کرنے کو کہ اللہ کا کچھ شریک نہ ٹھہرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، جسے اپنے ہاتھوں اور پانوں کے درمیان یعنی موضع ولادت میں اٹھائیں اور کسی نیک بات میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لو اور اللہ سے ان کی مغفرت چاہو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ شرک کرنے کے متعلق سیدہ ہندہؓ نے عرض کی **کیف نطمع ان نقبل منا مالم تقبلہ من الرجال** یعنی جو مردوں کے لیے روانہیں، ہم اس کی طمع کیوں کر کریں گے، چوری کرنے کے بارے میں عرض کیا کہ ''ابوسفیان رضی اللہ عنہ مال کو روک لینے والے آدمی ہیں کیا بہ قدر ضرورت لینا جائز ہوگا۔......
ابوسفیان نے خود ہی اس کی اجازت دے دی، امام مسلم لکھتے ہیں: کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ ہندہؓ کو خصوصی اجازت فرمائی (جلد دوم، کتاب الاقضیہ ص۳۲-۴۳۱) بدکاری کرنے کے متعلق ہندہ نے نہایت حیرانی سے عرض کی کہ کیا آزاد اور شریف خاتون ایسا کر سکتی ہے، اولاد کو قتل کرنے کے متعلق انھوں نے کہا: **ربیناھم صغاراً و قتلتھم کبارا یوم بدر** ۔ یعنی ہم نے اپنی چھوٹی اولاد کو پالا تھا جب بڑے ہوئے تو آپ نے انھیں میدان بدر میں قتل کر دیا، اس برجستہ جواب پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بے اختیار ہنس پڑے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی تبسم فرمایا: نافرمانی نہ کرنے کے متعلق کہا کہ اس بابرکت مجلس میں ہم حلف فرماں برداری کے لیے ہی تو حاضر ہوئی ہیں، اس کلام سے سیدہ ہندہ رضی اللہ

عنہا کے اخلاص، دیانت داری صاف گوئی اور بہادری کا علم ہوتا ہے۔ لَا تَرْفَعُوا اَصْواتَکُم کو بطور دلیل اس لیے پیش نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ابھی تک آپ اس آیت کی مکلّف ہی نہیں ہوئی تھیں، سیدہ ہندہؓ نے جنگ یرموک میں شرکت کی اور واپسی پر ۱۴ ہجری میں انتقال کیا۔ (رضی اللہ تعالی عنہا) (الف) اسد الغابہ جلد پنجم، ص ۵۶۳۔ تحت ہند بنت عتبہ (ب) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد ہفتم ص ۱۵ تحت ۱۴ھ جلد چہارم ص ۳۱۹ تحت فتح مکہ۔ (ج) ابن سعد: طبقات جلد ہشتم ص ۱۷۱ تحت ذکر بنت عتبہ بلاذری، فتوح البلدان تحت یوم یرموک ص ۱۴۱-۱۴۲۔ ہٹی رقم طراز ہیں:

In the battle of Yarmuk certain Moslem women took part and fought violently. Among them was Hind, daughter of Utbah .... "Cut the arms of these uncircumcised with your swords", Hitti, Philip: The origin of the Islamic state being a translation of Kitab Futuh albuldan (Khayats Beirut, 1966, PP.107-8)

(۲۹) حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ [۶۲۴-۶۹۲ء] کے والد حضرت زبیرؓ بن عوام [۵۹۴-۶۵۶ء] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو اموی حکمراں عبدالملک بن مروان [۶۴۶-۷۰۵ء] نے حجاج بن یوسف [۶۶۱-۷۱۴ء] کو ان سے بیعت لینے کے لئے بھیجا اور یہ بھی کہ قبول نہ کرنے کی صورت میں اعلان جنگ ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ [۶۲۴-۶۹۲] کو خانہ کعبہ میں محصور ہونا پڑا اور پھر فوج بے دیں نے کعبہ ملت کا محاصرہ کرلیا۔ آخر کار حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اپنی والدہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ کی خدمت میں گئے اور بقول علامہ شبلی:

جا کے کی عرض کہ اے اخت حریم نبوی
نظر آتے نہیں اب حرمت دیں کے آثار
آپ فرمایئے اب آپ کا ارشاد ہے کیا
کہ میں ہوں آپ کا اک بندہ فرماں بردار
صلح کرلوں کہ چلا جاؤں حرم سے باہر
یا یہیں رہ کے اسی خاک پہ ہو جاؤں نثار

بولیں وہ پردہ نشیں حرم سر عفاف
حق پہ گر تو ہے تو پھر صلح ہے مستوجب عار

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ والدہ سے اجازت ملنے کے بعد میدان کارزار میں آئے اور پھر جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

(۳۰) حجاج بن یوسف: حجاج بن یوسفؒ [۶۶۱-۷۱۴ء] جنہوں نے قرآن مجید پر اعراب اور نقطے لگوائے ہیں، ان کے اور بھی عظیم الشان اور قابل ذکر کارنامے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ محمد بن قاسم کو سندھ کی فتح اور دشمنوں کی سرکوبی کے لئے انہی نے بھیجا تھا، مگر مورخین نے ان کی سفاکی اور بے رحمی کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے جنگ اور پھر ان کا بے رحمی سے قتل (شہادت) بھی ان کے نامہ اعمال میں کسی سیاہ داغ سے کم نہیں۔ علامہ شبلی نے اس واقعہ کو ایک نظم ''خواتین عرب کا ثبات واستقلال'' میں منظوم کیا ہے۔

(۳۱) شاہ سوار والی روایت تاریخ یعقوبی جلد دوم ص ۳۲۰ پر موجود ہے، اخبار الطّوال میں اس کا کچھ تذکرہ نہیں ہے، اگر چہ آپ کی شہادت کے واقعات بہ تفصیل درج ہیں (باب قتل ابن زبیر رضی اللہ عنہ ص ۳۴-۵۳۱ اردو ترجمہ الاخبار الطّوال) فلپ، کے ہٹی نے اپنی کتاب (History of the Arabs) میں البتہ طبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے ان کا سر کاٹ کر دمشق بھیج دیا گیا اور جسم بقیہ کو سولی پر لٹکا دیا گیا: Hitti, Philip, History of the Arabs, London, 1961 (Seventh Edition) P. 199. (بشیر مہدی حسن)

(۳۲) رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، امرت سر ۲۷ تا ۲۹ ر دسمبر ۱۹۰۸ء، ص ۱۶۴-۱۶۵

○○○

پچیسواں اجلاس ۔ دہلی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پچیسواں سالانہ اجلاس ۱۹۱۱ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔ ہز ہائینس سر سلطان محمد شاہ آغا خان [۱۸۷۷-۱۹۵۷ء] سوم اس کی صدارت کے لئے منتخب ہوئے تھے، مگر وہ وقت پر تشریف نہ لا سکے تو نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے صدارت کے فرائض انجام دئے۔

اسی اجلاس میں مسٹر ایچ ٹیلر (۱) وزیر تعلیم حکومت ہند نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کی اطلاع سے اظہار ہمدردی کیا اور قوم کو فنڈ مہیا کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ متعدد ارباب ریاست و حکومت نے ایک بڑی رقم اسی وقت فراہم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کی تفصیل روداد میں درج ہے۔

اسی اجلاس میں مسٹر گوپال کرشن گوکھلے [۱۸۶۶-۱۹۱۵ء] کے ابتدائی جبری تعلیم بل سے اتفاق رائے کے لئے رزولیشن پیش کیا گیا۔ یہ رزولیشن مسٹر محمد علی بی اے آکسن اڈیٹر کامریڈ یعنی مولانا محمد علی جوہر نے پیش کیا اور اس کی تائید مولوی محمد عزیز مرزا بی اے آنریری سکریٹری مسلم لیگ نے کی۔ اس پر سخت بحث و مباحثہ ہوا۔ نواب وقار الملک (۲) نے طویل گفتگو کی جو رپورٹ میں درج ہے۔ انہوں نے اس قرارداد سے اتفاق نہیں کیا اور مخالفت کی اور اپنے موقف کی تائید میں متعدد دلائل دئے۔

نواب صاحب کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے اس قرارداد کی حمایت میں تقریر کی۔ ان کا انداز گفتگو بہت سخت ہے۔ تقریر ملاحظہ ہو:

ابتدائی جبری تعلیم بل

''حضرات!

بہت سے بولنے والے ایسے ہوتے ہیں جن کو بولنے کا مرض ہوتا ہے لیکن اس مسئلہ سے چونکہ مسلمانوں کی حیات و ممات کا تعلق ہے لہٰذا میری رائے جو اس بل پر ہے، اس کا اس وقت ظاہر کرنا ضروری اور مناسب سمجھتا ہوں۔ گورنمنٹ نے جب اس ملک میں تعلیم جاری کی تو سرکاری کالجوں اور مدرسوں کے دروازے یکساں طور پر ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے لئے کھول دئے۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ آپ کسی سال کی فہرست اٹھا کر دیکھئے اور اعداد کا مقابلہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمان تعلیم کے ہر شعبہ میں اپنی ہم سایہ قوم سے کس قدر کم ہیں۔ ہمارے نواب وقار الملک صاحب نے فرمایا ہے کہ جبر اس وقت ہونا چاہئے جب اختیاری تدابیر سے کام نہ نکلے۔ لیکن میں دریافت کرتا ہوں کہ سو برس سے جو اختیاری تدابیر عمل میں لائی گئیں ہیں ان سے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے اب تک کیا فائدہ حاصل ہوا ہے۔؟ آبادی کے لحاظ سے اس وقت جو نسبت ہندو مسلمانوں کی ہے، یعنی ایک اور پانچ، اس کے مقابلہ میں تعلیم کے اعتبار سے مسلمانوں کی نسبتی تعداد اور بھی کم نظر آئے گی۔

جبری تعلیم کے اجراء سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا اوسط ان کی مردم شماری کے اوسط کے برابر ہو جائے گا۔ نواب وقار الملک بہادر نے جو احتمال اس تحریک کے متعلق ظاہر فرمایا ہے میری رائے میں وہ شاعرانہ احتمال سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔

اسلام کے لئے علم لازمی ہے۔ جہاں اسلام ہوگا وہاں علم ہوگا۔ اسلام سے پیش تر عرب میں جو جہالت طاری تھی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تمام عرب میں صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان حالات سے نتیجہ اخذ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اسلام کے شروع ہوتے ہی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں لاکھوں آدمی نہ صرف پڑھنا لکھنا جانتے تھے بلکہ مختلف علوم وفنون

میں کئی ہزار علماء پیدا ہوگئے تھے۔ ترکوں کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسلام قبول کرنے سے پیشتر جہالت ان میں عام طور پر پائی جاتی تھی۔ لوٹ اور ماران کا خاص پیشہ تھا، لیکن اسلام لانے کے بعد ان میں ابوالنصر جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ فقہ حنفی کے بانی مبانی بھی ترک ہی ہیں۔

غرض اسلام ہی وہ مذہب ہے جس کے ساتھ علم وفضل ہونا لازمی ہے۔ مسلمانوں پر قرآن مجید کا پڑھنا واجب ہے۔ لیکن صرف طوطوں کی طرح رٹ کر پڑھنا نہیں بلکہ سمجھ کر پڑھنا اور سمجھ کر پڑھنے کے لئے علم لازمی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے امراء اور غرباء میں عام تعلیم ہمیشہ جاری رہی ہے۔ اور غرباء کے گروہوں میں سے ہمیشہ بڑے سے بڑے جید عالم پیدا ہوئے ہیں۔ جس پر اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۳) اسی گروہ میں سے تھے۔ امراء کے طبقہ میں سے بھی علم وفضل کا وہ عالم تھا کہ یورپ آج تک ایسے عالم بادشاہ نہیں دکھلا سکا، جیسے مسلمان بادشاہ ہوئے ہیں۔ اور حقیقت میں کسی قوم کی حالت معلوم کرنے کے دو ہی طریقے ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ قوم کے عوام کا علم، تہذیب اور شائستگی میں کیا درجہ ہے۔ دوسرے ان کے امراء کی علمی حیثیت کیسی ہے۔ خلیفہ معتصم باللہ، سیف الدولہ، محقق طوسی، عبداللہ ابن عباس، بوعلی سینا، عالم گیر وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں جو خود بادشاہ ہیں۔ یا بادشاہوں کے وزیر تھے اور یہ سب اس شان کے لوگ گذرے ہیں جن کے علم وفضل پر نہ صرف ہماری قوم بلکہ دنیا فخر کرتی ہے۔

قانون تعلیم جبریہ کا منشاء عوام میں تعلیم پھیلانا ہے۔ اور یہ وہ اصول ہے جو سراسر اسلام کے موافق ہے۔ مسلمانوں کو جن کا گوشت پوست علم سے بنا ہے، اس تحریک کی مخالفت کرنا بے حد تعجب انگیز ہے۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کے خاص حقوق اور مقاصد کا تعلق ہے، ان کے متعلق ہم چند شرطوں کے ساتھ اس بل کو منظور کرتے ہیں، لیکن اصول میں اختلاف ہم کو ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔''(۴)

علامہ شبلی نعمانی کی اس تقریر اور تائید وحمایت کے بعد میر سید نثار حسین صاحب محکمہ نہر، مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر اٹاوہ، مولوی رفیع الدین بیرسٹرایٹ لا بمبئی نے مولانا محمد علی جوہر کے اس رزولیشن سے اتفاق کیا۔ (۵)

علامہ اقبال: ترجمان حقیقت

اس اجلاس میں ہندوستان کے دو عبقری علامہ شبلی اور علامہ اقبال شریک ہوئے۔اس اجلاس میں سید سجاد حیدر(۶) نے کانفرنس کی جانب سے ڈاکٹر محمد اقبال کی اعلی اور ادبی قابلیت کے اعتراف میں ہار پہنائے جانے کی تحریک پیش کی۔اور شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی سے درخواست کی کہ علامہ موصوف یہ رسم اپنے ہاتھوں سے ادا فرمائیں۔چنانچہ علامہ شبلی نے یہ رسم ادا کی۔یہی وہ موقع ہے جب علامہ شبلی نے علامہ اقبال کو دوسرے غالب ہونے کی بشارت دی تھی۔اس موقع پر علامہ شبلی نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ

> ''یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح نہ تصور کرنی چاہئے۔ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطاب کی قدر کرتے رہے ہیں،اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کی نہیں ہوئی۔محقق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دئے،لیکن آج سوائے کتابوں کے اوراق کے کسی زبان پر نہ چڑھ سکے،لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا گیا،وہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے،وہ ان کے لئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ڈاکٹر اقبال کا علم ادب اور ان کی شاعری اس درجہ کی ہے جو ہماری قوم کے لئے مایہ ناز ہے۔اور ان کی شاعری کا معیار غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوسکتا۔''(۷)

مولانا شاہ سلیمان پھلواروی[م:۳۱مئی ۱۹۳۵ء] نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی۔ انہوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

> ''اقبال صاحب کے لئے یہ موقع بہت ہی مبارک ہے اور ہمیں بھی بڑی مسرت ہے کہ اس جلسہ میں انہوں نے علامہ شبلی کے مقتدر ہاتھوں سے پھولوں کے ہار

پہنے، نام بھی مبارک، کام بھی مبارک، پھولوں کا ہار بھی مبارک اور ہار ڈالنے والے کا دست کرم بھی مبارک۔''(۸)

اس کے بعد علامہ اقبال نے اجلاس سے خطاب کیا۔ یہ خطاب بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال اور اقبالیات کے ہر طالب علم کو ان کی اس مختصر تقریر کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ اس سے افکار اقبال کی پورے طور پر وضاحت ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو پان اسلامزم کی تحریک کا پھیلانے والا بتلایا جاتا ہے۔ مجھ کو پین اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے۔ اور میرا یہ اعتقاد بھی ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے۔ اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح اور اسلامی اسپرٹ آخر کار غالب آئے گی۔ اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں اپنی نظموں کے ذریعہ سے قوم کو پہونچانا چاہتا ہوں۔ اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہش مند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی کہ باوجود دولت وامارت کے وہ اس دار فانی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ میں جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت سلطان نظام الدین محبوب الٰہی کے مزار پر جایا کرتا ہوں۔ اور وہاں کے دیگر مزارات وغیرہ پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں۔ میں نے ابھی ایک شاہی قبرستان میں ایک قبر پر الملک للہ کا کتبہ لکھا ہوا دیکھا۔ اس سے اسلامی اسپرٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ جو دولت اور حکومت کے زمانہ میں مسلمانوں میں تھی۔ جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول رہا ہو اس کے مستقبل سے ناامیدی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وہ پین اسلامزم ہے جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے۔ اور اس قسم کے خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں۔''(۹)

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اپنے عہد کے اردو کے سب سے بڑے ادیب

وانشاپرداز،محقق،مصنف اوردانش ورعلامہ شبلی نے علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ایک مجمع خواص میں کیا۔اوران کی حوصلہ افزائی کی۔

علامہ شبلی نعمانی کا حوصلہ افزائی کا یہی اندازتھا۔ان کی مردم سازی پرجن اہل قلم نے قلم اٹھایا ہےانہوں نے طلبہ اورنوجوان اہل علم کی تعلیم وتربیت کےاس طرح کےمتعدد واقعات لکھے ہیں بلکہ دورآخر میں ندوہ میں ان کے جرائم میں ایک جرم طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی شامل تھی۔

کم لوگوں کواطلاع ہوگی کہ علامہ اقبال کی پہلی نثری تصنیف علم الاقتصاد[م:۱۹۰۴ء] کےایک حصہ کی زبان وبیان کی اصلاح علامہ شبلی نے۱۹۰۳ء میں کی تھی۔اس کاذکرخودعلامہ اقبال نے کتاب کے دیباچہ میں کیا ہے۔کہاں لاہوراورکہاں اعظم گڑھ؟،باوجوداس کے علامہ اقبال نے اپنی کتاب کی اصلاح کے لئے علامہ شبلی کاانتخاب کیا۔مولاناسیدسلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

> ''مولاناشبلی مرحوم نے اقبال کواسی وقت پہچان لیاتھاجب ہنوزان کی شاعری کے مرغ شہرت نے پروبال نہیں پیدا کئے تھے۔چنانچہ انہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ حالی وآزاد کی جوکرسیاں خالی ہوں گی ان میں سےایک اقبال سے پرہوجائے گی۔''(۱۰)

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس میں علامہ شبلی نے ''عورت اوراسلام'' کے موضوع پرایک خطبہ بھی دیا۔یہ موضوع ہمیشہ سےزیربحث رہاہےاورجب تک مخالفین اسلام زندہ رہیں گے ہمیشہ زیربحث رہے گا۔اس اجلاس کی صدارت بیگم بھوپال نواب سلطان جہاں نے فرمائی۔(۱۱) کانفرنس کی رپورٹ کے فاضل مرتب کے بقول علامہ شبلی نے اپنی مشہورفصاحت اور وسیع تاریخی معلومات کے ذریعہ سےاسلام میں عورتوں کےمتعلق ایک نہایت پراثرتقریرفرمائی:

خطبہ:عورت اوراسلام

بعض محاورات زبانوں پراس قسم کے چڑھ جاتے ہیں جومحض بطوررسم کےاستعمال ہوتے ہیں اوران سے کوئی حقیقی معنی مرادنہیں ہوتا۔ازاں جملہ ایک''عزت'' کالفظ ہے جواکثرمقرر

استعمال کیا کرتے ہیں۔لیکن اس وقت کے جلسہ میں جب کہ ایک ایسی والیہ ملک جو نہ صرف جان و مال پر حکومت کر رہی ہیں بلکہ دلوں کی مالک ہیں، یہاں تشریف فرما ہیں، تو اس موقع پر تقریر کرنا درحقیقت ایک عزت ہوگی۔اسلام تفرقے مٹانے کے لئے دنیا میں آیا تھا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ صاف کہہ دینے کا حکم ہوا کہ "انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی " (یعنی میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں۔فرق صرف یہ ہے مجھ پر وحی آتی ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین من حیث الانسان اپنے آپ میں اور دوسرے انسانوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ایک بار ایک شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر مرعوب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے کیوں ڈرتے ہو؟ بحالیکہ میں ایک بیوہ قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔حضرت عمرؓ کو دیکھا جاتا تھا کہ کبھی آپ خارشتی اونٹوں کے جسم پر اپنے ہاتھ سے تیل مل رہے ہیں۔کبھی کچی اینٹ سر کے نیچے رکھے ہوئے زمین پر پڑے سو رہے ہیں۔حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک یہودی کے مقابلہ میں عدالت جا کر ایک معمولی فریق کی حیثیت سے شہادت دی تھی۔مگر بعد میں تفرقے پڑ گئے۔ہم اس مساوات کے لئے تڑپ رہے ہیں جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔اور آج جو سماں پیش نظر ہے وہ صدیوں بعد دیکھنے میں آیا ہے، جب کہ ایک والیہ ریاست ان لوگوں کے درمیان تشریف فرما ہیں جو ان کی رعایا اور خادم کے طور پر ہیں۔یہی تفرقہ وجہ ہے عورتوں میں تعلیم کے سوال کے پیدا ہونے کی۔ورنہ مردوں کو کیا حق ہے کہ وہ عورتوں کی نسبت یہ طے کریں کہ ان کی اس قسم کی تعلیم ہونی چاہئے اور اس قسم تعلیم نہیں ہونی چاہئے۔دنیا کے ہر حصہ میں اور ہر زمانہ میں عورتوں کا درجہ نہایت پست رہا ہے۔ہندوستان میں دختر کشی کی نالائق رسم اب تک رہی ہے۔فلاطون کا قول تھا کہ رسم ورواج ازدواج پر مجبور کرتے ہیں، ورنہ عورتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مردوں کے ہم پایہ رکھا جائے اور برابر جگہ دی جائے۔انگلستان میں انیسویں صدی تک یہ قاعدہ تھا کہ شادی کے بعد عورت کو اپنے مال پر کچھ اختیار نہیں رہتا تھا۔عرب میں عورت کے ساتھ یہ سلوک ہوتا تھا کہ "اذا بشر احدھم بالانثیٰ ظل وجه مسودا وھو کظیم."[نحل.۵۸] (جس وقت ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی تھی

تو اس کا چہرہ (بوجہ غم) سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ دل میں پیچ وتاب کھاتا تھا۔) لیکن اسلام نے مرد وعورت کے درمیان مساوات قائم کی اور حکم دیا کہ "ولهن مثل الذی علیهن" [بقره.۲۲۸] (ان کے وہی حقوق ہیں جو ان پر ہیں) اور "للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن." [نساء.۳۲] (یعنی جو مرد کمائیں وہ ان (مردوں) کا ہے اور جو عورتیں کمائیں وہ ان (عورتوں) کا ہے، اور یہ کہ "وجعل بینکم مودة ورحمة ." (تمہارے درمیان محبت اور رحم کا سلسلہ قائم کیا) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ " خیرکم خیرکم نساء کم "(تم میں اچھے وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لئے اچھے ہیں۔) آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے "فقاً بالقواریر (ان آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہ سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ ایمان لائی تھیں۔سب سے پہلے شہید ایک صحابیہ عورت تھیں جو ابوجہل کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوئیں تھیں۔غزوۂ احد میں ایک صحابیہؓ کو اپنے بیٹے اور شوہر کے قتل کے پیا پے خبریں ملنے کے باوجود جب ان کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی کی اطلاع ملی (جس کا ان کو سخت انتظار تھا) تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ " لاهم رویتک یامحمد " (اے محمدؐ! آپ کے دیدار کے بعد بیٹے اور شوہر کے قتل کا کیا غم ہوسکتا ہے۔) اس سے عورت کی قوت ایمانیہ کا پتہ چلتا ہے۔تین سو سال تک عورتوں کی مردوں کے ساتھ مساوات قائم رہی۔ ہندوستان کے زریں عہد میں گلبدن بیگم [دختر بابر] نور جہاں بیگم، جہاں آرا بیگم [دختر شاہ جہاں] اور زیب النساء [دختر اورنگزیب] ایسی فاضلہ عورتیں تھیں کہ بیان سے باہر ہے۔گلبدن بیگم کا ''ہمایوں نامہ'' [سوانح ہمایوں] اور جہاں آرا بیگم کی ''مونس الارواح'' [سوانح حضرت معین الدین چشتیؒ] بے نظیر کتابیں ہیں۔ پردہ مانع تعلیم نہیں ہے اور نہ پردہ کوئی خارج از اسلام شے ہے۔کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان عورتیں بے پردہ دربار وغیرہ میں شریک ہوتی رہی ہوں۔اس کے خلاف کہنا اسلام پر سخت اتہام لگانا ہے۔فرض کیجئے کہ عورتوں کو تعلیم دلانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن آپ مردوں کی تعلیم ہی کے لئے عورتوں کو تعلیم دلائیں؟ کیوں کہ بچہ کی تعلیم اس کے وجود میں آنے کے وقت ہی سے شروع ہوجانی چاہئے، اور بغیر عورتوں

کے تعلیم یافتہ ہونے کے ممکن نہیں ہے۔''(۱۲)

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ علامہ شبلی ۱۹۱۱ء تک ایجوکیشنل کانفرنس میں کس قدر فعال اور سرگرم حصہ لیتے تھے اور اس وقت بھی وہ ملک وقوم کے مسائل سے کس قدر گہری واقفیت اور نظر رکھتے تھے اور کس طرح کے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے خواہاں تھے۔ عالم خوندمیری نے سچ لکھا ہے کہ ''سربلند ہونے کی تمنا ہمارے دلوں میں مچلتی ہے تو اس تمنا کی چنگاری شبلی نے سلگائی تھی۔''(۱۳)

تعلیقات وحواشی

(۱) مسٹر ایچ ٹیلر: انگریز وزیر تعلیم حکومت ہند مسٹر ایچ، جی، ایس، ٹیلر برطانوی عہد میں ضلع کان پور صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کا انگریز کلکٹر تھا۔ مسجد مچھلی بازار کانپور کا وضوخانہ مسمار کرایا اور پھر جب مسلمانوں نے تعمیر کا قصد کیا تو نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائیں۔ اس کے بارہ میں اس سے زیادہ معلومات نہ مل سکیں۔ ''کلیات شبلی'' میں اس کا نام غلطی سے ٹبلر لکھ گیا ہے اور یہ غلطی کلیات کے پچھلے ایڈیشن سے چلی آرہی ہے۔

(۲) نواب وقار الملک [۱۸۴۱-۱۹۱۷ء] کا نام مشتاق حسین تھا۔ اصلاً سراواں ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے، مگر بچپن میں والد کے انتقال کے سبب ان کی والدہ امروہہ چلی آئیں اور پھر یہی ان کا وطن ٹھہرا۔ یہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی اور یہیں ایک اسکول میں مدرس ہوئے، پھر محرر ہوکر مرادآباد آئے۔ قحط کے زمانہ میں سرسید احمد کا خاں کا تبادلہ مرادآباد ہوا تو انہوں نے نواب وقار الملک کو راحت کاری کے کاموں کا ذمہ دار بنایا، جسے انہوں نے بخوبی نبھایا۔ یہیں ایک دوسرے سے گہرے مراسم قائم ہوئے جو ہمیشہ باقی رہے۔ نواب وقار الملک نے مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ریاست حیدرآباد سے بھی وابستہ رہے۔ پھر وہ علی گڑھ آئے اور سرسید کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ مسلم لیگ کے قیام میں ان کی آراء کو بھی دخل تھا۔ وہ علی گڑھ میں بورڈ آف ٹرسٹی کے آنریری سکریٹری نامزد ہوئے۔ انہیں کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک برپا ہوئی اور انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں لگا کر اتنا چندہ جمع کیا کہ یونیورسٹی کی تاریخ میں کبھی نہیں

ہوا۔ ۲۷؍جنوری ۱۹۱۷ءکوامروہہ میں وفات پائی۔علامہ شبلی سے گہرے مراسم تھے۔خط وکتابت بھی تھی۔ مکاتیب شبلی جلداول اورمکتوبات شبلی میں ان کے نام کل تین خطوط شامل ہیں۔ان سے بھی گہرے تعلقات کااندازہ ہوتا ہے۔

(۳) امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ [۶۹۹-۷۶۷ء] علامہ شبلی نعمانی نے ان کی بڑی محققانہ اور بہت مفصل سوانح عمری ''سیرۃ النعمان'' لکھی ہے۔

(۴) رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۱ءص ۲۰۲-۲۰۵

(۵) ایضاً ص ۲۰۵

(۶) سید سجاد حیدر یلدرم [۱۸۸۰-۱۹۴۳ء] کوعلامہ شبلی نعمانی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔انہوں نے علامہ شبلی کے درس قرآن میں بھی شرکت کی تھی اور کہتے تھے کہ مولانا شبلی قرآن کے درس کے وقت قرآن پاک کے اصول بلاغت اور صنایع وبدایع کو بتاتے تھے اور صنایع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرتے تھے۔(حیات شبلی ص ۱۹۶، طبع جدید، ۲۰۱۵ء)

سید سجاد حیدر یلدرم کا وطن بجنور تھا۔بنارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ کالج آئے اور بی اے کیا۔انہوں نے سفارت خانوں میں ملازمت کی۔ان کا میدان افسانہ نگاری تھا، جس میں انہوں نے بڑا کمال پیدا کیا۔رومانوی افسانہ نگاری کے وہ بانی ہیں۔خیالستان ان کے افسانوں اورانشائیوں اور نثری مضامین کا مجموعہ ہے۔انہیں ترجمہ نگاری پر بھی بڑی قدرت حاصل تھی۔جدید انگریزی اور ترکی افسانوں اورناولوں کے ان کے تراجم اپنے زمانہ میں بے حد مقبول ہوئے۔دراصل اردو ادب میں انہیں کی بدولت ترکی ادب کا اضافہ ہوا۔مشہور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر [۱۹۲۷-۲۰۰۷ء] انہی کی صاحبزادی تھیں اوران کافن دراصل ان کے والد کے فن کی معراج کمال ہے۔

(۷) اقبال اور پیروی شبلی، ص ۴۲، سید افتخار حسین شاہ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۸ء

(۸) بحوالہ زندہ رود، حیات اقبال کا وسطی دور، ص ۱۵۵

(۹) رپورٹ سالانہ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۱ء، ص ۲۰۶-۲۰۷

(۱۰) یادرفتگاں ص ۱۸۳

(۱۱) سلطان جہاں بیگم [۱۸۵۸-۱۹۳۰ء] والی ریاست بھوپال۔ ۱۹۰۱ء میں اپنی والدہ شاہ جہاں بیگم کی وفات کے بعد تخت نشیں ہوئیں اور ۱۹۲۶ء میں اپنے بیٹے نواب حمید اللہ خاں کو تخت نشیں کیا۔ بڑی عالمہ و فاضلہ خاتون حکمراں تھیں۔ حکمرانی و کشور کشائی کے ساتھ علم و ادب اور دین مذہب سے بھی شغف رکھتی تھیں۔ انہوں نے نسائی ادب کا آغاز کیا اور خواتین سے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ بڑی علم پرور اور ادب نواز خاتون تھیں۔ مسلم یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں ان کا بڑا اہم حصہ ہے۔ یہی سبب تھا کہ وہ اس کی پہلی چانسلر نامزد ہوئیں۔ علامہ شبلی کو بڑی قدر و منزلت دی اور سیرۃ النبیؐ کے تمام مصارف اپنے ذمہ لے کر علامہ شبلی کو مصارف کی طرف سے مطمئن کر دیا۔ اسی موقع پر علامہ شبلی نے یہ قطعہ کہا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

علامہ شبلی نعمانی کی وفات کے بعد یہ وظیفہ حامد حسن نعمانی [۱۸۸۰-۱۹۴۲ء] کی درخواست پر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے نام منتقل کیا گیا اور ریاست کے خاتمہ تک جاری رہا۔

(۱۲) رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۱ء ص ۱۶۶-۱۶۹

(۱۳) عالم خوندمیری، اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ، البصیر حیدر آباد شبلی نمبر ص ۵۶

ooo

چھبیسواں اجلاس۔ لکھنو

۱۹۱۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا چھبیسواں اجلاس لکھنو میں مولوی میجر سید حسن بلگرامی [م:۳۱رمئی ۱۹۱۵ء] کی صدارت میں منعقد ہوا۔اس کے میز بان روٗسان اودھ تھے۔کانفرنس کا یہ دوسرا اجلاس تھا جو بارہ دری میں منعقد ہوا۔ پہلا ۱۸۸۷ء میں منعقد ہوا تھا۔جس میں علامہ شبلی نے اپنا تاریخی مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' پیش کیا تھا۔بارہ دری کے دونوں اجلاسوں میں علامہ شبلی شریک ہوئے۔اس اجلاس کے موقع پر وہ ندوہ کے معتمد تعلیم تھے اور لکھنو ہی میں مقیم بھی۔ چنانچہ افتتاحی اجلاس میں ڈائز پر وہ بھی تشریف فرما رہے (۱)،مگر پھر کانفرنس کے کسی اجلاس میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔نہ کسی قرارداد کے پیش کرنے میں اور نہ تقریر میں، بلکہ کسی طرح کا حصہ شاید انہوں نے نہیں لیا یا انہیں اس کا موقع نہیں دیا گیا۔اس اجلاس کی روداد میں بھی کچھ اندراج نہیں ہے۔بس شرکاء میں ان کا نام درج ہے۔

اس وقت ایم اے او کالج علی گڑھ میں علامہ شبلی کے جانشین مولوی مرزا ابوالقاسم ایرانی استاذ شعبہ فارسی (۲) نے بچوں کے فارسی نصاب پر گفتگو کی اور ادبیات فارسی کے چند نمایاں اشخاص کا ذکر کیا تو اس میں علامہ شبلی کا نام بھی آیا ہے۔(۳)

اس اجلاس کے بعد علامہ شبلی کی زندگی میں ۱۹۱۳ء کا اجلاس منعقد ہوا۔۱۹۱۲ء کے اجلاس میں ان سے ذمہ داران کانفرنس نے جس طرح صرف نظر کیا تھا علامہ شبلی کی جگہ کوئی بھی شخص ہوتا دوبارہ شریک نہ ہوتا۔علامہ شبلی تو خیر سے حمیت وغیرت کے پتلے واقع ہوئے تھے۔ان سے یہ کہاں ممکن تھا۔بہر حال یہ زمانہ ان کے لئے بہت تکلیف دہ بھی تھا۔جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۴) کانفرنس کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔اس سے پہلے انجمن ترقی اردو کے معاملہ میں وہ جس سرد مہری کا معاملہ کر چکے تھے،جس کے سبب علامہ شبلی کو انجمن سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔۱۹۱۲ء کے اجلاس میں وہی بے اعتنائی برتی گئی بلکہ وہ تو اس سطح پر آ گئے تھے کہ ندوہ کے مسائل ومعاملات میں مخالفین شبلی کے ہم نوا ہو گئے۔اس کی تفصیل تکلیف دہ ہے۔بہر حال علامہ شبلی ۱۹۱۳ء کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں کی صدارت ہمیشہ ملک وملت کے سربرآوردہ اشخاص کیا کرتے تھے۔کانفرنس کے ابتدائی دور میں یعنی عہد سرسید میں جو لوگ کانفرنس سے وابستہ ہوئے، ان میں نواب محسن الملک اور مولانا حالی وغیرہ سب کو کانفرنس کی صدارت کی عزت بخشی گئی اور اگر یہ اعزاز نہیں دیا گیا تو علامہ شبلی کو نہیں دیا گیا۔علامہ شبلی جیسے حساس شخص کے لئے یہ معمولی بات نہیں رہی ہوگی،مگر آخری دور میں وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر خدام الدین تیار کرنے کے لئے فکرمند ہو گئے تھے۔میں اپنے عہد میں کسی کے ساتھ اس طرح کی زیادتیاں دیکھتا ہوں تو خیال ہوتا تھا کہ یہ زوال کی نشانیاں ہیں مگر مذکورہ واقعات کے علم میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری قوم میں اس کا سلسلہ بڑا پرانا ہے اور زوال وادبار کی جو گھٹا چھائی ہوئی ہیں اور ہلاکت اپنا جو سماں دکھلا رہی ہے،اس کے اسباب ہم سے پہلے والوں کی سرشت میں بھی شامل ہو گئے تھے۔گویا ہماری بربادی کے اسباب پہلے سے ہماری قوم میں موجود ہیں۔

بہر حال ۱۹۱۴ء کی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے انعقاد سے پہلے علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ایجوکیشنل کانفرنس کی جن مجالس کے وہ کبھی بلبل رنگین نوا تھے، اس میں ان کی مغفرت کی دعائیں مانگی گئیں۔تعزیتی قراردادیں منظور ہوئیں۔اور شرکاء وسامعین نے اس حادثہ فاجعہ پر آنسو بہائے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

علامہ شبلی کی وفات کے بعد دو مرتبہ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۷ء کے سالانہ اجلاسوں میں ان کا کلام پیش ہوا۔ یہ اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور اب بھی ان کے پڑھنے سے گرمی، جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

تعلیقات و حواشی:

(۱) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، لکھنو، ۲۸ تا ۳۰ ردسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۲

(۲) مرزا ابوالقاسم ایرانی۔ ایم اے او کالج علی گڑھ میں فارسی کے استاد تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے اور فارسی میں تقریر کرتے تھے۔ ان کی ایک فارسی تقریر روداد میں درج ہے۔ غالباً ایران سے آئے تھے۔ مزید معلومات نہ مل سکیں۔

(۳) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، لکھنو، ۲۸ تا ۳۰ ردسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۱۵۱

(۴) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں [۱۸۶۷-۱۹۳۰ء] مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ابتدائی طلبہ میں تھے۔ علی گڑھ کے بعد ۱۸۹۱ء میں بیرسٹری کے لئے لنڈن گئے۔ ۱۸۹۳ء میں بیرسٹر ہوئے۔ ایک سال مزید رک کر تاریخ میں سند لی۔ سرسید احمد خاں نے انہیں مدرسۃ العلوم کا ٹرسٹی مقرر کیا۔ ان کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ اس کے وہ نہ صرف رکن تھے بلکہ دستور ساز کمیٹی کے ارکان میں بھی شامل تھے۔ وہ یو پی قانون ساز کونسل اور اسٹیٹ کونسل آف انڈیا کے بھی رکن رہے۔ ۱۹۲۲ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی ذمہ دار رہے۔

علامہ شبلی کے زمانہ قیام علی گڑھ میں وہ ایم اے او کالج کے طالب علم تھے۔ باوجود اس کے علامہ شبلی سے ان کے مراسم کبھی اچھے نہیں رہے۔ ایک وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ علامہ شبلی کانگریس کے ہمدرد اور مداح تھے اور صاحبزادہ صاحب لیگی تھے۔

ندوہ میں علامہ شبلی کی شدید مخالفت ہوئی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ طلبہ نے اس کے خلاف اسٹرائک کی۔ علامہ شبلی نے استعفا دیدیا۔ تصفیہ و مصالحت کے لئے دہلی میں حکیم اجمل خاں [۱۸۶۸-

۱۹۲۷ء] کی قیادت میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے مخالفین شبلی کی نہ صرف ہم نوائی کی، ساتھ دیا بلکہ ان کی حمایت میں تقریر بھی کی۔ پھر یہ سازش بھی کی کہ ایک ایسی معائنہ کمیٹی تشکیل دی جو علامہ شبلی کے خلاف اور مخالفین شبلی کے حق میں رپورٹ تیار کرے تاکہ ریاستوں نے ندوہ کی جو مالی امداد خلفشار کی وجہ سے روک دی ہے وہ جاری ہو جائیں۔ علامہ شبلی نے اپنی دو نظموں (جنگ زرگری حب علیؓ یا بغض معاویہؓ۔ اور ندوۃ العلماء اور ننگ معائنہ اغیار) میں ان پر سخت طنز و تعریض کی ہے۔ جو بڑی کاٹ دار ہیں۔ اصلاً وہ علامہ شبلی کے آنسو ہیں کہ اب وہ لوگ ندوہ کے معائنہ کے لئے آتے ہیں، جنہیں کبھی ندوہ کے نام سے بھی اجتناب تھا۔ ان نظموں کے پڑھنے کے بعد ہی ان کی اثر آفرینی اور علامہ شبلی کے صحیح جذبات کا احساس ممکن ہے۔ یہاں دو تین متفرق اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

کیا لطف ہے کہ حامی ندوہ ہیں اب وہ لوگ
جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوہ غریب
اک بیہدہ خیال تھا یا آنکہ خواب تھا
حیرت یہ ہے کہ مجمع دہلی میں یہ گروہ
ندوہ کے حل وعقد کا نائب مناب تھا
سیارگان چرخ علی گڑھ تھے پیش پیش
جن میں کوئی قمر تھا کوئی آفتاب تھا
سرشار ہے حمایت ندوہ میں وہ گروہ
جس کو کہ اس کے ذکر سے بھی اجتناب تھا

○○○

وفات شبلی اور تعزیت

علامہ شبلی نعمانی نے ۱۸رنومبر۱۹۱۴ء کو صبح ساڑھے پانچ بجے شبلی منزل میں اسہال کے مرض میں وفات پائی۔انالله و انااليه راجعون.

وفات کی خبر سے ہرطرف صف ماتم بچھ گئی۔شہر اعظم گڑھ میں کورٹ کچہری اور دکانیں ان کے غم میں بند ہوگئیں اور ہرطرف سناٹا چھا گیا۔جیسے جیسے یہ خبرغم ملک کے دوسرے علاقوں میں پھیلی تمام ہندوستان ماتم کدہ بن گیا۔

علامہ شبلی کی وفات کے ایک ماہ نو دن بعد ۲۷رد سمبر۱۹۱۴ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس راول پنڈی میں منعقد ہوا تو شرکاء نے علامہ شبلی کی وفات پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔تعزیتی قراردادیں پیش کی گئیں۔تعزیتی قرارداد پر تقریر کرنے والوں میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۷-۱۹۵۰ء]،رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء](۱) اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔مقررین نے جو قراردادیں پیش کیں یا اس موقع پر یادگار شبلی کے قیام کے لئے جو تجاویز پیش ہوئیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس قرارداد کے محرک اول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے۔انہوں نے قرارداد پیش کرتے ہوئے درج ذیل تقریر کی:

> ’’جس رزولیشن کے پیش کرنے کی عزت مجھے دی گئی ہے وہ بہت وقت چاہتا ہے اور اتنا وقت ہے نہیں۔اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک ایسے شخص کے متعلق کچھ نہ کہا جائے جیسے کہ مولانا شبلی مرحوم تھے۔حضرات اس کانفرنس کے ساتھ علامہ شبلی

مرحوم کو ایک خاص تعلق تھا۔ اور وہ یہ کہ جس علمی خدمت کے لئے علامہ موصوف نے کثیر حصہ اپنی عمر اور قابلیت کا صرف کیا اور جس کی بدولت اپنا نام تمام دنیا میں روشن کیا وہ اسلامی تاریخ ہے۔ ہندوستان کی آب وہوا کبھی علم تاریخ کو راس نہیں آئی اور ہندوستان میں جب سے مسلمان آئے ہیں اس وقت سے لے کر اس وقت تک کوئی اعلی پایہ کی اسلامی تاریخ ہندوستان میں تصنیف نہیں ہوئی۔ اس علم کے لوگ عراق وعرب میں پیدا ہوئے۔ یہ اسی اجلاس کے پلیٹ فارم کو فخر حاصل ہے کہ علامہ مرحوم نے اپنی پہلی تاریخی تصنیف کانفرنس کے اجلاس میں پڑھ کر سنائی تھی، جس کا نام مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ہے۔ مرحوم ہمیشہ کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوتے تھے۔ اور اپنے مفید لکچروں اور مضامین سے فائدہ پہنچاتے تھے۔ یہ تو کانفرنس کا تعلق تھا علامہ شبلی سے۔ علامہ شبلی کا جو تعلق کانفرنس سے تھا وہ ان کی ذات سے وابستہ تھا۔ وہ اس کی تعلیم وتربیت کی مجسم تصویر تھے۔ جو کانفرنس کا مطمح نظر ہے یعنی مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم کے نقائص اور خرابیوں کو دور کرنا اور جدید تعلیم کے محاسن اور خوبیوں کو اخذ کرنا۔ مرحوم نے مولوی محمد فاروق صاحب عباسی چریاکوٹی (۲) سے قدیم طرز کی تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک لفظ انگریزی کا نہ جانتے تھے۔ علوم جدیدہ سے ناواقف تھے۔ علی گڑھ پہنچ کر سرسید مرحوم کی صحبت سے مستفید ہوئے اور پروفیسر آرنلڈ سے مل کر علوم جدیدہ سے واقفیت حاصل کی اور اس طرح نئی اور پرانی تعلیم نے مل کر ان میں وہ بات پیدا کی جو انہیں کے ساتھ مخصوص تھی۔

اے حضرات! خیال فرمایئے کہ علامہ شبلی کا انتقال ہوگیا۔ تعلیم کے ذکر سے اگرچہ زمین وآسمان گونج رہا ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے نقشے تعلیم کے پیش کئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ ہم میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ تعداد کی کمی تو پہلے ہی تھی۔ لیکن کس قدر حسرت ناک یہ بات ہے کہ اب علم کی کمی ہوتی جاتی ہے۔

علامہ مرحوم کی وفات سے حقیقت میں علم کی کمی واقع ہوئی ہے۔اوراس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم میں کوئی ایسا شخص موجودنہیں کہ جوکچھ عرصہ کے بعدعلامہ شبلی کا ہم پایہ بن سکے۔میرے تعلیم یافتہ دوست مجھے معاف فرمائیں گے کہ اگر میں یہ عرض کروں کہ علامہ مرحوم کوجس چیز نے علامہ شبلی بنایاوہ یک رخی تعلیم نہ تھی بلکہ وہ تعلیم مجموعہ تھی قدیم اور جدید تعلیم کی۔ پروفیسر آرنلڈ کی صحبت سے جو بات مولانا شبلی میں پیدا ہوئی وہ مرحوم کی تمام تصنیفات سے ظاہر ہے۔اورعلامہ شبلی کی صحبت سے پروفیسر آرنلڈ پر وہ اثر پڑا کہ انہوں نے پریچنگ آف اسلام جیسی کتاب تصنیف کی۔ میں پھر یہ عرض کروں گا کہ جب تک قدیم اور جدید تعلیم یکجا جمع نہ ہوں ہماری قوم میں مولانا شبلی جیسے علماء پیدانہیں ہوسکتے۔مولانا شبلی کی وفات علم کی وفات ہے۔موت العالم موت العالم۔ پس نہایت رنج اورالم کے ساتھ اس رزولیشن کی تحریک کرتا ہوں۔(۳)

آل انڈیامسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ آنریری سکریٹری صاحبزادہ آفتاب احمد خاں[۱۸۶۷-۱۹۳۰ء] نے بھی اس رزولیشن کی تائید میں تقریر کی اور کہا کہ

’’مولانا مرحوم جس درجہ اور قابلیت اور جس برکت کے عالم تھےاس کے لحاظ سے مرحوم کی زندگی اوران کے کارناموں کے متعلق رائے دیناعلماء کا کام ہے۔مجھ جیسے جاہل کا کام نہیں ہے،لیکن یہ ضرورعرض کروں گا کہ جواستفادہ علمی مجھ کوان کی صحبت سے حاصل ہوتا تھاویسا کسی اور کی صحبت سے بہت کم ہوتا تھا۔ مجھ کوبھی عرصہ سے مرحوم کی خدمت میں نیاز حاصل تھااور میں نے کئی باران سے عرض کیا کہ وہ علی گڑھ تشریف لاکر قیام کریں تا کہ وہاں کی سرزمین میں علمی آب وہوا پیدا ہو،مگرافسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ وقت تھوڑا ہے اس لئے میں کچھ زیادہ عرض نہ کروں گا۔میں تہہ دل سے رزولیشن کی تائید کرتا ہوں۔(۴)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بعد علامہ شبلی کے علی گڑھ کے تلمیذ، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر[۱۸۷۴-۱۹۳۱ء] نے رزولیشن کی تائید کی اور قدرے وضاحت سے کہا کہ

''ایسے جلسوں میں رزولیشن بہت پیش کئے جاتے ہیں اور کانفرنس میں ہمیشہ رزولیشن پاس ہوتے رہے ہیں لیکن میں یہ کہوں گا کہ ان کی تعمیل بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ یہ تعلیمی کانفرنس ہے اور ایک ایسے شخص کے لئے جیسے کہ مولانا مرحوم تھے اظہار افسوس کرنا چاہتی ہے۔ شبلی جیسے شخص قدیم تعلیم سے پیدا ہوئے جدید تعلیم ابتک ایک بھی ایسا شخص پیدا نہ کر سکی تو کیا اب ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہماری کانفرنس ایسے وسائل بہم پہنچائے جس سے سیکڑوں شبلی پیدا ہو سکیں۔

مولانا اپنے زمانہ حیات میں تحریک کی تھی کہ ایک دارالمصنّفین قائم کیا جائے، جس میں اس دل و دماغ کے لوگ جنہیں اس فن میں خاص دلچسپی ہے شریک ہو کر کام شروع کریں۔ تصنیف کا کام مضمون نگاری سے بالکل الگ ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندوستان میں اگر ایک مضمون نگار کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے حصول میں کتنی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ابتک مضمون نگاری کا کام صرف وہی شخص انجام دیا کرتا تھا جو دنیا کے تمام کاموں سے تھک گیا ہو۔ بہت سے اصحاب ایسے ہیں جن میں تصنیف وغیرہ کی خاص قابلیت ہے لیکن دنیاوی ضروریات کی وجہ سے انہیں اس کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ کوئی نائب تحصیل داری کا امیدوار ہے اور کوئی تحصیل داری کا:

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کچہریوں میں منصرمی اور کلرکی کے کام کرنے والے اکثر ایسے حضرات ہیں کہ اگر انہیں آزادی سے تصانیف کے کام کرنے کا موقع دیا جائے تو بڑے زبردست کام انجام دے سکیں۔ مصنّفین کا اس وقت کوئی پرسان حال نہیں۔ اسلامی

سلطنتوں میں ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ ایسے لوگوں کوانعام و اکرام سے مالا مال کیا جاتا تھا۔شعرا اور ادبا کوبعض اوقات تصنیف سے زائد خزانہ دیدیا گیا۔ فردوسی اور محمود کے واقعات کا حال ہر شخص کو معلوم ہے۔آج کل کہا جاتا ہے کہ قوم اور پبلک ہر ایک کام کو کرتی ہے۔ ولایت میں ہر ایک تصنیف کو مصنف کے احباب خصوصیت سے خریدتے ہیں۔یہاں بجائے اس کے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ انجمنوں میں وہ کتاب مفت دی جائے۔احباب کہتے ہیں کہ تم نے ہمیں اپنی کتاب تک نہ بھیجی۔اخباروں کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔یہ نہیں ہے کہ مولانا کے جیسے لوگ نہ پیدا ہوسکیں۔یہ لوگ موجود ہیں اور ہوسکتے ہیں۔ہمیں ایسا کرنا چاہئے کہ ہم انہیں موقع دیں کہ وہ ایسا کرسکیں۔ہر شخص ایسا نہیں ہے کہ مولانا کی طرح اپنا وقت دیدے۔اور نہایت استقلال کے ساتھ اس دشوار کام کو جاری رکھے۔اگر کانفرنس مولانا کی تحریک کے مطابق دارالمصنّفین قائم کرکے کچھ لوگوں کو وظائف دے اور انہیں آزادی سے کام کرنے کا موقع ملے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔اگر آپ چاہتے ہیں کہ سیرۃ نبوی کی دوسری جلد پوری ہوجاوے۔اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس قسم کی تصانیف آپ کی قوم میں ہوتی رہیں تو ضرور دارالمصنّفین قائم کیا جائے۔اور موقع دیا جائے کہ ایسی کتابیں طیار کی جاسکیں اور شبلی ایسے لوگ پیدا ہوں۔‘‘(۵)

ایجوکیشنل کانفرنس کے شرکاء میں ایک اہم نام مدیر الہلال امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہے۔انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی قرارداد کی نہ صرف تائید کی بلکہ انہوں نے اسی اجلاس میں ایک علاحدہ رزولیشن دارالمصنّفین کے قیام کے متعلق پیش کیا۔جس کی تائید حبیب شبلی نے بھی کی۔مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ

’’علامہ مرحوم کی یہ دیرینہ تمنا تھی کہ قوم میں ایک گروہ لائق اور قابل مصنّفین کا پیدا

ہو جو علوم اسلامیہ کے علاوہ تعلیم جدید سے پورے طور سے واقف ہو اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ چند قابل اور لائق نوجوانوں کے لئے وظائف کا انتظام کیا جاوے تا کہ وہ اطمینان وسکون کے ساتھ ایک مقام پر اپنے تمام اوقات اس مشغلہ میں صرف کریں۔

علامہ مرحوم نے اعظم گڑھ میں خاص اسی مقصد کے لئے اپنا ایک مکان اور کتب خانہ وقف کیا ہے۔ اور عملاً اس کا آغاز ہو گیا ہے اگر کانفرنس علامہ مرحوم کی یادگار قائم کرنے کی تجویز کرتی ہے تو اس کا بہترین ذریعہ یہی ہے۔"(٦)

مولانا ابوالکلام آزاد کے رزولیشن کی اگر چہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے تائید کی ،مگر کانفرنس کے صدر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے لیت ولعل سے کام لیا اور حوالہ دیا کہ ڈپٹی نذیر احمد کی وفات پر جو قراردادیں منظور ہوئی تھیں ابتک ان پر کچھ نہیں ہوا۔(٧) اس کے جواب میں مولانا محمد علی جوہر نے کہا کہ

"کانفرنس اس مقصد کے لئے یک صدروپیہ ماہوار کا اہتمام کرے۔ اور سرمایہ کی فراہمی کے لئے قوم سے اپیل کی جائے اور حضور نظام خلد اللہ ملکہ (٨) کی فیاضی سے استمداد کی درخواست کی جائے۔ اور ایک سب کمیٹی بنائی جاوے جس کے ممبر جناب مولوی حاجی رحیم بخش صاحب (٩)، جناب نواب محمد اسحاق خاں صاحب، مولوی ابوالکلام صاحب آزاد، مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، نواب ملک محمد مبارز خاں صاحب (١٠) اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وغیرہ ہوں۔"(١١)

اس کے بعد بھی کچھ نہیں ہوسکا۔ اور کانفرنس اپنے ابتدائی دور کے ایک بڑے محسن کو فراموش کر بیٹھی۔ بعد میں بھی اس سلسلہ میں کچھ نہیں ہوسکا۔ نہ علامہ شبلی کی کوئی یادگار قائم ہوئی اور نہ دارالمصنّفین کے لئے وظیفہ ہی جاری ہوا۔ حالانکہ اس دور میں اخبارات میں یادگار شبلی وحالی

کے قیام کی آواز بار بار بلند ہوتی رہی۔ آخر میں سید عبدالسلام فاروقی (۱۲) نے ایک اشتہار شائع کیا کہ علامہ شبلی کی اصل یادگاران کی کتابیں ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کے ایک اور شاگرد بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] بھی اس بزم میں شامل تھے۔ انہوں نے تعزیتی اجلاس میں گو علامہ شبلی کے سانحہ وفات پر کچھ نہیں کہا، مگر انجمن ترقی اردو جس کے وہ سکریٹری تھے، اس کی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ

> ''اس کانفرنس میں کون ہے جسے شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم کی وفات کا رنج و افسوس نہیں۔ مولانا ایک نہایت روشن خیال عالم اور اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے۔ ان کی تمام عمر علمی مشاغل میں صرف ہوئی اور مرتے دم تک اسی دھن میں رہے۔ انجمن سے انہیں خاص تعلق تھا۔ اس انجمن کے پہلے سکریٹری وہی تھے۔ انہوں نے ہی اس کے قواعد وضوابط مرتب کئے۔ اور اس کی بنیاد قائم کی۔ اردو زبان پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔ خاص کر اسلامی تاریخ میں جو تحقیق وتنقید مولانا نے فرمائی اور اس کا صحیح ذوق ملک میں پھیلایا وہ کسی شرح اور تفصیل کا محتاج نہیں۔ اور اگرچہ مرحوم اب ہم میں نہیں ہیں لیکن جب تک اردو زبان قایم ہے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔'' (۱۳)

اجلاس کے آخر میں میر نثار حسین مجسٹریٹ نہر، محکمہ آب پاشی (۱۴) نے فارسی میں ایک قطعہ پیش کیا۔ جس میں علامہ شبلی نعمانی کے سانحہ وفات پر گہرے رنج کا اظہار کیا گیا ہے۔

میر نثار حسین جن کے بارے میں کسی قسم کی معلومات دستیاب نہیں ہوسکیں، انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کی وفات حسرت آیات پر فارسی میں بارہ اشعار پر مشتمل قطعہ تاریخ پیش کیا۔

اس قطعہ تاریخ کے بارے میں ہمارے عہد کے ممتاز محقق ومصنف ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی [۱۹۵۸-۲۰۲۰ء] (۱۵) کا خیال ہے کہ یہ قطعہ اس سلسلے کی تمام منظومات میں شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ (۸)

قطعہ تاریخ وفات

شبلی کہ بود منبع افضال وکان علم
شبلی کہ بود صاحب اوصاف بے کراں

شبلی کہ بود شمع شبستان علم وفضل
شبلی کہ بود عاقل وفرزانہ بے گماں

شبلی کہ بود بلبل باغ سخن وری
شبلی کہ بود زینت بزم سخن وراں

شبلی کہ بود بلبل بستان مصطفیٰ
بد فخر علم وفضل وادب رابہ ذات آں

آں مجمع الصفات چو خوابیدزیر خاک
شد آفتاب علم وہنر درزمیں نہاں

برباد گشت گلشن فضل وکمال آہ
چوں مرگ روح اوبہ جناں کردآشیاں

آں فاضل اجل چوں خرمیدہ سوئے خلد
ہر سو بپا زدرد شدہ نالہ فغاں

یکتائے روزگار وحید زماں گذشت
می کرد قوم ناز برآں فاضل جہاں

تالیف سیرۃ نبوی ناتمام ماند
شد پارہ پارہ دفتر امید ناگہاں

مثلش نزاد مادر گیتی کسے دگر
مانند او نیافت مگر دور آسماں

زیں واقعہ کہ بر دل من تیر غم نشست
زیں حادثہ کہ دیدہ من کرد خوں رواں

گفتہ نثار خستہ جگر سال رحلتش
بگذشت و اے شبلی علامہ زماں(۱۷)

اسی قطعہ تاریخ پر علامہ شبلی نعمانی کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ۲۷ رسالہ وابستگی کا خاتمہ ہوگیا۔اس ۲۷ رسالہ وابستگی میں ملت کی انہوں نے جو رہبری و رہنمائی کی۔ خاص طور پر تعلیم و تربیت کے میدان میں کانفرنس نے جو خدمات انجام دیں سب میں وہ شریک نہیں بلکہ شریک غالب رہے۔ ایک وقت تو کانفرنس پر ایسا بھی آیا تھا کہ خود سرسید نے اسے بند کردینے کا خیال پیش کردیا تھا۔اس موقع پر علامہ شبلی ہی آگے آئے اور کانفرنس کی حمایت اور اس کی ضرورت پر سرسید کو مخاطب کر کے انتہائی مدلل تقریر کی اور سرسید کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا۔ یہ معمولی نہیں غیر معمولی بات ہے۔

تعلیم کے موضوع پر علامہ شبلی نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں جو قراردادیں پیش کیں اور اپنے موقف کی تائید میں جو دلائل پیش کئے یا اس سلسلہ میں تعلیم کے موضوع پر جو خطبات دئے وہ ہماری تعلیمی تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔ان کے تعلیمی خطبات آج بھی اپنے اندر وہی جوش و ولولہ رکھتے ہیں، جو ان کے پیش کرتے وقت تھے۔ان کے تعلیمی خطبات کا مطالعہ آج بھی افادیت سے خالی نہیں۔یہی سبب ہے کہ سرسید نے بالکل ابتدائی دور میں کانفرنس کے حوالہ سے ان کی اور مولوی ذکاءاللہ دہلوی کی تحسین وستائش کی تھی۔(۱۸)

بہرحال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علامہ شبلی کی بھی ایک یادگار ہے۔اور اس نے جو گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں اس میں سرسید کے بعد علامہ شبلی کا حصہ کسی سے کم نہیں۔بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مہدی حسن افادی [۱۸۷۰-۱۹۲۱ء] (۱۹) نے علامہ شبلی کی تاریخی کاوشوں اور مورخانہ بصیرت کو دیکھ کر انہیں تاریخ کا معلم اول قرار دیا تھا۔(۲۰) لیکن ان کی نظر ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالہ سے علامہ کی تعلیمی خدمات اور تعلیمی بصیرت پر نہیں گئی ورنہ وہ علامہ شبلی نعمانی کو سرسید کے بعد ہندوستان میں تعلیم کا معلم اول نہ سہی معلم ثانی ضرور قرار دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ کچھ دیر کے لئے ان کی تاریخی و ادبی تصنیفات سے صرف نظر کر لیا جائے اور ایجوکیشنل کانفرنس سے ۲۷ر سالہ وابستگی اور ندوہ کی ۹ر برس کی معتمدی کا جائزہ لیا جائے تو ان سے بڑا ملت میں کوئی ماہر تعلیم نہ ملے گا۔قدیم دینی علوم میں مہارت اور بصیرت کے ساتھ جدید علوم اور اس کے تقاضوں پر اس عہد میں کون تھا جو ان سے بہتر ان علوم وفنون کی باریکیوں اور نزاکتوں سے واقف رہا ہو۔انہوں نے قدیم نصاب تعلیم کے معائب اور جدید علوم کے تقاضوں کو جس طرح واضح کیا ہے، آج بھی ان کی وضاحت مشکل ہوگی۔تعلیم اور نصاب تعلیم اور ملت کے مسائل ومعاملات پر ایسی وسیع وعمیق اور صائب نظر رکھنے والا ان کے بعد تو کوئی سامنے نہیں آیا۔

ان کا ایک خاص نظریہ تعلیم تھا۔جس میں قدیم صالح اور جدید نافع کو اہمیت اور فوقیت حاصل رہی۔اسے ناکام نظریہ بھی کہا جاتا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں بلکہ بیسویں صدی کی ابتدا میں جو

اشخاص ملی کاموں کے ساتھ سیاسیات کے میدان میں نمایاں ہوئے، وہ سب اسی نظریئے اور اسی نقطہ نظر کے حامل تھے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے لے کر تحریک ندوۃ العلماء تک علامہ شبلی کو اپنے نظریہ تعلیم کو عملی جامہ پہنانے نہیں دیا گیا۔ایک ذرا سے وقفے کے لئے موقع ہاتھ آیا تو انہوں نے اپنے نظریہ تعلیم کے چند بہترین نمونے دنیا کے سامنے پیش کر دئے۔

تلامذہ ندوہ میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی[۱۸۹۱-۱۹۴۵ء](۲۱)، مولانا عبدالباری ندوی فلسفی [۱۸۸۹-۱۹۷۶ء](۲۲) اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی [۱۹۰۷-۱۹۲۶ء](۲۳)، اور ایم اے او کالج علی گڑھ کے تلامذہ میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا مسعود علی محوی (۲۴)، چودھری خوشی محمد ناظر [۱۸۷۲-۱۹۴۴ء](۲۵) اور حافظ ولایت اللہ (۲۶) وغیرہ ایک طویل فہرست ہے جو ان کے نظریہ تعلیم اور نظریہ سیاسیات کے حامل تھے۔اور ایک اور مشہور اور قدآور شخصیت جو علامہ شبلی کے دوست بھی تھے اور دست گرفتہ بھی۔یعنی مولانا ابوالکلام آزاد۔وہ علامہ شبلی کے تعلیمی نظریہ کے ساتھ سیاسی نظریہ کے بھی مدۃ العمر علم بردار رہے۔

یہ سب ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ رہے اور ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، سید سجاد حیدر، محمد سجاد مرزا بیگ اور علامہ سر محمد اقبال انجمن ترقی میں بھی شریک رہے۔مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ تو انجمن کے نائب صدر ہی تھے۔

ملت کے ان عمائدین اور زعماء کی بھی کانفرنس کے حوالہ سے کچھ کم خدمات نہیں ہیں۔اگر سلیقہ سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخ لکھی جائے اور اس کی خدمات اور اس کے خدمت گذاروں کا تذکرہ قلم بند ہو تو اس میں بھی پیر میکدہ یعنی سرسید احمد خاں کی مثالی خدمات کے بعد سب سے نمایاں اور روشن خدمات انہیں علامہ شبلی نعمانی کی سامنے آتی ہے۔

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] علامہ شبلی کے شاگرد، ادیب، شاعر، خطیب، سیاست داں اور عظیم محبِّ وطن تھے۔ رام پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی ہفت روزہ کامریڈ اور اردو روزنامہ ہمدرد جاری کیا۔ تحریک خلافت دراصل علی برادران کا دوسرا نام ہے۔ کانگریس کے حامی تھے۔ اور اس کے پروگراموں میں سرگرم حصہ لیا۔ انگریزوں کے خلاف مضمون لکھنے کی پاداش میں نظر بند کئے گئے۔ انہوں نے عدم تعاون تحریک کے لئے علی گڑھ کالج کے طلبہ کو ہم خیال بنا کر کالج سے علاحدہ ہونے کے لئے تیار کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے یہ اعلان کر کے کہ برطانوی حکومت کی نوکری حرام ہے، انگریزی حکومت کو چیلنج کر دیا جس کے نتیجہ میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ سائمن کمیشن کی زبردست مخالفت کی۔ چار سال نظر بند رہے۔ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر انگریزوں کے سامنے اعلان کیا کہ ''میں اپنے ملک واپس نہیں جاؤں گا یا تو ہندوستان کو ڈومنین اسٹیٹس دو ورنہ میرے لئے ایک قبر کھود دو میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔'' چنانچہ وہیں لندن میں ۴؍جنوری ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا۔ ان کی نماز جنازہ مصر میں اور تدفین بیت المقدس میں ہوئی۔ علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ اور انہیں اپنے استاذ پر فخر تھا۔ وہ اس کا ذکر بھی کرتے رہتے تھے۔ علامہ شبلی کے سیاسی خیالات کو جن لوگوں نے پروان چڑھایا، ترقی دی، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ ایک اہم نام مولانا محمد علی جوہر کا بھی ہے۔

(۲) مولانا محمد فاروق چریا کوٹی [م: ۲۸؍اکتوبر ۱۹۰۹ء] نادر عصر عالم و فاضل، علامہ شبلی کے استاذ، ضلع اعظم گڑھ کے مردم خیز قصبہ چریا کوٹ کے رہنے والے تھے۔ متعدد ارباب کمال نے ان سے کسب فیض کیا۔ یہ علامہ عنایت رسول چریا کوٹی [م: جنوری ۱۹۰۳ء] جن سے سرسید احمد خاں نے عبرانی سیکھی تھی، ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا فاروق چریا کوٹی علی گڑھ تحریک کو ناپسند کرتے تھے۔ غالبًا اسی بنا پر مولانا الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] کے مسدس حالی کے جواب میں مسدس عوالی لکھا۔ علامہ شبلی انہیں علی گڑھ کالج سے وابستہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس سلسلہ میں سرسید سے گفتگو بھی کر چکے تھے، مگر شاید وہ راضی نہیں ہوئے۔ اور علامہ کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

(۳) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۳۲-۱۳۳

(۴) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۳۴

(۵) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۳۴-۱۳۵

(۶) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۶۹

(۷) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۶۹

(۸) نظام حیدرآباد نواب میر محبوب علی خاں [۱۸۶۸-۱۹۱۱ء] آصف سابع، جنہوں نے ریاست حیدرآباد میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ علم دوست اور معارف پرور حکمراں تھے۔ یہ آصف جاہی خاندان کے چھٹے نظام تھے۔ ۴۴ رسال عمر پائی۔ علامہ شبلی نعمانی جس زمانہ میں سررشتہ علوم وفنون کے ناظم تھے۔ میر محبوب علی خاں حیدرآباد کے نظام تھے۔ انہیں شعروشاعری سے بڑا لگاؤ تھا۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

(۹) مولوی حاجی سر رحیم بخش [م: ۴رمئی ۱۹۳۵ء] سکریٹری خاص نواب بہاول پور۔ ٹھسکہ میرانجی ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد ایک اسکول میں مدرس مقرر ہوئے اور ترقی کر کے چیفس کالج لاہور بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ نواب بہاول پور اس وقت وہاں زیر تعلیم تھے۔ وہ جب تخت نشیں ہوئے تو مولوی رحیم بخش کو اپنی سرکار میں بڑے عہدہ پر رکھا۔ چنانچہ وہ اپنی محنت، لگن اور ایمانداری کے سبب معتمد ٹھہرے۔ اور بڑی ترقی کی۔ وہ حامی ندوہ بھی کہے جاتے تھے۔ علامہ شبلی نے انہیں کے توسط سے ندوہ کے لئے کوشش کی اور وہاں سے پچاس ہزار کی بڑی رقم عطا ہوئی۔ علامہ شبلی کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ ایسی کامیابی ندوہ نے پھر نہیں دیکھی۔ علامہ شبلی کی وفات کے بعد ان کی یادگار قائم کرنے میں جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے لیت ولعل سے کام لیا تو مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا کہ کانفرنس قرارداد پیش کرے دوسرے لوگوں سے تعاون کے لئے کہا جائے گا۔ اس میں انہوں نے ایک نام مولوی رحیم بخش کا بھی پیش کیا تھا۔ دیکھیں رپورٹ ۱۹۱۲ء۔

(۱۰) نواب ملک محمد مبارز خاں: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۱) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۶۹-۱۷۰

(۱۲) سیدعبدالسلام فاروقی: مالک مکتبہ فاروقی دہلی۔

(۱۳) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس۱۹۱۴ص ۱۵۵-۱۵۶

(۱۴) میر نثار حسین مجسٹریٹ نہر محکمہ آب پاشی: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۵) ڈاکٹرظفراحمدصدیقی: [۱۹۵۸-۲۰۲۰ء] اردو کے نامور ادیب محقق، نقاد اور مصنف تھے۔ اعظم گڑھ کے فرزند تھے۔ مظاہر علوم اور ندوہ میں تعلیم پائی تھی۔ پہلے بی ایچ یو کے شعبہ اردو میں استاذ رہے۔ بعدازاں پروفیسر ہوکر علی گڑھ چلے گئے۔ ۲۰۲۰ء میں سبکدوش ہوئے اور چند ماہ بعد ۲۹ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، شبلی کی علمی وادبی خدمات، مقالات نذیر، اردو شرح دیوان غالب از طباطبائی کی تدوین۔ اور دیگر متعدد کتب کے مدون ومرتب تھے۔

(۱۶) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۳۴۵

(۱۷) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلواورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس۱۹۱۴ص ۱۳۵-۱۳۶

(۱۸) خطبات عالیہ اول ص ۲۷

(۱۹) مہدی حسن افادی [م: ۲۲ر نومبر ۱۹۲۱ء] گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ تحصیلدار کی حیثیت سے مختلف تحصیلوں میں تعینات رہے۔ ادب وانشا کا بڑا صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے، بلکہ ان کے بڑے معتقد و مداح اور ان کے ادب وانشاء کے بڑے شیدائی تھے۔ شبلی کو ''ملک میں تاریخ کا معلم اول'' انہیں کا دیا ہوا خطاب ہے۔ شعرالعجم کو ادب عالیہ کا نمونہ قرار دیتے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ علامہ شبلی کی ہر ادا پر جان دیتے تھے۔

مہدی حسن افادی اردو کے بڑے بانکے ادیب وانشاء پرداز تھے۔ ان کی نثر میں اشاریت بہت ہے۔ نئے نئے الفاظ ومحاورات واصطلاحات کے خوب صورت اور برمحل استعمال پر بڑی قدرت تھی۔ ان کے ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''افادات مہدی'' بڑی خوب صورت اور دلکش نثر کا مجموعہ ہے۔ جو ان کی وفات کے بعد بیگم مہدی نے مرتب کر کے شائع کرایا تھا۔ ''مکاتیب مہدی'' بھی انہی کی کوششوں سے شائع ہوئی۔ اب اسے اتر پردیش اردو اکادمی شائع کر رہا ہے۔

(۲۰) افادات مہدی ص ۱۸۰

(۲۱) مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی [۱۸۹۱-۱۹۴۵ء] کاکوری کے علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی شد بد کے بعد ندوہ میں داخل ہوئے اور تمام تر تعلیم ندوہ میں حاصل کی۔ یہ ندوہ کے بالکل ابتدائی طلبہ میں سے ہیں۔ انہوں نے مولانا حفیظ اللہ، مولانا عبدالشکور، مولانا فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ انہیں مولانا فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی سے زیادہ شیفتگی تھی۔ ندوے سے فراغت کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۱۶ء میں عربی سے ایم اے کیا۔ تحصیل علم کے بعد عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانات کے رجسٹرار مقرر ہوئے اور اس شعبہ کو بڑی ترقی دی۔ خاص طور پر اس کے نصاب کی اصلاح اور اسے مفید و کارآمد بنانے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔

(۲۲) علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں مولانا عبدالباری ندوی فلسفی [۱۸۸۹ - ۱۹۷۶ء] کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ ان کی تربیت کا ایک نمونہ اور عزیز ترین شاگرد تھے۔ وہ ۱۸۸۹ء میں گدیہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۲ء میں وہ ندوہ میں داخل ہوئے۔ درسیات کی تکمیل کے بعد ندوہ ہی میں انہوں نے انگریزی تعلیم کا آغاز کیا، نیز فلسفہ و کلام کا بھی مطالعہ شروع کیا اور پھر اپنی محنت وصلاحیت سے اس میں اتنی مہارت پیدا کی کہ یگانہ روزگار قرار پائے، بغیر کسی کالج اور یونیورسٹی کی سند کے دکن کالج پونہ، گجرات کالج احمد آباد اور آخر میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں فلسفہ کے استاد اور صدر شعبہ ہوئے اور بڑی نیک نامی اور شہرت وعزت پائی۔ مولانا علوم جدیدہ وقدیمہ دونوں میں کمال دست رس رکھتے تھے، درس و تدریس میں مثالی مہارت کے ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، ندوی فاضل ہونے کے باوجود جدید فلسفہ و کلام پر انہوں نے جتنا کچھ لکھا ہے اس کی علماء میں مثال ملنی مشکل ہے، دوسرے موضوعات پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ ''مبادی علم انسانی [۱۹۱۸ء]، مذہب وعقلیات [۱۹۱۹ء]، برکلے [۱۹۱۹ء]، علم اخلاق [۱۹۲۳ء]، مقدمہ مابعدالطبیعات [۱۹۳۱ء]، اخلاقیات [۱۹۳۲ء]، فہم انسانی [۱۹۳۸ء]، تجدید تصوف وسلوک [۱۹۴۹ء]، جامع المجددین [۱۹۵۰ء]، تجدید معاشیات [۱۹۵۵ء]، مذہب اور سائنس [۱۹۸۰ء] ان کی اہم تصنیفات ہیں۔

(۲۳) مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی [۱۹۰۷ - ۱۹۲۶ء] ندوہ کے ممتاز فاضل اور علامہ شبلی کے خاص

شاگرد تھے۔انہیں وہ اپنے ساتھ بعض جلسوں میں لے گئے۔مدرستہ الاصلاح سرائے میر بھی وہ علامہ شبلی ہی کے ساتھ پہلی بار آئے تھے۔۱۹۰۸ء میں آریوں کی شدھی تحریک سے متاثر ہوکر علامہ شبلی نعمانی نے خدام الدین کی ایک جماعت قائم کی تھی۔اس میں انہوں نے ان طلبہ کو داخل کیا تھا،جن کے والدین یا سرپرست انہیں محض مذہب کی خدمت کے لئے وقف کریں اور یہ بچے سادہ پہننے،سادہ کھانے اور سادہ رہنے کا عہد کریں۔اس جماعت میں جو طلبہ شامل ہوئے اس میں ایک مولانا عبدالرحمٰن نگرامی بھی تھے۔ انہوں نے بقول مولانا سید سلیمان ندوی جو عہد کیا تھا اس کو اخیر تک پورا کیا۔(یادرفتگاں ص ۶۱)

علامہ شبلی نعمانی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا ان کے جن طلبہ نے عزم کیا اس میں ایک مولانا عبدالرحمٰن نگرامی بھی تھے۔چنانچہ انہوں نے کئی برس مدرستہ الاصلاح میں رہ کر تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی ان کے فیض یافتہ تھے اور انہوں نے ترجمان القرآن علامہ حمیدالدین فراہیؒ سے فیض حاصل کیا۔وہ بڑے اچھے خطیب تھے۔بعد میں وہ کلکتہ جاکر مدرسہ اسلامیہ کے صدر مدرس ہو گئے۔

وہ قصبہ نگرام میں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد ندوہ آئے اور تکمیل کی۔ ۶/ مارچ ۱۹۲۶ء میں کم عمری انتقال کیا۔

(۲۴) مولانا مسعود علی محوی،علامہ شبلی کے علی گڑھ کے شاگردوں میں تھے۔تحصیل علم کے بعد ریاست حیدرآباد سے وابستہ ہوگئے اور وہاں متعدد عہدوں پر فائز رہے۔فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ان کے کلام ایک مجموعہ ''نذر عقیدت'' شائع ہوا ہے۔اس کے دیباچہ میں پنے استاذ علامہ شبلی کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے۔اور لکھا ہے کہ علی گڑھ میں علامہ شبلی مشہور فارسی شاعر قاآنی کے قصاید اس عمدگی اور نکتہ آفرینی کے ساتھ پڑھاتے تھے کہ اس کی شاعری دل ودماغ پر اثر انداز ہو جاتی تھی۔چنانچہ خود انہیں قاآنی سے ایسی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ اسی کے انداز میں شعر کہنے لگے اور پھر پوری زندگی قاآنی کے انداز میں شاعری کرتے رہے۔محوی کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ان کے نام سے مولانا مسعود علی ندوی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ جو علامہ شبلی کے ندوہ کے ممتاز شاگرد تھے۔اور جو استاذ کے کاموں کی تکمیل کے لئے اعظم گڑھ آئے تو مرکر بھی اس سے جدا نہ ہوئے۔اور دارالمصنفین ہی ان کا مدفن بنا۔

(۲۵) چودھری خوشی محمد ناظر [۱۸۷۲-۱۹۴۴ء] خوشی محمد ناظر [۱۸۷۲-۱۹۴۴ء] علامہ شبلی کے شاگرد

تھے۔ ہریا والا گجرات میں پیدا ہوئے۔علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ کشمیر اور لداخ کے گورنر رہے۔ جب یہ علی گڑھ کالج میں بی.اے. کے طالب علم تھے انگریزی شاعر ٹامسن کی نظم ''سیزنس'' سے متاثر ہوکر نظم کہی جسے علامہ شبلی نے بہت سراہا۔مسٹر آرنلڈ نے اس نظم پر انہیں انعام سے نوازا۔

(نقوش لاہور،شخصیات نمبر حصہ دوم ص ۹۲۵)

وہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ان کا اردو مجموعہ کلام نغمہ فردوس ۱۹۳۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ان کی ایک نظم ''جوگی'' نے اپنے زمانہ میں بڑی شہرت پائی۔مولانا حالی اور علامہ شبلی کے وہ بڑے معتقد تھے۔ان کی شان میں انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔دور طالب علمی میں علامہ شبلی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

(۲۶) خان بہادر حافظ ولایت اللہ صاحب آئی ایس او،علامہ شبلی کے شاگرد تھے۔علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی تھی۔ یہ ناگ پور،سی پی کے رہنے والے تھے۔تحصیل علم کے بعد سی پی ناگ پور کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہوکر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

حافظ صاحب کو شاعری سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔حالانکہ دور طالب علمی کے بعد اتفاق سے وہ ان مقامات پر مقیم رہے جہاں اردو شعر و ادب کا مذاق مفقود تھا۔باوجود اس کے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتے رہے احباب کے اصرار پر ۱۹۴۱ء میں اپنا مجموعہ کلام 'سوز و گداز' محبوب المطابع دہلی سے شایع کیا۔

علامہ شبلی نعمانی کو جس وقت شمس العلماء کا خطاب ملا تھا اس وقت حافظ ولایت اللہ ایم، اے، او، کالج علی گڑھ میں بی،اے کے طالب علم تھے۔ خطاب ملنے کی خوشی میں کالج میں ۱۹/جنوری ۱۸۹۴ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا۔اس میں کالج کے سربرآوردہ اور اکابر سرسید احمد خاں، پروفیسر آرنلڈ،سید محمود،نواب محسن الملک،مولانا حالی،نواب مزمل اللہ خاں اور سید کرامت حسین وغیرہ شریک ہوئے تھے۔اس میں حافظ ولایت اللہ بھی شریک تھے۔اس موقع پر انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کی مدح میں ایک اردو نظم پیش کی تھی، جو ان کے مجموعہ کلام ''سوز و گداز'' میں شامل ہے۔راقم نے اسے اپنی کتاب ''شبلی: سخنوروں کی نظر میں'' نقل کیا ہے۔

ooo

ماحصل

۲۷؍دسمبر ۱۸۸۶ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ بانی کانفرنس سرسید احمد خاں اوران کے رفقا مولوی سمیع اللہ خاں، نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی، نواب وقارالملک اور علامہ شبلی وغیرہ اس دن ان کے ساتھ تھے۔ اوراسے ترقیات سے ہم کنار کرنے کے عہد و پیمان اور عزم بھی ساتھ ہی کیا۔ گویا دوسرے رفقائے سرسید کی طرح علامہ شبلی بھی اس کے بانیوں میں تھے۔ اوراس لحاظ سے انہیں کسی قدر تفوق بھی حاصل تھا کہ پہلے اجلاس کی منصوبہ بندی میں وہ سرسید کے ساتھ پیش پیش تھے۔ کانفرنس کا پہلا رزولیشن اگر بانی کانفرنس نے پیش کیا تو دوسرا رزولیشن علامہ شبلی نے پیش کیا اور سرسید مرحوم کی ایماء پر پیش کیا۔

علامہ شبلی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ۲۷؍سال وابستہ رہے۔ یہ طویل مدت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہے۔ اس میں وہ قدر اور ناقدری کے دور سے گذرے۔ لیکن یہ بڑی اور قابل ذکر بات نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے وہ تمام کام اور کارنامے انجام دئے جو سرسید احمد خاں اس کانفرنس کے ذریعہ انجام دینا چاہتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ اس عہد کے مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کا مطالعہ کیا۔ ان کی جدید ضرورتوں کی نشاندہی کی۔ اوران سے متعلق سالانہ اجلاسوں میں قراردادیں پیش کیں۔ ان کی اہمیت اور ضرورت پر بحث کی اوراپنے موقف کی تائید میں دلائل دئے۔ علی العموم ان کی قراردادیں تسلیم کر لی جاتی تھیں۔ بعض متفقہ اور بعض اکثریت سے۔ البتہ ایک قرارداد جو انہوں الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی نصاب میں عربی قواعد کی شمولیت پر پیش کی تھی، اس سے صرف نظر کیا گیا۔ اس سے وہ نالاں

ہوئے۔مگراس وقت ان کے نالاں ہونے کا بھی کیاانداز تھا کہ انہوں نے نظرانداز کئے جانے کا جواب اس طرح دیا کہ اس کاایک مکمل نصاب جوتین حصوں پر مشتمل تھاتیارکر کے شائع کرادیا۔ راقم نے اس نصاب فارسی (انٹرنس کورس فارسی،ایف اے کورس فارسی اور بی اے کورس فارسی) کا تعارف اپنی کتاب''آثارشبلی''میں کرایا ہے۔

۲۔کانفرنس کے دوسرے اراکین نے جب کوئی قرارداد پیش کی اورعلامہ شبلی کووہ معقول لگی تواس کی تائیدوحمایت بھی انہوں نے کی۔ بلکہ اس کومزیدواضح اورمنقح کرنے کے لئے دلائل بھی دئے۔

۳۔اگرکوئی قراردادانہیں پسندنہیں آئی یادوسرےلفظوں اسےقوم وملت کے لئے انہوں نے مفیدنہیں خیال کیاتو انتہائی متانت سےاس سے اختلاف بھی کیا۔چنانچہ کانفرنس کی رپورٹ میں اس کی کئی مثالیں درج ہیں اوروہ اس کتاب میں بھی نقل کی گئی ہیں۔مثلاً سرسید نے ایک بار کانفرنس کوغیرضروری تصورکر کے اسےختم کرنے کی بات کہی توہرطرف سناٹاچھا گیا۔اس کے خلاف علامہ شبلی نے طویل بحث کی اورمتعدد دلائل سے ثابت کیا کہ ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام جن اسباب اور مقاصد کےتحت عمل میں آیا تھا وہ بالکل درست ہیں اوراس کے مفیدنتائج بھی برآمد ہونے لگے ہیں،اس لئے اس کی اہمیت اورضرورت سے انکارنہیں کیا جاسکتا۔چنانچہ دوسرے اراکین کےساتھ سرسید نے بھی ان کی رائےتسلیم کی۔تفصیل روداد میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۹۱۱ء کے اجلاس میں مولانامحمدعلی جوہر نے ایک قرارداد پیش کی۔نواب وقارالملک نے اس کی مخالفت کی۔اس کے بعدقرارداد پر بولنے کے لئے علامہ شبلی کھڑے ہوئے۔انہوں نے نواب صاحب کےخلاف ایسی سخت گفتگوکی کہ اسےسنجیدگی اورمتانت کےخلاف کہاجائے گا۔ایسا انہوں نے کانفرنس سے اپنی ۲۷سالہ وابستگی میں کبھی نہیں کیا۔ایساانہوں نے کیوں کیا؟اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔غالباًگذشتہ اجلاسوں میں صاحبزادہ آفتاب احمدخاں کےرویے سےوہ خفارہے ہوں یاکوئی اوروجہ رہی ہو۔بہرحال جوبھی وجہ رہی ہووہ تکلیف دہ گفتگوہے۔اوروہ۱۹۱۱ء کی دہلی کانفرنس کی روداد میں موجود ہے۔

۴۔علامہ شبلی نے تعلیم کے موضوع پر جو قراردادیں پیش کیں، یا جن قراردادوں کی تائید و حمایت کی، جس میں جدید تعلیم، انگریزی تعلیم، بچوں کی ابتدائی تعلیم، دوسرے لفظوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ تعلیم پر کانفرنس کے اجلاسوں میں جو بحث کی یا اس سلسلہ میں جو تعلیمی نکتے پیش کئے، چونکہ بعد کے زمانہ میں ان پر توجہ نہیں دی گئی یا ان کا مطالعہ و جائزہ پیش نہیں کیا گیا یا اسی طرح کانفرنس کے اثرات کا مطالعہ نہیں کیا، اس سے نقصان یہ ہوا کہ بعد کی نسلیں اس سے ایجوکیشنل کانفرنس سے بھرپور استفادہ نہ کرسکیں۔ حالانکہ اس میں بہت کچھ مفید اور کارآمد تعلیمی نکتے محفوظ ہیں۔ اور آج کے پس منظر میں یہ بہت اہم ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس ایجوکیشنل کانفرنس جیسی مضبوط اور منظّم و متحد ایک بھی تنظیم نہیں ہے۔

۵۔کانفرنس کا پہلا تاریخی مقالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' علامہ شبلی کے زبان و قلم سے منظر عام پر آیا اور شرکائے کانفرنس کو حیرت زدہ کرگیا۔ اس سے غور و فکر کی ایک نئی دنیا سامنے آئی۔ بعد میں اس سلسلہ کی دو انتہائی اہم قراردادیں بھی علامہ شبلی ہی نے پیش کیں۔ ایک طب یونانی اور اطباء سے متعلق کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکمرانی میں جن علوم کے تراجم کئے، ان میں مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا؟۔ اس پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جائیں۔ اس قرارداد کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامی مضامین و مقالات لکھوائے جائیں اور سو روپئے انعام دے کر تصنیف و تالیف کے لئے ان کا حوصلہ بڑھایا جائے۔

۶۔کانفرنس نے خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اکثر اجلاسوں میں کوئی خطبہ پیش کیا جاتا۔ علامہ شبلی نے اس میں بھی حصہ لیا۔ چنانچہ انہوں نے متعدد خطبات دئے۔ اور اپنے عہد کے انتہائی اہم موضوعات پر خطبات دئے۔ ایک خطبہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ وہ دوسرے موضوعات جن پر انہوں نے خطبات پیش کئے ان کے عناوین یہ ہیں:

حقوق نسواں، جبری تعلیم، تاریخ اسلام، تعصب اور اسلام، اسلام میں علم اور دولت، عورت اور اسلام وغیرہ۔ اس میں چند خطبات کا رودادوں میں ذکر تو ہے مگر وہ بوجوہ نقل نہیں کئے جاسکے۔ اور اب دنیا ان سے محروم رہے گی۔ تاہم جو محفوظ ہیں وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور وہ

تمام کے تمام ایجوکیشنل کانفرنس سے گہری وابستگی کے سبب لکھے گئے اور پیش کئے گئے ہیں۔

ان خطبات کے ساتھ بھی ہمارا رویہ مثبت نہیں رہا، چنانچہ ان میں چند کے سوا خطبات شبلی میں شامل نہیں ہیں۔ اور ایک اہم خطبہ ''حقوق نسواں'' ۱۹۹۰ء کے بعد کسی وقت خطبات شبلی مطبوعہ دارالمصنّفین میں شامل ہوا۔ بہرحال علامہ شبلی کی علمی و تعلیمی زندگی کا ایک بڑا اہم اور عظیم الشان کارنامہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ان کی ۲۷ رسالہ وابستگی اور اس حوالہ سے ان کی علمی و تعلیمی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

ooo

کتابیات

کتب

- آثار شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
- آسودگان ڈھاکہ۔حکیم حبیب الرحمٰن، امدادیہ لائبریری، ڈھاکہ،۱۹۴۶ء
- آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال، امان اللہ خاں شروانی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ،۱۹۹۴ء
- اشخاص وافکار۔ضیاءالحسن فاروقی، مکتبہ جامعہ دہلی،۱۹۷۳ء
- افادات مہدی۔بیگم مہدی، شیخ مبارک علی، لاہور،۱۹۴۹ء، طبع چہارم
- اقبال اور پیروی شبلی۔سید افتخار حسین شاہ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی،۱۹۷۸ء
- اقبال اور دبستان شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۵ء
- اقبال کامل۔مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۰۹ء
- افادات مہدی۔بیگم مہدی افادی، شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۴۹ء طبع چہارم
- البرامکہ۔عبدالرزاق کان پوری، نامی پریس کان پور،۱۸۹۷ء
- الغزالی۔علامہ شبلی نعمانی۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید،۱۹۹۷ء
- الفاروق۔علامہ شبلی نعمانی۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۰۸ء
- امام رازی۔مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۵۰ء
- انجمن ترقی اردو (ہند) تاریخ اور خدمات (۱۹۴۷ء تک)۔ڈاکٹر محمد یونس غازی،

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸ء
- اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر۔علامہ شبلی نعمانی۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ، مئی ۲۰۰۹ء
- باقیات شبلی۔مشتاق حسین۔آزاد کتاب گھر دہلی۔۱۹۶۴ء
- بزم تیموریہ (اول تا سوم)۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ
- بیان شبلی (۱)۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، اکتوبر ۲۰۲۰ء
- تاریخ التمدن الاسلامی جلد سوم۔جرجی زیدان، مطبوعہ الہلال مصر ۱۹۰۴ء
- تذکرہ ماہ وسال۔مالک رام، مکتبہ جامعہ دہلی، طبع اول نومبر ۱۹۹۱ء
- ثلاثہ غسالہ۔حکیم حبیب الرحمٰن، مرتبہ عارف نوشاہی، مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا، ۲۰۲۰ء
- حکمائے اسلام (اول و دوم)۔مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ
- حیات جاوید۔مولانا الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
- حیات سلیمان۔شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۰ء
- حیات شبلی۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
- خطبات شبلی۔مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
- خطبات عالیہ حصہ اول۔انوار احمد زبیری، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۲۷ء
- خطبات عالیہ حصہ دوم۔انوار احمد زبیری، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۲۸ء
- خطوط سرسید۔سرراس مسعود، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱ء
- دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۲ء
- دستاویزات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جلد اول، اقبال حسین، سرسید اکیڈمی علی گڑھ، ۲۰۰۳ء
- دستاویزات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جلد دوم۔اقبال حسین، سرسید اکیڈمی علی گڑھ، ۲۰۰۴ء
- رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، بمبئی، ۱۹۰۳ء
- رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، ڈھاکہ ۱۹۰۶ء

- رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، امرتسر ۱۹۰۸ء، مرتبہ: صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مطبع مفید عام آگرہ
- رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، دہلی، ۱۹۱۱ء،
- رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس لکھنو، ۲۸ تا ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۲ء،
- رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس۔ بمقام راول پنڈی۔ ۱۹۱۴ء
- زندہ رود (وسطی دور) جسٹس جاوید اقبال، شیخ غلام اینڈ سنس لاہور ۱۹۸۱ء
- سرسید کے تعلیمی کارنامے۔ پروفیسر اختر الواسع، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۸۵ء
- سوز و ساز۔ حافظ ولایت اللہ، محبوب المطابع دہلی، ۱۹۴۱ء
- سیرۃ النبی (اول و دوم)۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء
- سیرۃ النعمان۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء
- سیرت عمر بن عبد العزیز۔ مولانا عبد السلام ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۴۶ء
- شبلی: خود نوشتوں میں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۸ء
- شبلی: سخنوروں کی نظر میں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۲ء
- شعر العجم (اول تا پنجم) علامہ شبلی نعمانی، دار المصنّفین اعظم گڑھ،
- علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء
- علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- علم الاقتصاد۔ علامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم
- علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔ سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ کراچی، ۱۹۷۰ء
- فہرست ممبران و وزیٹران متعلق بہ محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس۔ مطبع ریاض ہند علی گڑھ، ۱۹۰۹ء
- کتابیات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء

- کلام شبلی کے اعلام واشخاص۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، اکتوبر ۲۰۲۰ء
- کلیاتِ شبلی اردو۔مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۱۲ء
- کلیاتِ شبلی فارسی۔مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، جنوری ۲۰۰۵ء
- لکچروں کا مجموعہ، سرسید احمد خاں، منشی سراج الدین، منشی فضل الدین تاجر کتب کشمیری بازار لاہور، ۱۸۹۰ء
- متاعِ رفتگاں۔شاہ معین الدین احمد ندوی، مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، سنہ اشاعت 2015ء
- مجلّہ دستاویز دوحہ/دہلی، ۲۰۱۱، ۲۰۱۲ء، عزیز نبیل، دستاویز پوسٹ بکس ۸۰۹۵۱، دوحہ قطر
- مجموعہ لکچر واسپیچز حصہ اول۔نواب محسن الملک۔مرتبہ فضل الدین، نول کشور پریس لاہور
- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پانچواں سالانہ جلسہ بمقام الہ آباد ۱۸۹۱ء
- مرقع کانفرنس۔انوار احمد مارہروی، مطبع مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۳۵ء
- مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔علامہ شبلی نعمانی، قومی پریس لکھنو، ۱۸۸۸ء
- مشاہدات وتاثرات۔شیخ محمد عبداللہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی، ۲۰۱۵ء
- مقالاتِ شبلی (جلد سوم)۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء
- مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم)۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء
- مکاتیبِ شبلی حصہ اول، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
- مکاتیبِ شبلی حصہ دوم، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
- مکتوباتِ شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچز، سرسید احمد خاں۔مولوی محمد امام الدین گجراتی، مطبوعہ مصطفائی پریس، لاہور، ۱۹۰۰ء
- موازنہ انیس و دبیر۔علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید، ۲۰۰۴ء
- مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء

- نذرِ عقیدت۔ مولوی مسعود علی محوی، حیدرآباد، ۱۹۳۶ء
- نذیر احمد شخصیت اور کارنامے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۷۴ء
- نوادرات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۷ء
- وفیات اہل قلم۔ محمد منیر احمد سلیچ، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء
- وفیات معارف۔ ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۱۳ء
- یادِ ایام۔ مولانا ضیاء الحسن علوی، ادارہ انیس اردو الہ آباد۔
- یادِ ایام۔ مولوی عبدالرزاق کان پوری، آتش فشاں پبلی کیشن لاہور، ۱۹۹۳ء
- یادِ رفتگاں۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۴ء
- یادگارِ شبلی۔ شیخ محمد اکرام، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع سوم ۱۹۹۴ء
- یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

رسائل

- البصیر۔ چنیوٹ (شبلی نمبر) ۱۹۵۷ء
- بازیافت لاہور (شبلی نمبر)۔ ۲۰۱۵ء
- ماہنامہ دلگداز لکھنو اگست ۱۸۸۸ء
- ماہنامہ صبا حیدرآباد، جلد ۴، شمارہ ۱-۲ (شبلی نمبر) مدیر: سلیمان اریب، ۱۹۵۸ء
- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ: ا کتوبر ۱۹۰۳ء
- لسان الصدق کلکتہ، فروری ۱۹۰۴ء
- ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۶۸ء، مئی ۲۰۰۸ء
- نقوش لاہور شخصیات نمبر حصہ دوم

ooo

اشاریہ

مرتبہ

مولانا عرفات اعجاز اعظمی

اشخاص

(غ)

کتب ورسائل

مقامات

○○○

ISBN 819527653-9
9788195276530
₹ 350.00

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Shibli Road, Azamgarh-276001
E-mail: shibli_academy@rediffmail.com
Website: www.shibliacademy.org